فارسی کے مشہور شعری اسالیب اور علامہ اقبال کا فارسی شعری اسلوب

مقالہ نگار

فرزانہ ماجد

نگران

ڈاکٹر کلثوم فاطمہ سیّد (مرحومہ)

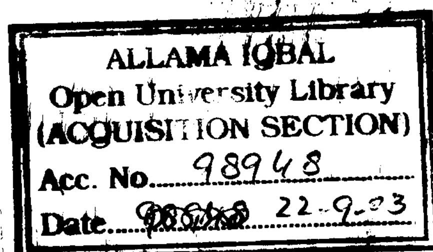
شریک نگران

ڈاکٹر محمد صدّیق خان شبلی

REGISTRATION NO: 94-PRI-5576

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد



انتساب

اپنے جگر گوشوں

فرحین اور ضیغم

کے نام

فہرست مطالب



پیش لفظ

شیخ عبدالقادر نے دیباچہ بانگِ درا میں لکھا:

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خان غالب کو اُردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اُس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"(۱)

بیسویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں جبکہ علامہ اقبال (۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء) عالمِ اسلام کے ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے اُبھر رہے تھے۔ غالب (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) بر صغیر کے نمائندہ ترین شعراء میں سے ایک تھے انھوں نے اردو اور فارسی ہر دو زبانوں میں شاعری کی اور ہندی طرز شعر گوئی کی نمائندگی کی لیکن ان کی فارسی شاعری اُردو کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ یہی صورتحال علامہ اقبال کے یہاں بھی ہے یعنی اردو کے مقابلے میں ان کی فارسی تصانیف کی تعداد زیادہ ہے۔ فارسی اگرچہ ان کی مادری زبان نہ تھی لیکن فارسی شعر گوئی میں خصوصی مہارت رکھنے کے باعث وہ خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے نمائندہ فارسی گو شعراء سے کسی بھی طرح پیچھے نہ تھے اسی لئے ناقدین نے دیگر شعراء کی طرح اُن کے فارسی شعری اسلوب میں بھی خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کی جھلکیاں تلاش کر کے اُسے کسی ایک سے مخصوص کرنے کی کاوش جاری رکھی لیکن اُن کی اس کاوش کا دوسرا سبب علامہ اقبال کے ہاں ان معروف اسالیب کے نمائندہ شعراء سے فکری اور فنی ہر دو سطح پر اخذ و اکتساب بھی تھا جس کی بنا پر ناقدین اُن کے شعری اسلوب کو کسی ایک شعری اسلوب سے منسوب کرنے پر کہیں زیادہ مُصر رہے لہٰذا مقالے کی ابتداء سے قبل اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ فکری و فنی سطح پر اُن کے یہاں اس اخذ و اکتساب کی نوعیت کیا رہی۔

علامہ اقبال کی فارسی شعری تصانیف اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء) پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء) زبورِ عجم (۱۹۲۷ء) جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) مسافر (۱۹۳۴ء) پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق (۱۹۳۶ء) اور ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸ء) کے نام سے منظرِ عام پر آئیں۔ جن میں مثنویاں، غزلیات، منظومات، ترکیب بند، ترجیع بند، دوبیتیاں اور قطعات کی اصناف استعمال کی گئیں۔ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، بندگی نامہ (شامل زبورِ عجم) مسافر، پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق اور جاوید نامہ سبک عراقی کے معروف شاعر مولانا جلال الدین رومی کی معروف مثنوی "مثنوی معنوی" کی تقلید میں صنف مثنوی میں لکھی گئیں اور ان میں وزن بھی وہی استعمال کیا گیا جو مثنوی معنوی کا تھا یعنی فاعلاتن فاعلاتن فاعلات / فاعلن۔ گلشنِ راز جدید (شامل زبورِ عجم) میں بھی مثنوی کی صنف کا استعمال کیا گیا لیکن یہ مثنوی سبک عراقی کے ایک اور معروف شاعر شیخ محمود شبستری کی

معروف مثنوی گلشن راز کی تقلید میں اور اُسی کے وزن پر کہی گئی یعنی مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل رفعولن۔

اسرارِ خودی کے حوالے سے علامہ اقبال نے اعتراف کیا کہ انھوں نے یہ مثنوی لکھتے ہوئے مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کے ساتھ ساتھ سبکِ عراقی کے شاعر شیخ بو علی قلندر پانی پتی کی مثنوی کو بھی نمونے کے طور پر سامنے رکھا اور اس کی تمہید میں سبکِ ہندی کے شاعر ظہوری ترشیزی کے معروف ساقی نامے سے بھی اثر لیا۔(۲)

پیام مشرق (لالۂ طور) اور ارمغان حجاز کی دوبیتیوں کے بارے میں انھوں نے تسلیم کیا کہ یہ دوبیتیاں سبک خراسانی کے شاعر باباطاہر عریاں کی پہلویات کی طرز پر کہی گئیں۔(۳) اور یہ وہی وزن ہے جو گلشنِ راز کا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے سبکِ عراقی کے شاعر فخر الدین عراقی کی تقلید میں اپنی تمام مثنویوں کو دیگر اصناف شعری یعنی غزل، قطعہ، ترکیب بند، اور ترجیع بند وغیرہ سے بھی مزین کیا مثلاً زبورِ عجم میں دو مثنویوں گلشنِ راز جدید اور بندگی نامہ کے ساتھ ساتھ غزلیات بھی موجود ہیں۔ اسی طرح جاوید نامہ میں مثنوی کے ساتھ غزل، ترکیب بند اور ترجیع بند بھی ہے۔

پیامِ مشرق کے ساقی نامے میں اسرار خودی کی طرح ظہوری ترشیزی کے ساقی نامے کی تقلید کی گئی۔(۴) جبکہ اسی کتاب کی ایک اور نظم نوائے وقت سبک خراسانی کے شاعر منوچہری دامغانی کی مسمط کی تقلید میں لکھی گئی۔

عوالم بالا کے تخیلی سفر نامے پر مبنی مثنوی جاوید نامہ سبک خراسانی کے نثر نویس بو علی سینا کی تصنیف رسالۃ الطیر، سبک خراسانی کے شاعر حکیم سنائی غزنوی کی مثنوی سیر العباد الی المعاد اور سبک خراسانی ہی کے ایک شاعر شیخ عطار نیشاپوری کی مثنوی منطق الطیر کی طرز پر کہی گئی جبکہ عربی زبان میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں مثلاً گفتار شیخ بایزید بسطامی، ابن شہید ابو عامر اندلسی کی رسالۃ التوابع والزوابع، ابو العلا معری شامی کی رسالۃ الغفران ابن عربی کی الفتوحات المکیہ اور دیگر رسائل بھی علامہ اقبال کے پیش نظر رہے۔

لیکن ان کے یہاں خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء کی تقلید کا سلسلہ یہیں تک محدود نہ رہا بلکہ انھوں نے ان کے بیسویں معروف اشعار اور مصرعوں کو اپنی شاعری میں جابجا تضمین بھی کیا مثلاً :

سبک خراسانی کے پیرو شعراء میں منوچہری دامغانی کے قصیدے کا ایک شعر ارمغانِ حجاز کے حصہ ”حضورِ رسالت ؐ“ کی پہلی دوبیتی میں تضمین کیا۔

”الا یا خیمگی خیمہ فروھل
کہ پیش آہنگ بیرون شُد ز منزل“
خرداز راندن محمل فروماند
زمام خویش دادم درکف دل

(ص ۹۰۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

شیخ محمود شبستری کی گلشن راز کا ایک شعر جو شیخ فرید الدین عطار کی عقیدت میں کہا گیا گلشنِ راز جدید کی تمہید میں تضمین کیا:

"مرا زین شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید"
(ص ۸۳۸ ۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں "حرفے چند باامت عربیہ" کے عنوان کے تحت خواجہ فرید الدین عطار کا ایک شعر ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ تضمین کیا:

"حمد بیحد مر رسولؐ پاک را
آن کہ ایمان داد مُشت خاک را"
(ص ۸۳۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک عراقی کے پیرو شعراء میں مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کے چند اشعار کو جاوید نامہ حصہ "فلکِ مشتری" میں تضمین کیا:

"بود گبرے در زمانِ بایزید
گفت اور را یک مسلمان سعید
خوشتر آن باشد کہ ایمان آوری
تا بدست آید نجات و سروری
گفت این ایمان اگر ہست ای مُرید
آن کہ دارد شیخ عالم بایزید
من ندارم طاقت آن تاب آن
کان فزون آمد ز کوششھای جان"
(ص ۷۰۹، ۷۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

فخر الدین عراقی کی ایک معروف غزل کے مطلع کا پہلا مصرع ارمغان حجاز کے حصہ "حضور رسالتؐ" کی ایک دوبیتی میں تضمین کیا:

گناہ عشق و مستی عام کردند
دلیل پختگان را خام کردند
بہ آہنگ حجازی می سرایم
"نخستین بادہ کاندر جام کردند"
(ص ۷۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور شیخ سعدی شیرازی کی بوستان کے دو اشعار کو فلسفۂ خودی کے حوالے سے نئے معنی پہناتے ہوئے پیامِ مشرق کے ایک قطعہ "قطرۂ آب" میں تضمین کیا:

مرا معنیٔ تازۂ مدعاست
اگر گفتہ را باز گویم ازوست
"یکی قطرہ باران ز ابری چکید
خجل شد جو پہنای دریا بدید
کہ جای کہ دریاست من نیستم
گر او ہست حقا کہ من نیستم"
و لیکن ز دریا برآمد خروش
زشرم تنک مایگی رو مپوش
تماشای شام و سحر دیدۂ
چمن دیدۂ دشت و در دیدۂ
بہ برگ گیاہی بہ دوش سحاب
درخشیدی از پرتو آفتاب
گہی ہمدم تشنہ کامان داغ
گہی محرم سینہ چاکان باغ
گہی خفتہ درتاک و طاقت گداز
گہی خفتہ درخاک ولی سوز و ساز
زموجِ سبک سیر من زادۂ
زمن زادۂ در من افتادۂ

بیاسای در خلوت سینہ ام
چو جوہر درخش اندر آئینہ ام
گہر شو در آغوش قلزم بزی
فروزان تر از ماہ و انجم بزی
(ص ۲۸۲، ۲۸۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک ہندی کے پیرو شعراء میں مرزا اسد اللہ خان غالب کا ایک شعر پیامِ مشرق کے حصہ "نقشِ فرنگ" کی ایک نظم "پیام" میں تضمین کیا:

"مژدہء صبح درین تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"
(ص ۳۶۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ کے حصہ "آنسوی افلاک" میں غنی کشمیری کو شاہِ ہمدان میر سید علی ہمدانی کے حضور سخنسرا دکھایا اور اُن کا ایک شعر تضمین کیا:

ازتپ یاران تپیدیم در بہشت
کہنہء غم ھا خریدم در بہشت
تا در آن گلشن صدای دردمند
ازکنار حوض کوثر شُد بلند
"جمع کردم مُشت خاشاکی کہ سوزم خویش را
گل گمان دارد کہ بندم آشیان در گلستان"
گفت رومی آنچہ می آید نگر
دل مدہ بہ آنچہ بگذشت ای پسر
شاعر رنگین نوا طاہر غنی
فقر او ظاہر غنی باطن غنی
نغمہء می خواند آن مست مدام
در حضور سید والا مقام

سید السادات سالارِ عجم
دست او معمار تقدیر اُمم
(ص ۴۶ ۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور نظیری نیشاپوری کا درجِ ذیل شعر اسرارِ خودی کی زینت بنایا :

"نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم"
(ص ۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

تضمینات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے خراسانی ،عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء سے معنوی اخذ و اکتساب بھی کیا۔ مثلاً

سبکِ خراسانی کے پیرو شعراء میں فردوسی طوسی کے شاھنامے کے ایک شعر کی جھلک :

"چو کودک لب از شیر مادر بشست
بہ گہوارہ محمود گوید نخست" (۵)

سلطان محمود غزنوی کے مزار پر کہے گئے درجِ ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے :

آنکہ چون کودک لب از کوثر بشست
گفت در گہوارہ نامِ او نخست
(ص ۷ ۸۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

فرخی سیستانی کے معروف مرثیے کے مطلع کی جھلک :

شہر غزنین نہ ہمانست کہ من دیدم پار
چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شدہ کار (۶)

شہر غزنین کے کھنڈرات کے حوالے سے کہے گئے مثنوی مسافر کے درج ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے۔

خیزد از دل نالہ ھا بی اختیار
آہ آن شہری کہ اینجا بود پار
(ص ۷ ۸۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے حضرت امام حسینؑ کی منقبت میں کہے گئے ایک معروف شعر کی جھلک :

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنای لا الہ ھست حسین (۷)

رموزِ بے خودی کے درج ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے :

بہر حق در خاک و خون گردیدہ است
پس بنای لا الہ گردیدہ است
(ص ۱۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک عراقی کے پیرو شعراء میں شیخ سعدی شیرازی کے ایک شعر کی جھلک :

مردِ خدا بہ مشرق و مغرب غریب نیست
چندانکہ می رود ہمہ ملک خدای اوست (۸)

پیامِ مشرق کے ایک قطعے "الملک للہ" کے درج ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے۔

خندید و دست خویش بہ شمشیر بردو گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدای ماست
(ص ۲۹۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

خواجہ حافظ شیرازی کے ایک شعر کی جھلک :

دوش از مسجد سوی میخانہ آمد پیرما
چیست یارانِ طریقت بعد ازین تدبیر ما؟ (۹)

اسرارِ خودی کے درج ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے :

چیست یاران بعد ازین تدبیر ما
رُخ سوی میخانہ دارد پیر ما
(ص ۷۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور عبدالرحمٰن جامی کی ایک دوبیتی کی جھلک :

ای آنکہ بقبلہ وفا دوست ترا
بر مغز چرا حجاب شُد پوست ترا

دل در پی این و آن نہ بخوست ترا
یک دل داری بس است یک دوست ترا(۱۰)

پیام مشرق کی درج ذیل دوبیتی میں دکھائی دیتی ہے :

مرا فرمود پیر نکتہ دانے
ہر امروز تو از فردا پیام است
دل از خوبان ہی پروا نگھدار
حرتمش جز باو دادن حرام است
(ص ۲۱۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک ہندی کے پیرو شعراء میں عرفی شیرازی کے ایک شعر کی جھلک۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند ہلاکم کنی و یا بہ تتار (۱۱)

پیامِ مشرق حصہ مئی باقی کے درجِ ذیل شعر میں دکھائی دیتی ہے :

شادم کہ مزارمن در کوی حرم بستند
راہی بہ مژہ کاوم از کعبہ بہ بتخانہ
(ص ۳۳۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ملک قمی کے ایک معروف شعر کی جھلک :

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شُد از نظر
یک لحظہ را غافل شُدم صد سالہ راہم دُور شُد (۱۲)

رموزِ بے خودی کے درجِ ذیل اشعار میں دکھائی دیتی ہے :

خوش نوائی نغمہ ساز قم زدہ است
زخمۂ معنی بر ابریشم زدہ است
تاکشد خار از کف پارہ سپر
می شود پوشیدہ محمل از نظر
گر بقدر یک نفس غافل شدی

دور صد فرسنگ از منزل شدی

(ص ۱۳۸ اکلیاتِ اقبال فارسی)

اور مرزا اسد اللہ خان غالب کے درجِ ذیل شعر کی جھلک :

بامن میاویز ای پسر فرزند آذر رانگر

ہر کس کہ شُد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد (۱۳)

پیامِ مشرق حصہ "خُردہ" کی درج ذیل دوبیتی میں دکھائی دیتی ہے :

چہ خوش بودی اگر مرد نکویی

زبند باستان آزاد رفتی

اگر تقلید بودی شیوۂ خوب

پیمبر ہم رہ اجداد رفتی

(ص ۳۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

معنوی طور پر اخذ و اکتساب کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء کی توصیف میں بھی بے شمار اشعار کہے مثلاً

سبکِ خراسانی کہ پیرو شعراء میں فردوسی طوسی کی مدح میں کہے گئے مثنوی مسافر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

آہ غزنی آن حریم علم و فن

مرغزار شیر مردان کہن

دولتِ محمود را زیبا عروس

ازحنا بندان او دانای طوس"

(ص ۸۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

آن دیارو کاخ و کو ویرانہ ایست

آن شکوہ و فال و فر افسانہ ایست

گنبدی در طوف او چرخ برین

تربت سلطان محمود است این

آنکہ چون کودک لب از کوثر بشست
گفت در گھوارہ نامِ او نخست
شوخیٔ فکرم مرا از من ربود
تا نبودم در جہان دیر و زود
وارھیدم از جہان چشم و گوش
فاش چون امروز دیدم صبح دوش
شہر غزنین یک بہشت رنگ و بو
آبجوھا نغمہ خوان درکاخ و کو
(ص ۸٦۷ کلیاتِ اقبال فارسی)
قصر ہای او قطار اندر قطار
آسمان با قبہ ھایش ھم کنار
"نکتہ سنج طوس" را دیدم بہ بزم
لشکر محمود را دیدم بہ رزم
(ص ۸٦۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

سنائی غزنوی کی مدح میں کہی گئی ارمغان حجاز کی ایک دوبیتی ملاحظہ ہو :

عطا کُن شور رومی، سوز خسرو
عطاکُن صدق و اخلاص سنائی
چنان با بندگی درساختم من
نگیرم گر مرابخشی خدائی
(ص ۸۹۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور مثنوی گلشن راز جدید کی تمہید میں عطار نیشاپوری کی مدح میں کہا گیا ایک شعر ملاحظہ ہو جو درحقیقت شیخ محمود شبستری کی گلشن راز کا ایک شعر ہے اور جسے علامہ اقبال نے عطار سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے دھرادیا :

مرازین شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید
(ص ۵۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک عراقی کے پیرو شعراء میں مولانا جلال الدین رومی کی مدح میں کہی گئی ارمغان حجاز کی ایک دوبیتی ملاحظہ ہو :

چو رومی در حرم دادم اذاں من
از او آموختم اسرارِ جان من
بدور فتنۂ عصرِ کہن او
بدور فتنۂ عصر روان من

(ص ۹۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

عبدالرحمٰن جامی کی مدح میں کہے گئے اسرارِ خودی کے دو اشعار اُن کے ایک شعر کی تضمین کے ساتھ ملاحظہ ہوں :

کشتۂ اندازِ ملا جامیم
نظم و نثر او علاج خامیم
شعر لبریز معانی گفتہ است
در ثنای خواجہ گوہر سفتہ است
"نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست"

(ص ۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور عراقی ہمدانی اور عبدالرحمٰن جامی ہر دو کی مدح میں کہی گئی ارمغانِ حجاز کی ایک دوبیتی ملاحظہ ہو :

گہی شعر عراقی را بخوانم
گہی جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را
شریک نغمہ ھای ساربانم

(ص ۹۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک ہندی کے پیرو شعراء میں نظیری نیشاپوری کی مدح میں کہا گیا پیام مشرق حصہ "مئی باقی" کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس میں علامہ نے اُن کے ایک مصرع کو بھی تضمین کیا :

بملک جم ندہم مصرع نظیری را
"کسی کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست"

(ص ۳۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

غنی کشمیری کی مدح میں کہی گئی پیامِ مشرق کی ایک نظم ملاحظہ ہو :

غنی آن سخنگوی بُلبل صفیر
نواسنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود سربستہ داشت
چو رفت از سرا تختہ را واگذاشت
یکی گفتش ای شاعر دل رسی
عجب دارد از کارِ تو ہر کسی
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر
فقیر و باقلیم معنی امیر
ز من آنچہ دیدند یاران رواست
درین خانہ جز من متاعی کجاست؟
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش
متاعِ گرانیست درخانہ اش
چو آن محفل افروز درخانہ نیست
تہی تر ازین ہیچ کاشانہ نیست

(ص ۳۰۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور مرزا اسد اللہ خان غالب کی مدح میں کہا گیا بانگِ درا کا ایک قصیدہ ملاحظہ ہو جس کا پہلا اور آخری شعر درجِ ذیل ہے :

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مُرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟ (۱۴)

☆☆☆

تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء کے کلمات،

اصطلاحات اور تراکیب کو بھی اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیا مثلاً

سبکِ خراسانی کے پیرو شعراء میں فردوسی طوسی کے شاھنامے کی ایک ترکیب :

چو کودک لب از شیر مادر بشست

بہ گہوارہ محمود گوید نخست (۱۵)

مثنوی مسافر کے درج ذیل شعر میں استعمال کی :

آنکہ چون کودک لب از کوثر بشست

گفت در گہوارہ نامِ او نخست

(ص ۸۶۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

عطار نیشاپوری کی منطق الطیر کے ایک نعتیہ شعر کی اصطلاح :

صد ہزاران سبزہ پوش از غم بسوخت

تاکہ آدم را چراغی برفروخت (۱۶)

اسرارِ خودی کے درجِ ذیل شعر میں استعمال کی :

شعلہ ہای او صد ابراھیم سوخت

تا چراغ یک محمدؐ بر فروخت

(ص ۱۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور شیخ معین الدین چشتی اجمیری کے حضرت امام حسینؑ کی منقبت میں کہے گئے ایک شعر کی ترکیب :

سر داد و نداد دست در دست یزید

حقا کہ بنای لا الہ ہست حسین (۱۷)

رموزِ بے خودی کے درج ذیل شعر میں استعمال کی :

بہر حق در خاک و خون گردیدہ است

پس بنای لا الہ گردیدہ است

(ص ۱۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبکِ عراقی کے پیرو شعراء میں مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کے دو اشعار کی تراکیب :

ترک جوشش شرح کردم نیم خام

از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الٰہی نامہ گوید شرح این
آن حکیم غیب و فخر العارفین (۱۸)

مثنوی مسافر میں حکیم سنائی کی توصیف میں کہے گئے درج ذیل شعر میں استعمال کیں :

آن حکیم غیب آن صاحب مقام
ترک جوش رومی از ذکرش تمام
(ص ۸۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

بو علی قلندر پانی پتی کے ایک شعر کی تراکیب :

مرحبا ای بلبل باغِ کہن
از گل رعنا بگو با ما سخُن (۱۹)

اسرار خودی کے درجِ ذیل اشعار میں استعمال کیں :

باتو می گویم حدیث بو علی
در سوادِ ہند نام او جلی
آن نوا پیرای گلزار کہن
گفت باما از گُل رعنا سخُن
(ص ۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور خواجہ حافظ شیرازی کے ایک شعر کی ترکیب :

خیز و درکاسۂ زر آب طربناک انداز
پیشتر زانکہ شود کاسۂ زرخاک انداز (۲۰)

پیامِ مشرق کی درجِ ذیل دوبیتی میں استعمال کی :

ترا از خویشتن بیگانہ سازد
من آن آبِ طربناکے ندارم
ببازام مجو دیگر متاعے
چو گُل جز سینۂ چاکے ندارم
(ص ۲۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبکِ ہندی کے پیرو شعراء میں علامہ اقبال نے نظیری نیشاپوری کے ایک شعر کی ترکیب :

زپای تا بہ سرش ناز و عشوہ صف بستہ
ہزار معرکہ و رخصت تماشا نیست (۲۱)

پیامِ مشرق کے حصہ ''مئی باقی'' کی ایک غزل کے درجِ ذیل شعر میں استعمال کی :

نظر بخویش چنان بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہان گرفت و مرا فرصت تماشا نیست
(ص ۳۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

صائب تبریزی اصفہانی کے ایک شعر کی ترکیب :

خوشا وقتی کہ چشم از سوادش سرمہ چین گردد
شوم چون عاشقان و عارفان از جان گرفتارش (۲۲)

مثنوی مسافر کے شہر کابل کے حوالے سے کہے گئے درجِ ذیل شعر میں استعمال کی :

چشم صائب از سوادش سرمہ چین
روشن و پایندہ باد آن سرزمین
(ص ۸۵۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور مرزا اسد اللہ خان غالب کے ایک شعر کی ترکیب :

زخمہ بر تار رگ جان می زنم
کس چہ داند تاچہ دستان می زنم (۲۳)

اسرارِ خودی کے درجِ ذیل شعر میں استعمال کی :

محفل رامش گری برھم زدم
زخمہ بر تارِ رگِ عالم زدم
(ص ۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

کلمات و اصطلاحات و تراکیب کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء کی معروف بحریں، اوزان، ردیفیں اور قوافی بھی اپنی شاعری میں استعمال کیے مثلاً

سبک خراسانی کے پیرو شعراء میں ناصر خسرو کے ایک قطعے :

روزی ز سر سنگ عقابی بہ ہوا خاست
بہر طلب طعمہ پر و بال بیاراست
چون نیک نگہ کرد پر خویش برو دید
گفتا زکہ نالیم کہ ازماست کہ برماست (۲۴)

کی تقلید میں پیامِ مشرق حصہ ''افکار'' کا ایک قطعہ ''شاہین وماہی'' لکھا :

ماہی بچۂ شوخ بہ شاہین بچہء گفت
این سلسلۂ موج کہ بینی ہمہ دریاست
بگذر ز سر آب و بہ پہنائے ہوا ساز
این نکتہ نہ بیند مگر آن دیدہ کہ بیناست
(ص ۲۸۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

نظامی گنجوی کے ۱۲ اشعار پر مبنی ایک قطعے :

دوش رفتم بہ خرابات مرا راہ نبود
می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود (۲۵)

کی تقلید میں پیامِ مشرق حصہ ''نقش فرنگ'' کی ایک نظم ''خرابات فرنگ'' لکھی :

دوش رفتم بہ تماشای خرابات فرنگ
شوخ گفتاری رندی دلم از دست ربود
فاش گفتم بہ تو اسرار نہانخانۂ زیست
بکسی باز مگو تاکہ بیابی مقصود
(ص ۳۸۳، ۳۸۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور پیامِ مشرق کے حصہ ''افکار'' کی ایک نظم ''کشمیر'' میں عطار کی ایک معروف غزل :

بادِ شمال می وزد جلوۂ نسترن نگر
وقت سحر ز عشق گل بلبل نعرہ زن نگر (۲۶)

کا ردیف اور قافیہ استعمال کیا۔ ان دونوں کے وزن میں البتہ تھوڑا فرق ہے۔ نظم ''کشمیر'' کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

رخت بہ کاشمر گشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہان جہان ببین، لالہ چمن چمن نگر
دخترکے برہمنے، لالہ رُخے، سمن برے
چشم بروی او گشا، بازبہ خویشتن نگر
(ص ۳۰۲، ۳۰۳کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک عراقی کے پیرو شعراء میں علامہ اقبال نے فخر الدین عراقی کی ایک معروف غزل :

نخستین بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مست ساقی وام کردند (۲۷)

کے جواب میں گلشنِ راز جدید میں ایک غزل کہی جس کا وزن تھوڑا مختلف ہے لیکن ردیف اور قافیہ ایک ہی ہے :

فنا را بادۂ ہر جام کردند
چہ بیدردانہ اور را عام کردند
(ص ۵۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق حصہ ''مئی باقی'' کی ایک غزل میں :

بیاکہ ساقی گل چہرہ دست برچنگ است
چمن ز باد بہاران جواب ارژنگ است
(ص ۳۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

شیخ سعدی شیرازی کی ایک غزل کا ردیف اور قافیہ استعمال کیا :

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تابہ صوری ہزار فرسنگ است (۲۸)

اور وحشی بافقی کے ایک قطعے :

زیباتر آنچہ ماندہ ز بابا از آنِ تو
بدی برادر از من و اعلا از آنِ تو
از صحن خانہ تا بہ لب بام از آنِ من
وز بام خانہ تا بہ ثریا از آن تو (۲۹)

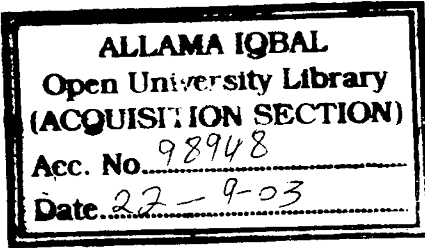
کی طرز پر پیامِ مشرق حصہ نقش فرنگ کی ایک نظم "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" لکھی :

غوغای کارخانۂ آھنگری ز من
گلبانگ ارغنون کلیسا از آنِ تو
این خاک و آنچہ در شکم او از آن من
وز خاک تا بہ عرش معلا از آن تو
(ص ۳۸۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

سبک ہندی کے پیرو شعراء میں علامہ اقبال نے نظیری نیشاپوری کی ایک غزل :

ہر کہ نوشید مئی شوق تو نسیانش نیست
و آنکہ محو تو شد اندیشۂ حرمانش نیست (۳۰)

کا ردیف اور قافیہ پیامِ مشرق حصہ نقش فرنگ کی ایک نظم "پیام" میں استعمال کیا :



حکمت و فلسفہ کاری است کہ پایانش نیست
سیلی عشق و محبت بہ دبستانش نیست
(ص ۳۵۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

مرزا بیدل کی ایک غزل :

بہ عجز کوش ز نشو نما چہ می جوئی
بخاک ریشۂ تست از ہوا چہ می جوئی (۳۱)

کا ردیف اور قافیہ جاوید نامہ حصہ "آنسوی افلاک" کی ایک غزل میں استعمال کیا :

بہ آدمی نرسیدی خدا چہ می جوئی
ز خود گریختہ ای، آشنا چہ می جوئی
(ص ۷۵۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور حزین لاہیجی اصفہانی کی ایک غزل :

می گرفتیم بہ جانان سر راہی گاہی
او ہم از لطف نہان داشت نگاہی گاہی (۳۲)

کا ردیف اور قافیہ زبور عجم کی ایک غزل میں استعمال کیا :

می شود پردۂ چشمم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہان را با نگاہے گاہے
(ص ۳۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

علامہ اقبال نے خراسانی عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء کی بعض معروف چیزوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا مثلاً :

گدائی

میکدے میں ایک دن اک رند زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے ؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا؟
اس کے آب لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا!
مانگنے والا گدا ہے! صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میرو سلطان سب گدا (۳۳)

☆☆☆

آن شنیدستی کہ روزی زیرکی با ابلہی
گفت کین والیٔ شہر ما گدایٔ بی حیاست
گفت چون باشد گدا آن کز کلاہش تکمۂ
صد چو ماھا روزھا بل سال ھا برگ و نواست
گفت ای ناداں غلط اینکہ ازینجا کردۂ
آن ہمہ برگ و نوا دانی کہ آنجا از کجاست
در و مروارید طوقش اشک اطفال من است

لعل و یاقوت ستامش خون ابنای شماست
آنکه تا آب سبو پیوستہ از ما خواستست
گر بجوئی تا بمغز استخوانش نان ماست
خواستن گدیہ است خواهی عشر خوان خواہی خراج
زانکہ گروه نام باشدیک حقیقت را رواست
چون گدائی چیز دیگر نیست جز خواھندگی
ہر کہ خواہد چون سلیمان ست و گر قارون رواست (۳۴)

اقبال کی نظم "گدائی" انوری کے اسی مضمون کے مندرجہ بالا قطعہ سے ماخوذ ہے۔ دونوں نظموں میں مماثلت اس حد تک پائی جاتی ہے کہ پہلا اور آخری شعر نہ صرف مفہوم بلکہ الفاظ کی تکرار کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بہت مشابہت رکھتے ہیں اور دونوں نظموں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے :

ابو العلا معری

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اُسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوان تروتازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحب غفران و لزومات
اے مرغک بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟
افسوس! صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات (۳۵)

بقای انسب

قصه شنیدم که بوالعلا به همه عمر
لحم نخورد و ذوات لحم نیازرد
در مرض موت با اجازه دستور
خادم او جوجه به محضر او برد
خواجه چو آن طیر کشته یافت برابر
اشک تحسّر ز هر دو دیده بیفشرد
گفت بطیر از چه شیر شرزه نگشتی؟
تا نتواند کست بخون کشد و خورد
مرگ برای ضعیف امر طبیعی است
هر قوی اول ضعیف گشت و سپس مرد (۳۶)

اقبال کی نظم ابوالعلامعرّی ایرج مرزا کے قطعہ بقای انسب سے کس درجہ مماثلت رکھتی ہے۔ دونوں کا مرکزی خیال ایک ہے۔ اقبال نے تیتر کے شاہین نہ بننے پر افسوس کیا ہے جبکہ ایرج نے ماکیان کو شیر بننے کی تلقین کی ہے لیکن انجام دونوں کے ہاں یکساں ہے کہ جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات کے سوا کچھ اور نہیں۔



قبلاً مذکور مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان کے اسلوب میں شاعری بھی کرتے رہے۔ کیونکہ جن فارسی شعراء سے بھی انہوں نے اخذ واکتساب کیا وہ کسی نہ کسی اسلوب کے نمایندہ شعراء میں سے تھے اور ان کے یہاں اس اسلوب کی تمام خصوصیات موجود تھیں لہذا ناقدین اقبال کا یہ کہنا کہ علامہ کے یہاں ان کی شاعری کے ہر دور میں خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب میں سے کسی نہ کسی اسلوب کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں کچھ غلط نہیں۔ چند آراء ملاحظہ ہوں :

ڈاکٹر حسین خطیبی لکھتے ہیں :

"از میان شعرای معروف سبک خراسانی فقط بطور مستقیم آثاری از منوچہری و ناصر خسرو در دیوان او دیده می شود و معلوم است که در این سبک ہم مطالعه ء کافی محموده ولی تمایلی به پیروی و تقلید از آن نداشته است و به ہمین مناسبت قصیده در دیوان او بسیار کم دیده می شود لیکن برای اثبات مطالعه و تتبع و در سبک خراسانی استعمال بعضی از مختلف لفظی

سبک خراسانی را در اشعار وی بعنوان مہمترین دلیل ذکر نمود زیرا یقین است کہ این مختصات در دورہء سبک عراقی از درمیان رفتہ و در سبک ہندی کلی مورد استعمال نداشتہ است۔،،(۳۷)

سعید نفیسی فرماتے ہیں:

''اقبال آخرین شاعر بزرگ سبک معروف بہندوستانی یا با اصطلاح ادبی امپرسیونیسم است۔ اگر درست اشعار او را با بزرگان شعرای ایران بسنجیم می بینیم کہ این مطلب درست نیست و شعر اقبال با اشعار شاعران معروف سبک امپرسیونیسم مثلا عرفی و فیضی و ظہوری و نظیری و بیدل و صائب و کلیم و غالب و دیگران شباہت کامل ندارد بلکہ بیشتر باشعار شاعرانی مانند است کہ ما باید آنہا را سمبولیست بگوئیم و بزرگ ترین نمایندگان این سبک سنائی و عطار و مولانا جلال الدین و عراقی و اوحدی و کمال خجندی اند۔''(۳۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:

''اقبال فارسی شاعری کے متعارف شعری دبستانوں میں سے کسی ایک دبستان کے پابند معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ اس معاملے میں انتخاب کے قائل نظر آتے ہیں مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ خراسانی یا ترکستانی دبستانِ شعر سے بہت دور ہونے کے باوجود بعض بعض موقعوں پر وہ اس دبستان کے بعض پیرایہ ہائے بیان کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ البتہ عراقی دبستان کا رنگ ان کے اسالیب میں نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ زبان و بیان کے معاملے میں وہ حافظ اور عہد مغلیہ کے فارسی شاعروں سے اتنے زیادہ فیض یاب اور متاثر ہوئے ہیں کہ ہم بنیادی طور پر انھیں اس عراقی ہندی روایت کا شاعر کہنے اور سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو حافظ سے شروع ہو کر بابا فغانی اور ان کے متبعین تازہ گویان ہند کے ذریعے بیدل اور غالب تک پہنچتی ہے۔''(۳۹)

اور ڈاکٹر حسین خطیبی لکھتے ہیں:

"از سبک هندی اثری که در اشعار اقبال دیده میشود یکی گاه گاه مضامین وافکاری
است که در ضمن غزل و مثنوی ها و سایر آثار او مشاهده میکنیم که تا اندازه ای۔ آنہم نہ با
دشواری و تکلف۔ بسبک هندی نزدیک میگردد و دیگر بعضی از اصطلاحات و ترکیبات که با
اصطلاحات و ترکیبات زبان فارسی مستعمل در میان ما تفاوت است ومیتوان قسمتی از آن را
با قیمانده اصطلاحات و ترکیبات سبک هندی ودنبالہ آن دانست و قسمتی دیگر را در شمار لغات
اصطلاحات فارسی معمول در هندوستان وپاکستان محسوب داشت وہمین گونہ کلمات است
کہ دربین غزلیت وسایر آثار او گاهگاه بچشم می خورد ودر حقیقت مہمترین وجہ امتیاز آثار او از
اشعار شعرای سبک قدیم عراقی بشمار می آید۔" (۴۰)

درج بالا ان آراء کی روشنی میں اس بات کی تحقیق از حد ضروری ہے کہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں خراسانی، عراقی اور ہندی اسالیب کے نمائندہ خصائص کی اگر وہ ہیں تو فرداً فرداً نشاندہی کی جائے اور اگر وہ نہیں ہیں تو بھی اس کی وضاحت کی جائے۔

لہذا میں نے سبک ھای شعر فارسی اور سبک اقبال کو اپنے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کا موضوع بنایا اور کلام اقبال میں فارسی کے معروف شعری اسالیب کے نمائندہ خصائص کی تلاش اور بیان کے ضمن میں علامہ کی فارسی شعری تصانیف کو فردا فردا اور سن اشاعت کی ترتیب سے پیش نظر رکھا۔

مزید بر آں میں اپنے مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں اپنے شریک نگران استاد محترم ڈاکٹر صدیق خان شبلی کے ساتھ ساتھ اپنی نگران استاد محترمہ ڈاکٹر کلثوم فاطمہ سید (مرحومہ) کے بھرپور اور بے لوث تعاون کی بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود میری رہنمائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

مقالہ نگار

فرزانہ ماجد



حوالہ جات

۱۔بانگِ درا ،علامہ اقبال ،شیخ غلام علی اینڈ سنز ،لاہور ،۱۹۹۶ء ،ص ۹

۲۔اقبال نامہ ،ج ۲ ، شیخ عطااللہ ،لاہور ،۱۹۵۱ء ،ص ۱۴۹

۳۔اقبال نامہ ،ج ۱ ،شیخ عطااللہ ،لاہور ،۱۹۴۵ء ،ص ۳۰۳

۴۔ایضا ،ج ۲ ،ص ۱۴۹

۵۔شاہنامہ ء فردوسی ،ج ۱،بکوشش دکتر محمد دبیر سیاقی ،انتشارات انجمن آثار ملی ،۱۳۴۸ء ،
مقدمہ شاہنامہ بیت ۲۱۷

۶۔دیوان حکیم فرخی سیستانی ،انتشارات زوار ،تہران ،شاہ آباد ،۱۳۴۹ء ،ص ۹۰

۷۔اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی ، دکتر محمد ریاض ،مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان ،
اسلام آباد ،پاکستان ،۱۹۸۶ء، ص ۳۵

۸۔کلیات سعدی ،بہ اھتمام محمد علی فروغی ،موسسہ انتشارات امیر کبیر تہران ،۱۳۶۵ ،ص ۴۲۸

۹۔دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی ، باھتمام محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی ، کتابخانہ ء زوار ،
چاپ سینا تہران ،س ن ،ص ۸

۱۰۔دیوان جامی ،چاپخانہَ پیروز تہران ،۱۳۴۱ ،ص ۸۰۹

۱۱۔کلیات عرفی شیرازی ،بکوشش غلام حسین ،کتاب فروشی وچاپ خانہ ء محمد علی علمی ،س ن ،ص ۴۸

۱۲۔اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی ، دکتر محمد ریاض ،ص ۱۰۵

۱۳۔کلیات غالب فارسی ،ج ۳ ،مجلس ترقیٔ ادب لاہور ، ۱۹۶۷ء ،ص ۱۹۰

۱۴۔بانگِ درا ،علامہ اقبال ،ص ۲۶

۱۵۔ شاہنامہ ء فردوسی، ج ۱، مقدمہ شاہنامہ، بیت ۲۱۷

۱۶۔ دیوان فرید الدین نیشاپوری، انتشارات کتاب خانۂ سنائی ۱۳۳۹ء، ص ۱۰۶

۱۷۔ اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی گوئی، دکتر محمد ریاض، ص ۳۵

۱۸۔ مثنوی معنوی، مولانا جلال الدین رومی، موسسہ ء انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۱ء

دفتر ۳، بیت ۳۹۴۷، ۳۹۵۰ ۳

۱۹۔ اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی گوئی، دکتر محمد ریاض، ص ۷۰

۲۰۔ دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی، ص ۱۸۹

۲۱۔ دیوان نظیری نیشاپوری، کتاب خانہ ء امیر کبیر وزوار، ۱۳۴۰، ص ۴۷

۲۲۔ کلیات صائب تبریزی، انتشارات کتابفروشی خیام، ۱۳۳۳ شمسی، ص ۸۱۱

۲۳۔ کلیات غالب، مطبع نولکشور، س ن، ص ۳۳۹

۲۴۔ دیوان ناصر خسرو، موسسۂ انتشارات نگاہ، تہران ۱۳۷۵ء، ص ۱۴۲

۲۵۔ دیوان نظامی گنجوی، بکوشش استاد سعید نفیسی، انتشارات فروغی، ۱۳۶۲، ص ۲۸۵

۲۶۔ دیوان فرید الدین عطار، با تصحیح و مقابلہ و مقدمہ سعید نفیسی، انتشارات کتابخانۂ سنائی، ۱۳۳۹، ص ۳۱۳

۲۷۔ دیوان عراقی، موسسہ انتشارات نگاہ، تہران، ۱۳۷۴، ص ۹۲

۲۸۔ کلیات سعدی، ص ۴۳۸

۲۹۔ دیوان وحشی بافقی، انتشارات امیر کبیر، ۱۳۴۲، ص ۲۸۸

۳۰۔ دیوان نظیری نیشاپوری، ص ۹۷

۳۱۔ کلیات میرزا عبد القادر بیدل، ج ۱، پوھنی مطبعہ اسد ۱۳۴۱، ص ۱۱۳۳

۳۲۔ دیوان حزین لاھیجی، بہ تصحیح ذبیح اللہ صاحبکار، ۱۳۷۴، ص ۴۵۹

۳۳۔ کلیاتِ اقبال اردو ' لاہور '۱۹۷۳ء' ص ۴۰۸

۳۴۔ دیوان انوری' ج ۲' باھتمام محمد تقی مدرس' انتشارات بنگاہ ترجمہ ء نشر کتاب تہران'
۱۳۴۰ مطابق ۱۹۶۱ء ' ص ۵۲۸

۳۵۔ کلیات اقبال اردو' ص ۴۴۸' ۴۴۹

۳۶۔ ایرج مرزا' چاپ خانہ ء بازرگانی' اسفند ماہ ۱۳۴۲ تہران ص ۱۶۸

۳۷۔ اقبال ایرانیوں کی نظر میں' ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی' اقبال اکادمی کراچی' ۱۹۵۷ء
ص ۱۴۸، ۱۴۹

۳۸۔ اقبال ایرانیوں کی نظر میں' ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی' ص ۹۸

۳۹۔ مقامات اقبال' ڈاکٹر سید عبداللہ' لاہور اکیڈمی لاہور' ۱۹۶۴ء' ص ۹۶' ۹۷

۴۰۔ اقبال ایرانیوں کی نظر میں' ص ۱۴۵' ۱۴۶

بابِ اوّل

شعری اسلوب کیا ہے ؟

اور فارسی کے مشہور شعری اسالیب کون کونسے ہیں ؟

اسلوب عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طرز، طریقہ اور راہ وروش کے ہیں۔ اور اس کی جمع اسالیب ہے۔

اسلوب کے لئے فارسی زبان میں سبک کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں :

ہٖخۂ سیم یا زر یا فلز دیگر کہ آن را گداختہ ودر قالب ریختہ باشند "(۱)

لیکن جدید فارسی میں اسے شکل، سانچا، قالب یا انداز ہی کہا گیا ہے۔ محمد جعفر محجوب لکھتے ہیں :

"سبک عبارت است از طرز بیان مافی الضمیر "(۲)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

"نحوۂ بیان وطرز ادای مافی الضمیر وابستہ بہ گوہر آدمی است وبانفسِ او پیوندی ناگسستنی دارد "(۳)

اسی لئے بقول اُن کے (۴) ناصر خسرو، سنائی اور عطار جیسے نامور شعراء کے افکار تو بہت سے لوگوں کے یہاں پائے جاتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے مطالب کو ان تین نامور شعراء کے طرز میں بیان نہیں کیا۔ اسی وجہ سے یہ سارے شعراء ناصر خسرو، سنائی اور عطار نہیں ہیں۔ اسی طرح اگر فردوسی کے سبک کو سعدی کے سبک سے مختلف ٹھہرایا جاتا ہے تو یہ اختلاف اُن مطالب کا نہیں جو ان دونوں کی شاعری میں آئے بلکہ اس انداز کا ہے جو ہر ایک نے اپنے افکار کے بیان کے لئے منتخب کیا لیکن وہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتے کہ :

"انسان در انتخاب طرز بیان افکار وادای آنچہ در ضمیر خویش دارد آزاد نیست و عامل ھای گوناگوں آزادیٔ فرد درادر این باب محدود می کنند۔ انسان موجودی است اجتماعی ودر جامعہ یی کہ پیش از پدید آمدنِ او وجود داشتہ است زیست می کند۔ بنا بر این برای بیان ادراک ھا وانفعال ہای وی قالب ہا وشکل ہای از پیش وجود دارد۔ آداب وعادات ورسوم، طرزِ استعمال ومعنی ہای حقیقی ومجازی واژہ ھا ومقررات اجتماعی پیش از فرد پدید آمدہ است وہمین قالب ہا وعامل ہا نخستین مادۂ سبک را تشکیل می دھد۔ ہر گوئندہ ونویسندہ برای بیان اندیشہ خویش جز این مصالح چیزی در اختیار ندارد۔ "(۵)

ہاں البتہ بقول اُن کے :

"سبک خاصِ ہر کس درست در نقطہ یی کہ این گونہ قواعد وقوانین بہ پایان می آید آغاز می گردد۔ "(٦)

یوں سبک کی تعریف اُن کی نگاہ میں کچھ اس طرح ٹھہرتی ہے کہ :

"سبک ہر کس عبارت از روش است کہ برای بیان اندیشۂ خویش
بر می گزیند مشروط بر آن کہ این روش را خود ابداع کردہ واز کسی بہ عاریت
نگرفتہ باشد۔ در چنین موردی گویندہ یا نویسندہ کلماتی را کہ استعمال عام و
مانوس در اند طوری بہ یکدیگر می پیوند کہ از آن معنایی جز معنی کلمات
مشابہ مستفاد گردد و ہمین امر موجب می شود کہ گفتۂ او صورت مثلِ سایہ بہ
خود گیرد و ہر کس مقصدی نظیر قصد آن گویندہ داشتہ باشد برای بیان آن
گفتۂ او را بہ عاریت گیرد"(۷)

محمد جعفر محجوب اچھے اور بُرے سبک کی تعریف بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"سبک نیکو سبکی است کہ در آن الفاظ برابر معانی آید و نویسندہ یا گویندہ
درست ہمان مطلب را کہ در نظر داشتہ است بیان کردہ باشد۔"(۸)

جبکہ

"ارزش اثر از لحاظِ سبک ہنگامی تنزل می کند کہ گویندہ یا نویسندہ در مقام
بیان مافی الضمیر خویش گرفتارِ تکلف یا انحراف و سر گشتگی شُدہ باشد یا کم تراز
اندازۂ لازم درباب تطبیق لفظ با معنی مورد نظر خویش کوشیدہ باشد۔"(۹)

گویا سبک کے بارے میں محمد جعفر محجوب کے افکار کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ سبک مافی الضمیر کا طرز بیان ہے اور لکھنے والے کے نفس کا عکاس ہوتا ہے۔ لیکن ایک معاشرتی مخلوق ہونے کے ناتے لکھنے والے کو اپنے طرزِ بیان کے انتخاب میں بہت سی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہاں البتہ جب وہ ان پابندیوں سے انحراف کر کے ایک نئی روش ایجاد کرتا ہے اور عام اور مانوس معنوں کے حامل الفاظ کی اس طرح سے ایک دوسرے سے پیوند کاری کرتا ہے کہ ان سے نئے معنی اخذ ہوں وہیں سے اس کے اپنے خاص سبک کی ابتداء ہوتی ہے مزید بر آں اس کا سبک اُسی صورت میں اچھا سبک کہلاتا ہے جب وہ لفظ و معنی میں مکمل مطابقت پیدا کرتا ہے بصورتِ دیگر اس کی تحریر اپنی تاثیر کھو بیٹھتی ہے۔

ایران میں عہد قدیم میں سبک اور اس کی خصوصیات کا موضوع بعض شعراء کی توجہ کا مرکز رہا اور انہوں نے اپنے کلام میں اشارے بھی کئے مثلاً خاقانی شروانی کا عنصری کی ردیف کے ساتھ ایک قطعہ ملاحظہ ہو جس میں وہ اپنے آپ

کو عنصری سے برتر قرار دیتے ہیں :

جز از طرزِ مدح و طراز غزل
نکردی ز طبع امتحان عنصری
شناسد افاضل کہ چون من نبود
بہ مدح و غزل درفشان عنصری
ز دہ شیوہ کان حلیت شاعری است
بہ یک شیوہ شُد داستان عنصری
نہ تحقیق گفت و نہ وعظ و نہ زہد
کہ حرفی ندانست از آن عنصری
مرا شیوۂ خاص و تازہ است داشت
ہمان شیوۂ باستان عنصری (۱۰)

اور شیخ سعدی شیرازی بوستان کے پانچویں باب "دررضا" کے مقدمے میں فرماتے ہیں :

شبی زیت فکرت ہمی سوختم
چراغ بلاغت می افروختم
پراگندہ گوی حدیثم شنید
جز احسنت گفتن طریقی ندید
ہم از خبث نوعی در آن درج کرد
کہ ناچار فریاد خیزد ز درد
کہ فکرش بلیغ است و رایش بلند
در این شیوۂ زہد و طاعات و پند
نہ در خشت و کوپال و گرزِ گراں
کہ این شیوہ ختم است بر دیگراں (۱۱)

مرزا محمد علی صائب تبریزی اپنے طرزِ تازہ کے حوالے سے فرماتے ہیں :

بہ طرزِ تازہ قسم یاد می کنم صائب
کہ جای طالب آمل در اصفہان پیداست

بہ کلک قدرت صائب فسردگی مرساد
کہ طرزِ حافظ شیراز درمیان انداخت

بر حریفان چون گوارا نیست صائب طرزِ تو
بہ کہ بفرستی بہ ایران نسخۂ اشعار را

زطرزِ تازہ صائب داغ داری نکتہ سنجان را
عجب دارم کز آمل چون تو خوش گفتار بر خیزد

میان اہل سخن امتیاز فنِ صائب
ہمین بس است کہ باطرز آشنا شدہ ام (۱۲)

مرزا محمد علی خان سروش اصفہانی بھی اپنے طرز کا کچھ یوں تذکرہ کرتا ہے :

خسروا، دانی کہ ایدون در خراسان و عراق
ہیچ کس بر شیوۂ من شعر نسراید ہمی
رودکی باید کہ آید بارِ دیگر در جہان
کو تورا مانند من شاید کہ بستاید ہمی (۱۳)

یہ اور اس قسم کی دیگر کئی مثالوں سے چند باتیں سامنے آتی ہیں اور وہ یہ کہ بعض شعراء اپنے خاص اندازِ بیان کی طرف متوجہ رہے اور اس کی تازگی اور نئے پن کا تذکرہ کرتے رہے اور اسے طرز یا شیوے سے تعبیر کرتے رہے اور سبک کے مفہوم سے اسی حد تک آشنا رہے کہ ایک شاعر کو دوسرے سے منفرد ٹھہرا سکیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ان اسباب کی وضاحت نہ کر سکا جو ایک سبک کے دوسرے سے اختلاف اور ایک نئے سبک کے وجود میں آنے کا باعث بنے مزید بر آں شعراء سبک کے اس صریح مفہوم سے واقف نہ تھے جو آج ہمارے سامنے ہے یعنی وہ خاص طرز جو شاعر یا نثر نگار اپنے فکر کے بیان کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ایران میں سبک کا لفظ بہار کی تحقیق کے مطابق (۱۴) ان معنوں میں سب سے پہلے آتشکدۂ آذر اور رضا قلی خان ہدایت کے تذکرۂ مجمع لفصحا میں آیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس مقصد کے لئے یہی لفظ رائج اور مقبول ہو گیا مثلاً خود بہار

سبک کی تشریح کچھ یوں کرتے ہیں :

" روش خاص ادراک وبیان افکار بوسیلۂ ترکیبِ کلمات وانتخاب الفاظ و طرزِ تعبیر۔"(۱۵)

اسی طرح ڈاکٹر سیروش شمیسا سبک کے بارے میں فرماتے ہیں :

"سبک روش مشخص بیان مطلب است یعنی گوینده به چه نحوِ خاص و مشخصی مطالب خود را ایراد کرده است وجهتِ درک این نحوۂ خاصِ بیان باید در انتخاب لغات، شکل جملات و اصطلاحات، صنایع ادبی، عروض و قافیہ............ گوینده دقت شود۔"(۱٦)

لیکن اس کے باوجود وہ سبک کی جامع ومانع تعریف کو دشوار قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

"می توان آن را از دیدگاه‌ہای مختلف تقسیم کرد مثلاً :

۱۔ بر حسبِ نام افرادی که سبک شخصی داشته اند وبعد از خود جریانی را در شاعری یا نویسندگی ایجاد کرده اند یعنی عدۂ کثیری به تبع ایشان شعر گفته اند یا نثر نوشته اند : سبک فردوسی، سبک حافظ، سبکِ صائب، سبک نیما۔

۲۔ بر حسب درک مطلب : سبکِ دشوار و مغلق، سبک ساده وروان، سبک بینابین۔

۳۔ بر حسب نوع زبان : سبک شاعرانه، سبک علمی، سبک روزنامه نگارانه۔

۴۔ بر حسبِ موضوع : سبکِ صوفیانه، سبکِ مذہبی، سبک تاریخی۔

اما از همه مهمتر و معمول تر تقسیم سبک بنا بر دوره است : سبکِ خراسانی، عراقی، هندی۔"(۱۷)

ادوار کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایران وہند کے پرانے تذکروں اور تنقیدی کتابوں مثلاً سدیدالدین محمد عوفی کی لباب الالباب، دولت شاہ سمرقندی کی تذکرۃ الشعراء، سام مرزا کی تحفۂ سامی، لطف علی بیگ آذر کی آتشکدۂ آذر، رضا قلی خان ہدایت کی مجمع الفصحا اور عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی وغیرہ میں فارسی کے شعری اسالیب کے متعلق تھوڑی بہت تفصیل دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی اس موضوع پر مفصل اور اطمینان بخش معلومات موجود نہیں۔ مزید برآں ان میں ابہام یا تضاد بھی پایا جاتا ہے تاہم ان تذکروں ہی کی بدولت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تذکرۂ دولت شاہ (۱۸) میں اکثر مقامات پر اہلِ خراسان اور اہلِ عراق کے مختلف ذوقِ شعری کا ذکر آیا۔ ان اشاروں سے کچھ خیالات مرتب ہو سکتے ہیں۔

تحفۂ سامی (۱۹) میں فنونِ لطیفہ کے حوالے سے شعری اسالیب کا بکثرت ذکر آیا اور عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی (۲۰) میں ان اسالیب کے حوالے سب سے زیادہ آئے۔ اس میں اہل خراسان اور اہل عراق وپارس کے اسالیب کے علاوہ طرزِ تازہ گوئی اور مردمِ کاشان کے اسلوب کا بھی ذکر کیا گیا اور طرز قدماء و متقدمین کے ساتھ ساتھ طرزِ متاخرین یعنی تازہ گوئی اور طرزِ تازہ کی اصطلاحیں بھی استعمال ہوئیں۔

عہدِ شاہجہانی میں اور اس کے بعد تذکرہ نگار خصوصاً ایرانی نژاد استعمال ہند یعنی ان الفاظ اور محاوروں کے حوالے سے جو مقامی اثرات کے تحت فارسی شاعری کا حصہ بنے، طرزِ ہندی کا ذکر کرنے لگے اور طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرے (۲۱) میں ہند کے فارسی شعراء کے لئے الگ باب مخصوص کیا حالانکہ اس سے پہلے تذکروں میں ایران و ہند کا امتیاز موجود نہ تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ایران کے اکثر تذکرے طرزِ ہندی کی شدید مذمت کرتے دکھائی دیئے ہیں جس کے جواب میں ہندوستان میں خان آرزو نے مجمع النفائس میں اور آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں سبکِ ہندی کی تحقیق کی طرف مائل ہو کر ہندی اور دوسرے اسالیب کا تقابلی جائزہ لیا۔

چودھری عبدالغفور کے نام مرزا غالب کے ایک خط میں بھی فارسی شاعری کے مختلف اسالیب کا تصور سامنے آتا ہے۔ فرماتے ہیں :

> "رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و انوری وغیرہم تک ایک گروہ (ایک وضع پر) پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیال ہائے نازک و معانی بلند .... اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ اس روش کے بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربہ دیا۔ صائب و کلیم و حکیم قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودکی و فردوسی کا شیوہ سعدی کے وقت ترک ہوا۔ سعدی کے طرز نے بوجہ سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا تو اب طرزیں تین ٹھہریں۔ (۱) خاقانی اور اس کے اقران (۲) ظہوری اور اس کے امثال اور (۳) صائب اور اس کے نظائر (مگر) ممتاز و اختر وغیرہم (شعرائے ہند) کی طرز ہی اور ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرزِ چوتھی ہے...... مگر فارسی نہیں ہندی ہے"۔ (۲۲)

ایران کے جن نئے اہل علم نے سبک کے موضوع پر کچھ لکھا ان میں محمد تقی بہار، رضازادہ شفق محمد جعفر محجوب، ڈاکٹر سیروس شمیسا، ڈاکٹر فرشید ورد اور ذبیح اللہ صفا وغیرہ اہم ہیں۔ جن میں سے بیشتر نے اپنی تحقیقی کتب میں خاقانی و نظامی

تک سبکِ خراسانی اور ان کے بعد سبکِ عراقی کا ذکر کیا جو صفوی دور تک جاری رہا۔ اس کے بعد سبکِ ہندی کا دور آیا جس کی ابتداء صفوی دور میں ہوئی۔ قاجاری دور میں سبک ہندی متروک ہوا اور بازگشتِ ادبی کی تحریک پروان چڑھی اور شعرائے عہد خوارزمی و سلجوقی و غزنوی کا انداز رائج ہوا۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو فارسی شاعری کے اسالیب کے بارے میں وہی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں جو محمد جعفر محجوب نے سبک کے ادوار کے حوالے سے تقسیم کر کے نکالے (۲۴) یعنی سبکِ خراسانی، سبکِ عراقی، سبکِ ہندی اور نہضتِ بازگشت ادبی لیکن اس حوالے سے ان کی دو باتیں بہت اہمیت کی حامل ہیں :

۱۔ "نام این سبک ہا بہ مکان ہای معین (خراسان، عراق و ہند) بستگی دارد، اما در واقع مکان را در تحول شعر دخالتی نبوده است و سبک ھا مربوط بہ زمان ھا و دوران ھای معین تاریخی است و چون ہر سبک از یک ناحیہ نشات کردہ و در آن نقطہ رشد و توسعہ یافتہ۔ نام آن مکان را نیز بہ خود گرفتہ تا چندی پیش سبک خراسانی را سبک ترکستانی می گفتند و گروھی سبک ہندی را سبکِ اصفہانی خواندہ اند"۔ (۲۵)

۲۔ "ہر یک از سبک ہا در دورانِ تاریخی معین آغاز شدہ و توسعہ یافتہ و پس از رسیدن بہ حد کمال بہ علت ہای سیاسی و اقتصادی یا اجتماعی و ادبی نطفہ ہای سبکِ بعد در آن ظاہر شدہ و رشد کردہ و سر انجام سبک تازہ را پدید آوردہ است۔ از این روی نمی توان بین دو سبک از اینِ سبک ھای سہ گانہ خطی فاصل قرار داد و روز یا سالی را برای آغاز شدن این یا انجام یافتن آن تعیین کرد۔ بلکہ شعر پارسی در مدتی دراز اندک اندک تحول می یافتہ است بہ نحوی کہ بین نخستین چکامہ ہای سبک خراسانی و غزل ہای عراقی تفاوتی آشکار دیدہ می شود۔ اما در دورانی کہ این تحول تدریجی در کار انجام یافتن بودہ، سبک ہای بین بین نیز در نظر می آید مثلاً شعر انوری ابیوردی دارای سبکی است بین عراقی و خراسانی و شاعر در آن لطافت و رشاقت سبکِ عراقی را با ضخامت و صلابت اسلوب خراسانی بہ ہم آمیختہ است"۔ (۲۶)

لہذا ڈاکٹر سروش شمیسا کے بقول فارسی شاعری کے ادوار کی تقسیم یوں ہونی چاہیے :

۱۔ سبک خراسانی : نیمہء دوم قرنِ سوم، قرنِ چہارم و قرنِ پنجم

۲۔ سبک حدِ واسط یا دورۂ سلجوقی : قرنِ ششم

۳۔ سبکِ عراقی : قرن ہفتم، ہشتم، نہم

۴۔ سبک حدِ واسط یا مکتب وقوع وواسوخت : قرن دھم

۵۔ سبک ہندی : قرنِ یازدہ وشمہ اول دوازدہ

۶۔ دورۂ بازگشت ادبی : اواسط قرن دوازدہ تا پایانِ قرنِ سیز دھم

۷۔ سبکِ حدِ واسط یا دوران مشروطیت :شمہ اول قرنِ چہار دھم

۸۔ سبکِ نو :از شمہ دوم قرنِ چہار دہم بہ بعد "(۲۷)

لیکن چونکہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں خراسانی عراقی اور ہندی اسالیب کے پیرو شعراء کے کلام کے حوالے بہت زیادہ ہیں لہذا اس تحقیقی مقالے میں انہی تین معروف اسالیب کا علامہ اقبال کے فارسی شعری اسلوب سے تقابلی مطالعہ کر کے ان کے اسلوب کو منفرد ٹھہرایا گیا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ فرہنگ صبا' انتشارات صبا، ۱۳۶۹ھ ش

۲۔ سبک خراسانی در شعر فارسی، محمد جعفر محجوب، چاپ تہران ایران، ۱۳۴۵ش، ص ۲۲۔

۳ تا ۹۔ ایضاً ص ۲۴، ۲۴، ۲۵، ۳۱، ۳۳، ۳۳۔ ۳۴، ۳۳، ۳۳، ۳۳۔

۱۰۔ دیوانِ خاقانی، چاپ تہران، ایران ۱۳۳۸ھ ش، ص ۶۸۰۔

۱۱۔ کلیات سعدی، چاپ تہران، ایران، ۱۳۱۸ھ ش، ص ۱۵۳۔

۱۲۔ دیوان صائب تبریزی، چاپ تہران، ایران، ۱۳۳۳ھ ش ص......

۱۳۔ دیوان شمس الشعراء سروش اصفہانی، طبع تہران' ۱۳۴۰ھ ش' ص ۶۵۳

۱۴۔ سبک شناسی، محمد تقی بہار ملک الشعراء ج ا، چاپ تہران، س ن، ص ی'یا۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۷

۱۶۔ سبک شناسی شعر، دکتر سروش شیسا، چاپ تہران ایران، ۱۳۷۵، ص ۱۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۔

۱۸۔ تذکرہ الشعراء، دولت شاہ سمرقندی، چاپ مطبوع علوی تہران، ایران، ۱۳۰۵ھ ق۔

۱۹۔ تحفۂ سامی، سام مرزا، الہ آباد، ہندوستان ۱۹۳۴ء۔

۲۰۔ مآثر رحیمی، عبدالباقی نہاوندی، کلکتہ، ہندوستان، ۱۹۳۱ء۔

۲۱۔ تذکرۂ طاہر نصر آبادی، چاپخانۂ ارمغان' تہران ایران' ۱۳۱۷ھ ش۔

۲۲۔ عود ہندی، مرزا غالب دھلوی، طبع ترقی ادب لاہور۔ پاکستان، س ن، ص ۱۱۸، ۱۱۹۔

۲۳۔ سبک خراسانی در شعر فارسی، محمد جعفر محجوب، ص ۳۵۔

۲۴۔ ایضاً۔ ص ۳۵۔

۲۵۔ ایضاً۔ ص ۳۵۔ ۳۶۔

۲۶۔ سبک شناسی شعر، دکتر سیروش شیمسا، ص ۱۲، ۱۳۔

☆☆☆

باب دوّم

سبکِ خُراسانی

سبکِ خُراسانی اور اس کی خصوصیات

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ سبک قدیم خُراسان اور ترکستان میں نمودار ہوا۔ اور اس کے موجد خُراسان کے وہ شاعر تھے جو صفاریوں، طاہریوں، سامانیوں، غزنویوں اور سلاجقۂ اوّل کے درباروں سے متعلق تھے۔ ڈاکٹر محمد ریاض سبک خُراسانی کی ابتداء کے متعلق لکھتے ہیں :

> "سبک خُراسانی یا ترکستانی مربوط بہ زمان است (از آغاز شعر فارسی تا اواخر قرن ہفتم ہجری) ونہ بہ مکان...... شعر فارسی در نقاط شرقی ایران آن زمان، ترکستان، خراسان و ماوراالنہر آغاز گردیدہ و سپس بر مناطق دیگر ایران و کشورہای ہمجوار تداول یافتہ است۔ پیداست کہ پایہ گذاری ادب فارسی در مناطق شرقی دراعصار حکومت طاہریان (۲۰۵-۲۵۹ھ) وصفاریان (۲۵۹-۲۹۱ھ) وسامانیان (۲۹۱-۳۷۶ھ) عملی شدہ و سپس در دورہای غزنویان وغوریان وسلاجقہ، ادب وشعر فارسی توسعۂ بیشتر یافتہ است۔ در اصطلاح "سبک خراسانی" عبارت است از سبک شعر فارسی از آغاز معلوم آن الی اواسط قرن ہفتم ہجری۔" (۱)

ایران میں عربوں کا تسلط قائم ہوا تو ایران کی پہلوی زبان کی جگہ رفتہ رفتہ عربی نے لے لی۔ لیکن جب ۱۳۲ھ بمطابق ۷۴۹ میلادی میں بنو عباس کی خلافت قائم ہوئی تو ایران میں حب الوطنی کی روح بیدار ہوئی اور ایرانی علماء اور شعراء نے فارسی زبان کے احیاء پر توجہ دی۔ چنانچہ خراسان کی وسیع اور حسین سرزمین پر فارسی زبان وادب نے دوبارہ جنم لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل آلِ طاہر، صفار اور آلِ سامان کی خود مختار وطنی حکومتیں یہیں قائم ہوئیں اور یہاں سے ایران قدیم کی بنیادیں اٹھائی گئیں۔ اور یہاں ہی حکمرانوں نے علماء اور شعراء کو فارسی زبان وادب کی طرف متوجہ کیا۔ رودکی، رابعہ کعب قزداری، ابو شکور بلخی، شہید بلخی، دقیقی، کسائی مروزی وغیرہ اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔

سامانیوں کی حکومت ختم ہوئی تو ۳۵۱ھ بمطابق ۹۶۲ میلادی میں غزنوی دور کا آغاز ہوا جو ایران میں ۴۲۹ھ بمطابق ۱۰۳۷ میلادی تک قائم رہا۔ غزنوی حکومت کا مرکز بھی خراسان ہی تھا۔ انہوں نے اپنے پیش رو حکمرانوں کی پیروی کی۔ علماء اور شعراء کو سرکار دربار میں جگہ ملی اور فارسی شعر وادب کی ترویج واشاعت ہونے لگی۔ اور عنصری، فرخی، منوچہری، غضائری اور فردوسی جیسے درخشاں ستارے آسمانِ ادب پر چمکے۔ ان کی سخن سرائیوں سے شعر وادب کا پایہ اور بھی بلند ہو گیا۔ غزنویوں

کے آخری تاجدار مودود بن مسعود کو سلجوقیوں نے شکست دے کر غزنوی عہد کا خاتمہ کیا اور سلجوقی عہد کی بنیاد رکھی انہوں نے خراسان کے ساتھ ساتھ عراق کو بھی سلجوقی حکومت کا مرکز بنایا۔ سلجوقی حکمرانوں خصوصاً طغرل بیگ، الپ ارسلان اور ملک شاہ اور طغرل کے وزیر عمید الملک الکندری اور الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر نظام الملک طوسی نے فارسی شعر وادب کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی فیاضیوں کا یہ اثر ہوا کہ عمر خیام، باباطاہر عریاں، ابو سعید ابوالخیر، ناصر خسرو، امیر معزی، رشید الدین وطواط، ادیب صابر اور انوری جیسے نامور شعراء نے شعر وادب کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ فارسی شعر وادب کی اس ترقی کی وجہ محض سلجوقی حکمرانوں کی حوصلہ افزائی نہ تھی بلکہ سلجوقی دور میں یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں غوریوں، خوارزم شاہیوں، آل بویہ، غزنویوں اور اتابکوں کی معاصر حکومتیں بھی ان خدمات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہیں۔ غزنوی حکمران مودود کی شکست کے بعد غزنوی دور ایران میں تو ختم ہو گیا لیکن غزنی اور ہند میں ان کی حکومت ابھی قائم تھی اور ان کے دربار سے حکیم سنائی اور مسعود سعد سلمان جیسے نامور شاعر وابستہ تھے۔

طاہری، صفاری، سامانی، غزنوی اور سلجوقی دور کے بیشتر شعراء کو چونکہ حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہی اور وہ معاشی اور معاشرتی خوشحالی سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے لہذا قصیدہ نگاری کی صنف کو رواج حاصل ہوا۔ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا:

"قالب شعری مسلط قصیدہ است"۔

اور

"موضوعات شعری از قبیل مرثیہ وحکمت وموعظہ ولغز وچیستان وخمریہ وحماسہ وغناو داستانسرایی در آن ہست اما موضوع اصلی مدح ممدوح وسپس وصف بزم می ومعشوق است وہمہء مہارت واطلاعات شاعر در خدمت این قصد اصلی (قصیدہ) یعنی مدح است"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۶۹، ۶۸

قصیدہ نگاری کی ابتداء تو رودکی نے کی لیکن عنصری، فرخی، منوچہری، امیر معزی اور انوری اس دور کے انتہائی معروف قصیدہ نگار بن کر ابھرے۔ دیگر اصناف میں سے بقول سیروس شمیسا:

"غزل بہ معنی مصطلح خیلی کم است اما رباعی ومثنوی رایج است۔ مسمط وترجیع بند ھم دیدہ می شود"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سروش شمیسا، ص ۶۹

اس دور کے اکثر حکمران چونکہ جنگی معرکہ آرائیوں اور محافل عیش وعشرت میں شعراء کو اپنے ساتھ رکھتے لہذا رزمیہ اور بزمیہ شاعری کو فروغ ملا۔ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا:

"روحیہ' حماسی بر اشعار این دورہ حاکم است۔ حتیٰ در پند و اندرز و در باب می و معشوق نیز کلام حماسی است"۔

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ۶۸

شعراء میدانِ کارزار کے ایک ایک منظر کی تفصیل بیان کرتے۔ مثلاً دقیقی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زبس بانگِ اسپان و جوش و خروش
ہمی نالہء کوس نشیدہ گوش
درفشانِ بسیار افراشتہ
سرنیزہ ہا زابر بگذاشتہ
چورستہ درخت از برکوہسار
چوبیشہ نیستان بوقتِ بہار
ز تاریکئ گرد و بانگ سپاہ
کسی روزِ روشن نمی دید راہ
بجر دندیک تیر باران درست
بسان تگرگ بہاران درست
پوشیدہ شد چشمۂ آفتاب
زبیکانہای درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر آرد ہمی
وزآن ابر الماس بارد ہمی(۲)

شعراء نے محض جنگی معرکہ آرائیوں کی ہی تصویر کشی نہیں کی۔ ان حالات و واقعات کی بھی تصویر کشی کی جو دورانِ جنگ پیش آتے مثلاً فردوسی کے یہاں گرمی کی شدت کا بیان درج ذیل ہے:

یکی راہ پیش آمدش ناگزیر
ہمی رفت بائیست بر خیرہ خیر
بیابان بی آب و گرمای سخت
کزو مرغ گشتی بہ تن لخت لخت
چنان گرم گردید ہامون و دشت

تو گفتی که آتش برو برگذشت
تن رخش و گویا زبانِ سوار
زگرمی و از تشنگی شُد زکار
پیاده شُد از اسب و ژوپین بدست
همی رفت پویان بجردار مست
نمی دید برچاره جُستن رهی
سوی آسمان کرد رو آنگهی (۳)

اس کے علاوہ شعراء نے طبعی حوادث اور تاریخی واقعات کی بھی تصویر کشی کی بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

"شعری واقع گرا است و اوضاع دربارها' محیط زندگی' روابط ارباب و کنیز و غلام' تفریحات و ماوقع لشکر کشی ها و جنگ را منعکس می کند۔ به طوری که از برخی از اشعار عنصری می توان لشکر کشی و حوادث جنگی را به نحو دقیق تاریخی استخراج کرد و در آن از امور ذهنی و خیالی خبری نیست"۔

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ٦٦

مثلاً قطران تبریزی کے قصیدہ "زلزلہ تبریز" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

خدا به مردم تبریز برفگند فنا
خُدا به نعمت تبریز برگماشت زوال
فراز گشت نشیب و نشیب گشت فراز
رمال گشت رماد و رماد گشت رمال
بسا سرای که بامش همی بسود فلک
بسا درخت که شاخش همی بسود هلال
کزان درخت نمانده مگر کنون آثار
وزآن سرای نماند کنون مگر اطلال
کسی که رسته شد از مویه گشته بود چو موی
کسی که جسته بداز ناله گشته بود چو نال
یکی نبود که گوید به دیگری که موی

یکی نبود کہ گوید بدیگری کہ منال
کمال دور کناد ایزداز جمالِ جہاں
کجی رسد بجمالی کجا گرفت کمال(۴)

بزمیہ شاعری میں البتہ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

''معشوق مقام والایی ندارد و حتیٰ گاھی مقام او پست است۔ معشوق گاھی مرد است و گاھی کنیز شاعر است و از این رو ھمیشہ صحبت از وصال است نہ فراق''
سبک شناسی شعر ، دکتر سیروس شمیسا ، ص ۶۷

فطرت کا مطالعہ اور اس کے مظاہر کا بیان بھی شعراء کا مرغوب موضوع رہا۔ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

''طبیعت گرایی و واقع گرایی و بیرون گرایی شاعران این عھد سبب شدہ است کہ بہ توصیف جزئیات طبیعت بپردازند''
سبک شناسی شعر ، دکتر سیروس شمیسا ، ص ۷۳

مثلاً منوچہری بہار کی تعریف میں یوں سخن سرا ہوتے ہیں :

روی گلِ سُرخ بیاراستند
زلف شمشاد بپیراستند
کبکان بر کوہ بہ تگ خواستند
بلبلگان زیر وستا خواستند
فاختگان ہم بر بنشاستند
نای زنان بر سرِ شاخِ چنار
لالہ بہ شمشاد برآمیختند
ژالہ بہ گلزار درآویختند
بر سر آن مشک فروبیختند
وز بر این در فروریختند
نقش و تماثیل برانگیختند
از دل خاک و دُورخِ کوہسار(۵)

شعراء نے مضامین کی بنیاد مشاہدات و تجربات پر رکھی مثلاً رودکی کا ایک قطعہ ہے :

روی محراب نهادن چه سود

دل به بخارا و بُتانِ طراز

ایزد ما وسوسہ ء عاشقی

از تو پذیرد نپذیرد نماز (۶)

رودکی منافقت کے سخت خلاف تھے اسی لئے وہ ایسے لوگوں سے ہمیشہ متنفر رہے جن کی زبان تو حق آگاہ تھی لیکن دل کفر آشنا تھے اسی طرح عنصری کی ایک رباعی ہے۔

در عشقِ تو کس پاکی ندارد مجز من

در شورہ کسی تخم نکارد مجز من

بادشمن و بادوست بدت می گویم

تا ہیچ کست دوست ندارد مجز من (۷)

عنصری یہ جانتے تھے کہ کسی شور زدہ زمین میں بیج بونا ناممکن ہے اور وہ اپنے محبوب کے دل میں جو ایک شور زدہ زمین کی مانند ہے عشق کا بیج نہیں بو سکتے لیکن وہ اپنے عشق میں اس قدر سچے تھے کہ انہیں یقین تھا کہ وہ اس ناممکن کام کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں اسی لئے وہ ہر ایک کے سامنے اپنے محبوب کی برائی کرتے ہیں تاکہ کوئی دوسرا اُس کا عاشقِ زار نہ بن جائے۔

مُسرت ونشاط اکثر شعراء کی شاعری کا موضوع رہا۔ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا:

"شعر این دورہ شعری شاد و پر نشاط است و روحیہ ء تساھل و خوشباشی را تبلیغ می کند و از محیط ھای اشرافی و گردش و تفریح و باغ و بزم سخن می گوید۔ دلایل آن یکی روحیہ ایرانیان کہن و دوم رفاح سیاسی و اقتصادی در زمان سامانیان و تاحدی غزنویان و سوم زندگانی ء خود شاعران است کہ صلہ ھای گران می گرفتند و مرفہ می زیستند و بہ دربارھا رفت و آمد داشتند"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۶۶

اس قسم کی شاعری کے ابتدائی نقوش رودکی کی شاعری میں ملتے ہیں مثلاً:

شاد زی باسیاہ چشمان شاد

کہ جہان نیست جز فسانہ و باد

ز آمدہ تنگ دل نباید بود

و ز گذشتہ نکرد باید یاد (۸)

اور منوچہری کے یہاں سوائے ایک نظم شمع کے جو غم کا مرقع ہے ساری کی ساری شاعری مُسرت و نشاط سے بھر پور ہے یہی نہیں وہ اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں شراب کی تمنا بھی انتہائی والہانہ انداز سے کرتے ہیں :

آمد شب و از خواب مرا رنج و عذاب است

ای دوست بیار آنچہ مرا داروی خواب است

من خواب ز دیدہ بمیٔ ناب ربایم

آری عدوی خوابِ جوانان میٔ ناب است

سخت عجب آید کہ چگونہ بُردش خواب

آن را کہ بہ کاخ اندر یک شیشہ شراب است

وین نیز عجب تر کہ خورد بادۂ بی چنگ

بی نغمۂ چنگش بمیٔ ناب شتاب است(۹)

عقل و دانش اور پند و موعظت کے مضامین بھی گاہے بگاہے شعراء کے یہاں دکھائی دیتے رہے۔

بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

"شعر این دورہ از پند و اندرز خالی نیست ولی این پندھا بیشتر جنبہ ء عملی و سادہ دارند و یاد آور پندھای ھستند کہ از بزرگان ایران باستان چون انوشیروان و بزرجمہر ماندہ است حالانکہ پندھای امثال سنائی و خاقانی جنبہ ھای شرعی و عرفانی دارد و نسبت بہ پندھای این دورہ تجریدی و پیچیدہ است"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۶۹

مثلاً ابوالحسن شہید بلخی کے دو شعر ہیں :

اگر غم را چو آتش دود بودی

جہان تاریک بودی جاودانہ

درین گیتی سراسر گر بگردی

خردمندی نیابی شادمانہ(۱۰)

فردوسی بھی نیک نامی کے حوالے سے اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں :

ہمان نام بہتر کہ ماند بلند

کہ مرگ افگند سوی ما ہم کمند

زمانہ بمردن بخشتن یکی است
وفا باسپہر روان اندکی است (۱۱)

مزید برآں اس دور کی شاعری میں
بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

"جنبہ ھای عقلانی و تعادل بر جنبہ ھای احساسی و اغراق چیرہ است و از این رو مثلاً مدح و ھجو ھم متعادل است و غلوبہ صورت دورہ ھای بعد دیدہ نمی شود"۔
سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۶۷

اس دور کی شاعری میں جذبات نگاری بھی کی گئی لیکن بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

"بادنیائی درون و احساسات و عواطف و ھیجان ھا و مسائل روحی سروکار ندارد"۔
سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۶۸

بلکہ اس میں انہی حالات کو پیشِ نظر رکھا گیا جو شعراء کے سامنے ہوتے مثلاً محمود غزنوی کی وفات پر لکھا گیا مرثیہ فرخی کے سوگوار احساسات کی پوری پوری ترجمانی کرتا ہے۔

شہرِ غزنین نہ ہمان است کہ من دیدم پار
چہ فتاد است کہ امسال دگر گوں شُدہ کار (۱۲)

اور فردوسی کے شاھنامے میں سہراب کی ماں کو بیٹے کی موت کی خبر سنائی گئی جو اپنے ہی باپ کے ہاتھوں اُس سے ناآشنا ہونے کے باعث مارا گیا تو ماں کے جذبات کو ذیل کے اشعار میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا۔

چہ دانستم ای پور کاید خبر
کہ رستم بہ خنجر دریدت جگر
دریغش نیامداز آن روی تو
از آن برز و بالا و بازوی تو
پروردہ بودم تنش را بناز
بہ رخشندہ روز و شبان دراز
کنون آن بخون اندرون غرقہ گشت
کفن بر تن پاک او خرقہ گشت
کنون من کرا گیرم اندر کنار

که خوابد بدن مر مرا غمگسار
پدر جستی ای گرد لشکر پناه
به جای پدر گورت آمد براه
چرا نامدم با تو اندر سفر
که گشتی به گردان گیتی سمر
مرا رستم از دور بشناختی
ترا بامن ای پور بنواختی
همی گفت و می خست ومی کند موی
همی زد کفِ دست بر خوب روی(۱۳)

فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان میں بھی اشعار کہے گئے اور ابوالحسن شہید بلخی، عنصری، منوچہری اور امیر مغری وغیرہ کے یہاں عربی الفاظ اور عربی شاعری کے مفاہیم بھی استعمال ہوئے لیکن بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا:

"اشارہ بہ معارف اسلامی وحدیث و قرآن کم است وآنچہ هست عمیق نیست وبہ اصطلاح مورد بحث وفحص وبسط قرار نمی گیرد وشاعر ازآن مضمون نمی سازد یاازآن استفادہء تمثیلی نمی کند"۔

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ۶۸

گویا بحیثیت مجموعی فارسی شاعری پر عربی زبان وادب کا اثر بہت کم رہا۔ جس کی نمایاں ترین مثال فردوسی کا شاہنامہ ہے جس کی بدولت انہوں نے فارسی زبان کو ہی نہیں قدیم ایرانی بادشاہوں کی داستانیں رقم کر کے ایران کی قومی تاریخ کو بھی ایک نئی زندگی بخشی۔ انہوں نے اپنے شاہنامے میں فارسی زبان کو سہل، رواں اور خالص ملکی زبان کی صورت میں پیش کر کے آنے والے ادیبوں کے لئے ایک نئی شاہراہ کھولی۔

زبان میں فطری پن سادگی اور بے ساختگی کا عنصر غالب رہا بلکہ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا:

"سادگی لغات وروانی ترکیب ھا مھم ترین مشخصہ شعری این دورہ است"۔

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ۷۰

مزید برآں

"قافیہ وردیف ھر چہ بہ عقب تر برویم سادہ تر است ومثلا از ردیف ھای دراز و غیر معمول استفادہ نمی شود واصولا ردیف کم است"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، چاپ ص ۷۲

اس سادگی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ شعراء کے سامنے زبان وبیان کے سانچے موجود نہ تھے اور انہوں نے فطرت سے اسالیب ایجاد کئے مثلاً رودکی کا معروف قصیدہ :

بوی جوی مولیاں آید ہمی
یادِ یارِ مہربان آید ہمی
ریگِ آمو و درشتیھای او
زیرِ پایم پرنیان آید ہمی (۱۴)

زبان کی سادگی، بے ساختگی اور فطری پن کی ایک عمدہ مثال ہے۔

شاعری میں خلوص اور صداقت کو خصوصی اہمیت حاصل رہی بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

"فارسی شاعری کا خراسانی دبستان طرزِ بیان کے مقابلے میں سچے تجربے کو اہمیت دیتا ہے۔ (۱۵)

مثلاً رابعہ قزداری کا یہ قطعہ :

دعوتِ من بر تو آن شد کایزدت عاشق کناد
بریکی سنگین دلی نامہربان چون خویشتن
تابدانی دردِ عشق و داغِ مہر و غم خوری
تابہ ہجر اندر بہ پیچی و بدانی قدرِ من (۱۶)

عاشق کے خالص اور سچے جذبات اور اُس شدید ردعمل کا حقیقی مظہر ہے جو اس کے دل میں اپنے عشق کی ناقدری کے نتیجے میں پیدا ہو سکتا ہے۔

زبان وبیان میں ملائمت اور لطافت کی بجائے شکوہِ لفظ کو اہمیت دی گئی بقول ڈاکٹر سید عبداللہ :

"خراسانی دبستان................ کے شاعروں کے ہاں صوتی لحاظ سے ثقیل اور "گراں" الفاظ عام تھے اور چونکہ وہ اظہار کو بنیادی اہمیت دیتے تھے اس لئے سبک اور لطیف الفاظ کی بطور خاص جستجو نہیں کرتے تھے۔" (۱۷)

صوت وآہنگ میں موزونیت پر خاص نظر رہی اور اوزان عموماً الحان موسیقی سے ہم آہنگ رہے۔ مثلاً عنصری کے ایک قصیدے کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

زیرِ کردارش بزرگی زیرِ گفتارش خرد

زیر پیالش سپہر و زیرِ فرماش جہان
ای خرد را جان و جان را دانش و دل را امید
پادشاہی را چراغ و نیک نامی را روان
شادی وشاہی تو داری شادباش و شاہ باش
جامۂ شادی تو پوش و نامۂ شاہی تو خوان (۱۸)

لیکن بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

"در آغاز چون شعر با موسیقی همراہ بود بحوری دیدہ می شود کہ امروزہ مطبوع نیست۔ این اوزان بعد ها متروک شدند' ہمچنین گاهی مسائلی عروضی در شعر این دورہ هست کہ امروزہ جزو استثناء محسوب می شوند"

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ۴۷

صنائع بدائع کا استعمال کیا گیا لیکن چونکہ یہ مطمحِ نظر نہ تھا اس لئے بیان میں پیچیدگی کم سے کم رہی مثلاً فرخی کے ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

چون پرندِ نیلگوں بر روی پوشد مرغزار
پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چون نافِ آہو مشک زاید بی قیاس
بید را چون پرِ طوطی برگ روید بی شمار
روی ہامون سبز چون گردونِ ناپید کراں
روی صحرا سادہ چون دریای ناپیدا کنار (۱۹)

ڈاکٹر سیروس شمیسا اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"استفادہ از بدیع وبیان بہ صورت طبیعی و معتدل است .... صنایع بدیعی این دورہ بیشتر لفظی از قبیل موازنہ واشتقاق ورد الصدر الی العجز ولف ونشر وانواع سجع وتجنیس است واز صنایع معنوی بیشتر بہ موارد سادہ ئی چون تضاد ومراعات النظیر اعتنا دارند وتوجہ ہنری بہ انواع ایہام مطرح نیست"۔

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ۶۹' ۷۰

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

"شاعران با معارف پیش از اسلام آشنا هستند و از این رو تلمیح به اسم قهرمانان و شاهان چون نوشیروان وز نجیراو و اعیاد و مراسمی چون نوروز وسده و بهمجنه بچشم می خورد"۔

سبک شناسی شعر' دکتر سیروس شمیسا' ص ٦٦' ٦٧

شعراء نے تشبیہات کا مواد عموماً عالم فطرت سے لیا اور استعارات قریب الفہم استعمال کئے مثلاً فردوسی کا ایک شعر جو محمود غزنوی کی مدح میں کہا گیا :

به تن ژنده پیل و بجان جبرئیل

بکف ابر بہمن بدل رود نیل(٢٠)

سخاوت کے لئے حاتم طائی کی شخصیت ضرب المثل ہے لیکن فردوسی سخاوت کے لئے ابر بہمنِ کی تشبیہ لایا جس کے فیض سے دریا کی تہ میں پڑی ہوئی سیپیاں بھی گوہر آب دار ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح رودابہ کی تعریف و توصیف میں لکھے گئے فردوسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

پس پردۂ او یکی دُختر است

که رویش زخورشید روشن تر است

ز سر تا بپایش بکردار عاج

بُرخ چون بہار و ببالا چو ساج

بر آن سفت سیمین دو مشکین کمند

سرش گشتہ چوں حلقۂ پای بند

دو چشمش بسان دو نرگس بباغ

مژه تیرگی برده از پرِ زاغ

اگر ماه جوی همه روی اوست

وگر مشک جوی همه بوی اوست(٢١)

☆☆☆

علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر سبکِ خراسانی کے اثرات

۱۔ قصیدہ نگاری

۲۔ تاریخی واقعات کی تصویر کشی

۳۔ فطرت کا مطالعہ اور اس کے مظاہر کا بیان

۴۔ مشاہدے اور تجربے پر مبنی شاعری

۵۔ زبان کا فطری پن، سادگی اور بے ساختگی

۶۔ خلوص اور صداقت

۷۔ جوش و خروش اور ولولہ

۸۔ قریب الفہم تشبیہات اور استعارات کا استعمال

۹۔ اخلاقیات اور پند و موعظت

ا۔ قصیدہ نگاری

علامہ اقبال کا دور قصیدہ سرائی کا دور نہ تھا اور نہ ہی قصیدہ یا رزمیہ و بزمیہ شاعری ان کے مزاج سے مطابقت رکھتی تھی اسی لئے انہوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور کبھی صاحبان زر اور ارباب اثر کی مدح سرائی نہ کی۔ مولانا عبدالسلام ندوی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

> "اگر کوئی شخص در حقیقت مدح و ستائش کا مستحق ہے تو اس کی مدح گوئی کوئی عیب نہیں ہے لیکن ہمارے ایشیائی شعراء نے مستحق اور غیر مستحق کی تمیز اٹھا دی اور حصول زر کے لئے اپنے ممدوحین کے ایسے مبالغہ آمیز اور غیر حقیقی اوصاف بیان کئے کہ مدحیہ شاعری ایشیائی شاعری کے دامن کا ایک بدنما داغ بن گئی مگر ڈاکٹر صاحب نے اولاً تو سرے سے مدحیہ قصائد لکھے ہی نہیں۔ اسرارِ خودی اور پیام مشرق کو بے شبہ سر علی امام اور امیر امان اللہ خان کی خدمت میں بطور نذرِ عقیدت کے پیش کیا اور اس سلسلے میں ان کی مدح میں بھی چند اشعار لکھے لیکن ان میں کہیں واقعیت سے تجاوز نہیں کیا۔" (۲۲)

گویا علامہ اقبال کے یہاں قصائد نہیں مدحیہ اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں اور ان میں بھی وہ حقیقت سے تجاوز نہیں کرتے۔ مثلاً پیامِ مشرق میں افغانستان کے سابق بادشاہ امیر امان اللہ خان کی مدح میں فرماتے ہیں کہ اے خوش بخت بادشاہ تو اگرچہ نوجوان ہے لیکن بوڑھوں کی طرح سمجھدار ہے تیری آنکھیں مخفی امور کو بھی دیکھ سکتی ہیں اور تیرے سینے میں موجود دل جامِ جم کی حیثیت رکھتا ہے۔ تیرا ارادہ تیرے پہاڑوں کی طرح پائیدار ہے اور تیری دور اندیشی ہر مشکل کو آسان بنا دیتی ہے تیری ہمت جو میرے تخیل کی طرح بلند ہے سینکڑوں ٹکڑوں میں بٹی ملت کی شیرازہ بند ہے اور اگرچہ تیرے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں ہے کیونکہ تیرے پاس آئے دن بادشاہوں کی طرف سے تحفے آتے رہتے ہیں پھر بھی اے امیر ایک ہدیہ مجھ فقیر بے نوا کی طرف سے بھی قبول کر لے :

اے امیر کامگار اے شہریار
نوجوان و مثل پیراں پختہ کار
چشمِ تو از پردگیھا محرم است
دل میان سینہ ات جامِ جم است
عزمِ تو پایندہ چون کہسارِ تو

حزم تو آسان کند دشوارِ تو

ہمتِ تو چون خیالِ من بلند

ملتِ صد پارہ را شیرازہ بند

ہدیہ از شاہنشہاں داری بسے

لعل و یاقوتِ گراں داری بسے

اے امیر، ابن امیر، ابنِ امیر

ہدیۂ از بے نوائے ہم پذیر

(ص ۱۸۵،۱۸۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں نادر شاہ والیٔ افغانستان کی مدح میں فرماتے ہیں کہ نادر شاہ درویش صفت بادشاہ ہے جس کی پاک روح پر خدا کی رحمت ہو۔ اس کے حسُن تدبر کی بدولت افغان قوم کو استحکام نصیب ہوا اور اس کی تلوار دینِ اسلام کی محافظ ہے اس کی نمازوں میں حضرت ابو ذر غفاری کی خود گدازی نظر آتی ہے لیکن میدانِ جنگ میں اس کی تلوار سخت سے سخت پتھر کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ اس نے اپنی شانِ جمال سے حضرت صدیقِ اکبرؓ اور شانِ جلال سے حضرت فاروق اعظمؓ کا زریں عہد تازہ کر دیا۔ وہ ہر وقت دین کے غم میں کڑھتا رہتا ہے اور مشرق کی تاریک رات میں اس کا وجود چراغ کی حیثیت رکھتا ہے اس کی نگاہوں سے عاشقانِ الٰہی کی مستی ٹپکتی ہے یوں سمجھو کہ اس کا ضمیر عشق و محبت سے تیار ہوا ہے :

نادر افغان شہ درویش خو

رحمتِ حق بر روان پاکِ او

کارِ ملت محکم از تدبیرِ او

حافظ دینِ مبین شمشیرِ او

چون ابوذر خود گداز اندر نماز

ضربتش ہنگام کین خارا گداز

عہد صدیقؓ از جمالش تازہ شد

عہدِ فاروق از جلالش تازہ شد

از غم دیں دردلش چون لالہ داغ

در شب خاور وجودِ او چراغ

در نگاہش مستی اربابِ ذوق

جوہرِ جانش سراپا جذب و شوق

(ص ۸۵۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں ایک اور جگہ نادر شاہ کی مدح میں فرماتے ہیں کہ نادر شاہ خوش گفتار بادشاہ ہے۔ سادہ لباس پہنتا ہے اور محنتی، نرم طبع اور جوشیلا ہے۔ وہ سچائی اور خلوص کا پیکر ہے اور اس کا وجود دین اور دنیا کے استحکام کا باعث ہے۔ وہ آدمِ خاکی ہے لیکن فرشتوں سے بڑھ کر پاکیزہ ہے اور فقیری اور شاہی دونوں مقامات سے آگاہ ہے وہ دنیائے مشرق و مغرب سے باخبر ہے اور ان کا رازدار ہے وہ حکیموں کی طرح باریکیوں سے آگاہ ہے اور امتوں کے عروج وزوال سے آشنا ہے۔ اس نے معنی کے چہرے سے پردے ہٹائے اور ملک اور مذہب کے حقائق بیان کر دکھائے :

پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش
سخت کوش و نرم خوے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار
دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر
از مقامِ فقر و شاہی باخبر
در نگاہش روزگارِ شرق و غرب
حکمتِ او رازدارِ شرق و غرب
شہر یارے چون حکیماں نکتہ داں
رازدانِ مدوجزرِ اُمّتاں
پردہ ھا از طلعتِ معنی کشود
نکتہ ھاے ملک و دین را وانمود

(ص ۸۵۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے امیر امان اللہ، نادر شاہ اور اسی طرح کی چند دیگر شخصیات کو بلاشبہ سراہا۔ لیکن ان شخصیات کو سراہنے کے پیچھے ایک ہی نقطۂ نظر کار فرما تھا اور وہ تھا اسلامی اقدار کا احیاء۔ علامہ اقبال نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں۔ جس فضا میں پرورش پائی اور جن حالات سے دوچار ہوئے وہ کچھ ایسے تھے جن میں عجمی تصورات اور غیر اسلامی اقدار کی کارفرمائی تھی۔ اقبال نے یہ محسوس کیا کہ اگر مسلم قوم کو دنیا میں سربلند ہو کر رہنا ہے تو اسے اسلامی اقدار کو اپنانا ہو گا کیونکہ اسلامی اقدار بذاتِ خود انقلاب آفرین ہیں۔ اقبال کا اس پر ایمان تھا کہ صرف مسلمان ہی دنیا کی امامت کے لئے پیدا ہوا ہے اور یہ امامت اُسی صورت

میں ممکن ہے جب وہ خود اسلامی زندگی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالے۔ اقبال نے اس نصب العین کو اپنانے میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو اپنی شاعری کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی اور وہ رکاوٹیں اپنی روایات سے بیگانگی اور عجمی تصورات میں محصور ہونا تھا۔

حالات یہ تھے کہ ہندوستان کا مسلمان کئی سو برس سے ذہنی اور علمی حیثیت سے پست ہو چکا تھا اور انگریز کی غلامی نے اس کے اندر جو صلاحیتیں باقی تھیں انہیں بھی ختم کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے دلخراش واقعات کے بعد ہی چند رہنماؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ زندگی کی تگ ودو میں مسلمانوں کو متمدن ترین قوموں کی سطح پر لا کھڑا کیا جائے لیکن وہ رہنما اس حکمران تمدن سے مرعوب تھے۔

ہماری قوم کو دو قسم کے رہنما ملے ایک تو وہ تھے جو قوم کی نجات اس میں دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کو مذہب کی طرف (جو ایک جامد مذہبیت میں منتقل ہو چکا تھا) لے آئیں اور دوسرے رہنما وہ تھے جو حکمران تمدن کی ملمع سازی سے مرعوب ہو کر اس کی اندھادھند نقالی کی دعوت دیتے تھے۔ اسلام کا صحیح نصب العین دونوں رہنماؤں کی نظروں سے اوجھل تھا۔ پہلی قسم کے رہنما ٹوٹی ہوئی کشتی پر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری قسم کے رہنما کعبہ کی بجائے ترکستان کی طرف جا رہے تھے۔ ان حالات میں اقبال کا ظہور ہوا۔ اقبال نے نہ تو مغربی ذہنیت رکھنے والے رہنماؤں کی طرح دین کی طرف سے بے توجہی برتی اور نہ ہی ان لوگوں کا ساتھ دیا جو ہر نئی چیز کی مخالفت پر کمربستہ رہتے تھے۔ اقبال نے دین کا حرکی تصور لے کر اور دین کی غیر متبدل اقدار اور تصورات کو بنیاد مان کر ہر معاصر تمدن کے صالح اجزاء کو اس میں سمونے کی کوشش کی تاکہ ہندی مسلمان اپنے دین کے بنیادی تصورات پر قائم رہتے ہوئے اور زمانے کے جدید تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھ کر دنیا کی امامت کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر سکے۔ المختصر اقبال کا پیغام اسلام اور قرآن کی طرف پھر رجوع کرنے کی دعوت تھی۔ مولوی اور فقیہ نے دین کے تصور کو نہایت محدود اور مسخ کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک دین چند عجمی عقائد اور چند رسموں کے مجموعے کا نام رہ گیا تھا۔ اقبال نے ان تمام پردوں کو جو امتدادِ زمانہ کے باعث قرآن اور اسلام پر پڑ چکے تھے چاک کر کے قرآن اور اسلام کو اس روشنی میں دیکھا جس سے ان کا اصلی مفہوم متعین ہو سکتا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اور خدا کا صحیح مقام کیا ہے اور انسان اپنا حقیقی مقام کس طرح حاصل کر سکتا ہے اقبال کی رائے میں اس کا حصول خودی کے ذریعے ممکن تھا۔ ان کے نزدیک صاحبِ خودی، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے جس شخص کی خودی کمال کے درجے کو پہنچ جاتی ہے وہ تسخیر فطرت کر لیتا ہے اور جب فطرت پر اس کا تصرف ہو جاتا ہے تو وہ کائنات کی تمام اشیاء پر قابض و متصرف ہو کر نائبِ حق بن جاتا ہے اور یہی انسان کا منصبِ جلیلہ ہے پس علامہ اقبال کو جس شخصیت میں بھی اس منصب جلیلہ کی تائید جزوی یا کلی طور پر ملی انہوں نے اسے سراہا شاید اسی لئے ان کے مدحیہ اشعار میں صنفِ قصیدہ کی بعض بنیادی صفات (مثلاً تشبیب وغیرہ) دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ پیامِ مشرق کی چند نظموں (مثلاً ساقی نامہ) میں البتہ تشبیب موجود ہے جو سبکِ خراسانی کی یاد دلاتی ہے۔ ساقی نامہ میں فرماتے ہیں :

کتنا خوبصورت سماں ہے اور بہار کا موسم کس قدر دلفریب ہے کہ باغوں میں جس طرف نگاہ دوڑاؤ ستارے اُگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ بہار کے موسم کی وجہ سے زمین تذرو کے پروں کی طرح خوشنما ہوگئی ہے اور فواروں سے نکلتا آبشاروں کا پانی ہیرے برسا رہا ہے۔ نگاہوں کو ہر طرف لالہ اور گلاب کے پھول دکھائی دے رہے ہیں اور ہوا سبزہ زاروں میں اٹھکیلیاں کر رہی ہے کیا تو نے ندی کے کنارے کلی کی خود آرائی نہیں دیکھی دیکھ کہ کتنا خوبصورت محبوب ہے اور کتنے اچھے آئینے کا مالک ہے۔ شاخوں کی خلوت گاہوں سے پرندوں کی کس قدر میٹھی اور دلکش آوازیں آ رہی ہیں۔ سار اور ہزار کی آواز سے جسم میں جان اور جان میں آرزو زندہ ہو رہی ہے اور اونچے آشیانوں میں رہنے والے پرندوں کی آوازیں ندی کی آوازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہی ہیں ان تمام مناظر کو دیکھ کر تو کہے گا کہ خدا نے پہاڑوں کے دامن میں گویا جنت اتار دی ہے۔ تاکہ انسان اس کے انتظار کی زحمت سے رہائی پا سکے یعنی جیتے جی جنت کا لطف اٹھا سکے۔ لہذا میں اس باغ میں شراب، کتاب، موسیقی اور محبوب کی خواہش کیوں نہ کروں۔ اے چاند جیسی پیشانی والے ساقی میں تجھ پر فدا تو بزرگوں کی یاد دلوں میں از سرِ نو تازہ کر دے یعنی ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا کر جنھوں نے کوہستانِ کشمیر میں توحید کی شمع روشن کی۔ اے خدا ہمارے جام میں ایسی شراب ڈال یا ہمارے دلوں میں آزادی کا ایسا جذبہ پیدا کر دے جو ہمارے قلوب کو منور کر دے اور ہماری جان میں آگ لگا دے یعنی ہمیں سرفروشی پر آمادہ کر دے۔ اے خدا میری سرنگوں اور خوار قوم میں مجاہد جوان پیدا کر دے تاکہ میری قوم جو آج مُشت غبار کے مصداق ہے دنیا میں عیش و عشرت اور کامیابی سے ہمکنار ہو سکے:

خوشا روزگارے خوشا نوبہارے
نجومِ پرن رست از مرغزارے
زمین از بہاراں چوبالِ تذروے
زفوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگاہ جز کہ در لالہ و گل
نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لبِ جو خود آرائی غنچہ دیدی؟
چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوت شاخسارے
بہ تن جاں بہ جاں آرزو زندہ گردد
ز آوائے سارے زبانگِ ہزارے

نواہاے مرغ بلند آشیانے
درآمیخت بانغمۂ جویبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را
نہاد است در دامن کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگان را
رہا سازد از محنت انتظار
چہ خواہم دریں گلستان گرنخواہم
شرابے، کتابے، ربابے، نگارے
سرت گردم ای ساقئ ماہ سیما
بیار ازنیاگانِ ما یادگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جان را
فروزد چو نورے بسوزد چونارے
شقایق برویاں زخاکِ نژندم
بہشتے فروچین بمشتِ غبارے
(ص ۲۸۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

۲۔ تاریخی واقعات کی تصویر کشی

علامہ اقبال کا مطالعہ نہایت وسیع متنوع اور عمیق تھا۔ انہوں نے اپنے وسیع و طویل مطالعہ کے دوران اقوام و ملل سلطنتوں اور ملکوں نیز مذاہب واخلاق اور مختلف انسانی تہذیبوں اور معاشروں کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اس طرح تاریخ اگرچہ اُن کے مطالعہ کا مرکزی اور بنیادی موضوع نہیں تھا لیکن انسانی تقدیر، انسانیت کے عروج وزوال اور انسانی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ہر انسان کی طرح ان کو تاریخ سے دلچسپی تھی۔ پھر فلسفہ انسان کے اندر حقیقت کی جستجو، منتشر اکائیوں اور غیر مربوط اجزاء میں وحدت وربط پیدا کرنے کی جو خواہش وصلاحیت پیدا کردیتا ہے۔ اسباب و مقدمات سے نتائج اور جزئیات سے کلیات تک پہنچنے کی جو عادت ڈال دیتا ہے اور جس طرح فلسفی کی نظر تغیرات وواقعات اور حوادث کی سطح پر نہیں ٹھہرتی بلکہ اس سے گزر کر ان کی تہ تک پہنچتی ہے اس سب کی بنا پر اور اس کی بدولت وہ تاریخ کے تھوڑے مطالعہ سے بھی ان نتائج و حقائق تک پہنچ جاتے ہیں جہاں تاریخ کے وہ صدہا طالب علم اور عالم و مصنف نہیں پہنچتے جو فلسفیانہ عقل و نگاہ سے محروم اور تاریخ کے مکتب و مدرسہ کے روایتی طالب علم اور استاد ہیں۔

مزید برآں قرآن مجید کے عمیق مخلصانہ اور مسلسل مطالعہ نے بھی ان صحیح و عمیق حقائق تک پہنچنے میں علامہ اقبال کی خاص رہنمائی کی جو نسل آدم اور انسانی جماعتوں اور گروہوں کی سعادت و شقاوت اور عروج وزوال کے ایسے ابدی اصولوں پر مشتمل ہے اور دنیا میں پیش آنے والے حوادث اور اقوام و ملل کی ہلاکت وبربادی اور عروج وترقی کے حقیقی اسباب کی اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ عقل انسانی محوِ حیرت رہ جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علامہ اقبال کے کلام میں تاریخی واقعات کی جھلکیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ بات ایک قیمتی انکشاف سے کم نہیں ہوگی کہ اقبال کے کلام میں بعض ایسے دقیق اور لطیف تاریخی اشارے آگئے ہیں جن کی شرح میں دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاسکتے ہیں انہوں نے اپنے بعض قطعوں اور مختصر نظموں اور بعض اوقات ایک شعر میں تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے اور ان کے ایجاز کی سرحدیں شاعرانہ اعجاز سے مل گئی ہیں۔ جو اہم حقائق ان چند شعروں میں آگئے ہیں۔ ان کو اگر شرح وبسط کے ساتھ نثر کے صدہا صفحات میں، تاریخی دلائل و شواہد کی تائید اور کتابوں کے حوالوں کی مدد سے پیش کیا جائے تو وہ اس قدر مؤثر اور دلنشین نہیں ہوسکتے۔ جتنے ان کے شیریں اور دل آویز بیان اور جچے تلے لفظوں میں نظر آتے ہیں، ان کی علمی و تاریخی قدر و قیمت اور ان نتائج کی صداقت کا (جو ان اشعار

میں پیش کئے گئے ہیں) اندازہ صحیح طور پر وہی کر سکتا ہے جس کی عام انسانی اور پھر اسلامی تاریخ اور قرآن مجید کے علوم و معارف پر وسیع اور گہری نظر ہو نیز جس کی یہودیت اور عیسائیت، قدیم ہندوستانی مذاہب، فلسفہ و ادبیاتِ عجم اور قرونِ وسطیٰ کی تاریخ پر بھی گہری نظر ہو۔" (۲۳)

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ آسمان کے لئے جس ہستی یعنی محمد مصطفیٰؐ کے وجودِ مبارک کا تخت بنتا باعثِ شرف تھا ان کے سامنے ایک لڑائی میں قبیلۂ طے کے سردار کی بیٹی قید ہو کر آئی۔ اس کے پاؤں میں زنجیر تھی اور اس کے لئے پردے کا کوئی سامان نہ تھا۔ شرم اور حیا کے باعث اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ رسول اکرمؐ نے لڑکی کو بے پردہ دیکھا تو فوراً اپنی چادر مبارک اس کے چہرے پر ڈال دی۔ (اگرچہ خاتون کا تعلق فریق مخالف سے تھا اور وہ میدانِ جنگ میں گرفتار ہوئی تھی لیکن رسول اکرمؐ کو اس حال میں بھی اُسے سامانِ عزت واحترام سے محروم رکھنا گوارا نہ تھا۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہی حضرت اقبال کو اپنی قوم کی حالت بیچارگی یاد آگئی چنانچہ انتہائی درد و سوز کا پیکر بن کر فرمایا :) ہم قبیلۂ طے کی اس خاتون سے بدرجہا زیادہ برہنہ ہیں۔ دنیا کی قوموں کے سامنے ہم عزت واحترام کی چادر سے محروم ہو چکے ہیں بلاشبہ قیامت کے دن ہمارا یقین وایمان حضرت محمد مصطفیٰؐ ہی پر ہے لیکن اس زندگی میں بھی ہماری پردہ داری حضورؐ کی ذات سے ہی قائم رہ سکتی ہے :

در مصافے پیشِ آن گردوں سریر
دختر سردارِ طے آمد اسیر
پاے در زنجیر وہم بے پردہ بود
گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چون نبیؐ بے پردہ دید
چادر خود پیشِ روے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روز محشر اعتبارِ ماست او
در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

(ص ۲۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ آسمان کو ہم سے ہمیشہ دشمنی رہی اس وجہ سے ہم پر بعض اوقات خوفناک

مصیبتیں بھی نازل ہوئیں جنھوں نے عارضی طور پر ہمارے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ انہیں میں سے ایک مصیبت تاتاریوں کی بھی تھی۔ آسمان ایک خاص وقت تک اس مصیبت کو اپنی آغوش میں پالتا رہا۔ پھر یکا یک اس فتنے اور خوفناک مصیبت کے پاؤں کی بیڑیاں کھول دیں اور اُسے ہم پر نازل کر دیا گویا اُسے یہ دیکھنا منظور تھا کہ ہم اسے برداشت کر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ فتنہ ایسا ہولناک تھا کہ خود محشر بھی اس کی راہ میں روندا ہوا اور اس کی تیغ نگاہ سے ریزہ ریزہ تھا۔ سینکڑوں طوفان اس کی گود میں سوئے ہوئے تھے۔ اس کے گزشتہ کل کی یہ کیفیت تھی کہ اس سے امروز کی صبح پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ مراد یہ کہ جہاں وہ فتنہ پہنچا وہاں کی ہر چیز کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ نہ زندگی رہی نہ امید اور نہ گزشتہ کل کے بعد امروز کے پیدا ہونے کا کوئی امکان رہا۔ اس فتنے نے ملت اسلامیہ کی قوت کو خاک وخون میں تڑپا دیا۔ بغداد کو جو ملت کا مرکز تھا وہ کچھ دیکھنا پڑا جو روما نے بھی نہیں دیکھا۔ یعنی روما پر وحشی قبیلوں نے پے در پے خوفناک حملے کئے۔ لوٹ مار اور تباہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن چنگیز کے پوتے ہلا کو نے ایک ہی حملے میں بغداد کے اندر وہ تباہی پھیلا دی، وہ خونریزی کی کہ روما نے خواب وخیال میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ بہر حال یہ سب کچھ تو ہو چکا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے دوام کا وعدہ کر رکھا تھا۔ دیکھو وہ وعدہ کیونکر پورا ہوا۔ یہ آسمان جس کی چال ہمیشہ ٹیڑھی رہی جس کی عقل بہت پرانی اور پختہ ہے اور جو نئے نئے حیلے اور ہتھکنڈے تجویز کرتا رہتا ہے یہی ہمارا دشمن تھا جس نے تاتاری فتنہ ہم پر چھوڑا لیکن اس سے پوچھو کہ تاتاریوں کی جلائی ہوئی آگ کس کا گلزار بنی اور اس کے شعلے پھول بن کر کس کی زینتِ دستار ہوئے؟ ہماری فطرت میں حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت موجود ہے۔ خدا سے ہماری نسبت بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی تھی کیونکہ ہم انہی کی ملت ہیں لہذا جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ گلزار بن گئی تھی اسی طرح ہم ہر آگ سے پھول پیدا کر لیتے ہیں اور ہر نمرود کی آگ کو گلزار بنا لیتے ہیں:

آسمان باما سرِ پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
بندہا از پاکشود آن فتنہ را
برسرِ ما آزمود آن فتنہ را
فتنۂ پامال راہش محشرے
کشتۂ تیغِ نگاہے محشرے
خفتہ صد آشوب در آغوشِ او
صبح امروزے نزاید دوشِ او
سطوت مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید

تو مگر از چرخِ کج رفتار پُرس
زاں نو آئین کہن پندار پُرس
آتش تاتاریاں گلزارِ کیست ؟
شعلہ ہاے او گُلِ دستارِ کیست ؟
زانکہ مارا فطرت ابراہیمی است
ہم بہ مولی نسبت ابراہیمی است
از تہ آتش براندازیم گل
نارِ ہر نمرود را سازیم گل

(ص ۱۲۰ اکلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان تیرا ضمیر روشن ہے تو اُمتِ موسیٰؑ یعنی یہودیوں کے انجام سے عبرت حاصل کر۔ اس قوم نے مرکز کھو دیا۔ اور اس کی جمعیت بھی جاتی رہی۔ قوم یہود نے انبیاءؑ کی آغوش میں نشو و نما پائی۔ اس میں ایسے بھی لوگ ہوئے جو تمام بھیدوں سے واقف تھے لیکن جب مرکز اس قوم کے ہاتھ سے نکلا اس کی جمعیت ختم ہوئی تو زمانے نے اس کی کنپٹی پر تھپڑ رسید کیا۔ اس کی زندگی خون ہو کر رہ گئی اور آنسو بن کر آنکھ سے ٹپک گئی۔ یعنی انبیاء کی آغوش میں نشو و نما پانے کا معاملہ زیادہ تفصیل کا محتاج نہیں۔ مدتِ دراز تک حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ یہودیوں کے ہادی ور ہنما رہے پھر ہر دور میں اور ہر عہد میں قومِ یہود کی ہدایت کے لئے نبی مبعوث ہوئے جیسا کہ بائیبل سے واضح ہے۔ بہر حال وہ قوم انگور کی بیل تھی اس کے رگ و ریشے سے نمی زائل ہو گئی اب یہ کیفیت ہے کہ اس کی خاک سے بید کا درخت بھی پیدا نہیں ہوتا یعنی ایک دور وہ تھا کہ اس میں انگور جیسا قیمتی اور لذیذ پھل لگتا تھا۔ اب وہ درخت بھی نہیں اگتا جس میں کوئی پھل لگتا تھا گویا نمو کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی۔ وہ قوم بے وطنی کی حالت میں جابجا بکھر گئی اور جگہ جگہ جا بیٹھی۔ اس کی زبان بھی ختم ہو گئی۔ اس میں قومی دم خم بھی باقی نہ رہا اور اس کا وطن بھی نابود ہو گیا۔ شمع بجھ گئی۔ پروانہ اس کا ماتم کر رہا ہے جب میں اس کی سر گذشت پر غور کرتا ہوں تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہودیوں کو یہ تمام مصیبتیں اس لئے پیش آئیں کہ ان کا قومی مرکز نہ رہا جو جمعیت اور وحدت کا ذریعہ تھا۔

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر
از مآل امتِ موسیٰ بگیر
داد چون آن قوم مرکز را ز دست
رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

آنکہ بالید اندر آغوش رسل
جزو او دانندۂ اسرارِ کل
دہر سیلی بر بناگوشش کشید
زندگی خون گشت و از چشمش چکید
رفت نم از ریشہ ہائے تاکِ او
بیدِ مجنون ہم نروید خاکِ او
از گل غربت زبان گم کردۂ
ہم نوا ہم آشیاں گم کردۂ
شمع مُرد و نوحہ خواں پروانہ اش
مشتِ خاکم سرزد از افسانہ اش
(ص ۱۳۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جب طارق بن زیاد نے اُندلس کے ساحل پر اُتر کر اپنی کشتیوں کو جلادیا تو اس کے ساتھیوں نے کہا کہ تیرا یہ فعل اقتضائے عقل کے خلاف ہے۔ ہم اپنے وطن سے دور ہیں اگر ہمیں واپسی اختیار کرنی پڑی تو اس کی کیا صورت ہو گی اور پھر ہماری شریعت نے بھی ترکِ اسباب کا حکم نہیں دیا۔ طارق بن زیاد نے جب یہ بات سُنی۔ تو ہنسا اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ہر ملک ہماری ملکیت ہے کیونکہ یہ ہمارے خدا کی ملکیت ہے۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چون رسیم؟
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بُرد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست
(ص ۲۹۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

طارق بن زیاد بن عبداللہ مشہور مراقشی (بربری) قائد تھا جس نے موسیٰ بن نصیر سپہ سالار مغرب کے زیرِ ہدایت سات ہزار مجاہدوں کو لے کر رجب ۹۲ھ اپریل ۷۱۱ء میں اندلس کے ساحل پر قدم رکھا اور دو سال کے قلیل عرصے میں اُسے فتح کر لیا۔ طارق نے جس تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر یہ غیر فانی جملہ اپنی زبان سے ادا کیا تھا۔ اندلس کی فتح کے بعد اُس کے

لوہے کو پگھلایا اور فولاد کی کثیر مقدار میں ملا کر اس مرکب سے بہت سی تلواریں بنائیں اور مراقش سے لے کر ہندوستان تک ہر ملک میں ایک ایک تلوار مسلمانوں کے اسلحہ خانہ میں رکھ دی کہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔ جو تلوار ہندوستان بھیجی گئی تھی وہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان کے قبضے میں آئی لیکن ۱۷۹۹ء میں سلطان کی شہادت کے بعد وہ شمشیر آب دار مسلمانوں کی غفلت کے باعث میدانِ جنگ میں گم ہو گئی۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ہم محمد مصطفیؐ کی حکمت کے نتیجے میں تقدیر کے اسرار سے آگاہ ہوئے۔ ہماری اصل مٹی تھی جسے آپؐ کی نگاہ کے فیض سے دنیا کی حکمرانی میسر آئی لیکن افسوس حکومت کے نشے نے مسلمانوں کے سینوں کو عشقِ رسولؐ سے خالی کر دیا اور ہماری یہ تقصیر جتنی بڑی تھی اتنی ہی بڑی ذلت ہمارے حصے میں آئی۔ خدا نے ہماری فطرت ایسی بنائی ہے کہ ہمیں ملول کر دینے والی بادِ صبا یعنی عیش و عشرت کی بجائے بادِ صحرا یعنی جدوجہد کی زندگی زیادہ راس ہے۔ افسوس ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہماری آواز گنبدِ افلاک سے بھی اوپر جاتی تھی لیکن جب ہم دنیائے عیش و عشرت میں مقید ہوئے تو ہماری وہی آواز آہ و فریاد میں تبدیل ہو گئی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ شکار بغیر دام کے ہمارے ہاتھ آ گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ تیر و کمان بغل میں لئے ہم خود نخچیر کا شکار ہو گئے۔ اے مصطفیٰ کمال پاشا! تجھے جس طرف موقع ملے اپنا گھوڑا دوڑا اور اپنی تدبیر کو بالائے طاق رکھ کر تقدیر کی کارفرمائی کا تماشا دیکھ کیونکہ بارہا ایسا ہوا کہ ہم اپنی بہترین تدبیروں کے باوجود اس جنگ میں ناکام ہوئے:

اُمتے بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او
واقف از سرِ نہانخانۂ تقدیر شُدیم
اصلِ مایک شرر باختہ رنگے بودست
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شُدیم
نکتۂ عشق فروشت زدل پیرِ حرم
درجہاں خوار باندازۂ تقصیر شُدیم
بادِ صحراست کہ بافطرتِ مادرسازد
از نفسہاے صبا غنچۂ دلگیر شُدیم
آہ آن غلغلہ کو گنبدِ افلاک گذشت
نالہ گردید چو پابندِ بم و زیر شُدیم
اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
در بغل تیروکماں کشتۂ نخچیر شُدیم

ہر کجا راہ دہد اسپ براں تاز کہ ما
بارہامات دریں عرصہ بتدبیر شُدیم
(ص ۳۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

مصطفیٰ کمال پاشا ۱۸۸۰ء میں بمقام سالونیکا (یورپین ترکی) میں پیدا ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں ملٹری کالج کا کورس ختم کرنے کے بعد فوج میں کیپٹن کے عہدے سے زندگی شروع کی۔ ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ میں حصہ لیا لیکن ۱۹۲۱ء میں اسے اپنی فوجی مہارت اور جنگی قابلیت دکھانے کا صحیح موقع ملا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء میں ناکامی کے بعد یونانیوں نے اناطولیا پر قبضہ کرنے کی نیت سے اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن یعنی انگریزوں کی درپردہ تائید کے بل بوتے پر اپنی فوجیں ساحل اناطولیہ پر اتار دیں اور اندرون ملک پر قبضہ کرتے ہوئے بروصہ تک چلے گئے۔ یہ حالات تھے جب مصطفیٰ کمال نے جولائی ۱۹۲۲ء میں بظاہر یونانیوں لیکن حقیقتاً انگریزوں کے خلاف جارحانہ اقدام شروع کیا اور تمام دنیائے اسلام مصطفیٰ کمال زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب علامہ مرحوم نے یہ نظم سپردِ قلم کی لہذا جب تک اس زمانے یعنی جولائی تا ستمبر ۱۹۲۲ء کے واقعات کو مدِ نظر نہ رکھا جائے۔ اس نظم کے آخری دو شعر سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جولائی ۱۹۲۱ء میں سقاریہ کی جنگ میں ترکوں نے اپنی پانصد سالہ حربی روایات کو زندہ کر دیا اور ۷ ادن تک بے سروسامانی کے باوجود محض اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر یونانیوں کا مقالہ کیا اور انجامِکار انہیں پسپا کر دیا۔ اس کے بعد سردی کا زمانہ شروع ہو گیا اور مصطفیٰ کمال کو پورے آٹھ ماہ اس طاقت کو مجتمع کرنے کے لئے مل گئے۔ چنانچہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کر کے مصطفیٰ کمال پاشا نے ۲۶ جولائی ۱۹۲۲ء کو مدافعانہ جنگ کی بجائے پہلی مرتبہ جارحانہ پیش قدمی شروع کر دی اس نازک موقع پر علامہ اقبال نے مصطفیٰ کمال کو یہ پیغام دیا:

اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم
در بغل تیرو کماں کشتۂ نخچیر شدیم
ہر کجا راہ دہد اسپ براں تاز کہ ما
بارہامات دریں عرصہ بتدبیر شدیم

قصہ مختصر ستمبر ۱۹۲۲ء کے پہلے ہفتے میں ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا۔ چونکہ اس شہر کو فتح کرنے کا مطلب یہ تھا کہ یونانیوں کو ایشیاے کوچک سے خارج کر دیا گیا اس لئے تمام دنیائے اسلام نے فتح کی خوشی میں چراغاں کیا۔ اور مسلمانوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کو اپنا ہیرو تسلیم کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اس کے نام کے ساتھ اَیَّدَہُ اللہ کی ایمان افروز ترکیب کا اضافہ کیا۔ لیکن جب اُس نے ۱۹۳۸ء میں یہ جگر خراش اعلان کیا کہ جمہوریہ ترکیہ کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس اعلان کے بعد اُس

نے قرآن مجید کی بجائے 'سوئس کوڈ' کو جمہوریہ کا دستور قرار دیا تو ساری دنیا کی طرح حضرت علامہ کی عقیدت بھی زائل ہو گئی۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں تجھے مذہب کے اسرار و رموز میں سے ایک راز بتاتا ہوں یعنی تقویٰ کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں اور اس کی وضاحت کے لئے سلطان مظفر گجراتی کی کہانی سناتا ہوں جو اپنے سچے عمل میں بے مثال تھا۔ اور بایزید جیسے مقام و مرتبے کا حامل بادشاہ تھا۔ اُس کے پاس ایک گھوڑا تھا جسے وہ اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اس گھوڑے کی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنے مالک کی طرح معرکۂ جنگ و جدل میں بے شمار سختیاں برداشت کرتا تھا۔ عربی شرفاء کی مانند گندمی رنگت رکھتا تھا اور باوفا، بے عیب اور اچھے نسب کا حامل تھا۔ یوں بھی ایک مومن کو قرآن تلوار اور گھوڑے سے زیادہ کون سی چیز عزیز ہو سکتی ہے۔ میں اس اصیل و نجیب گھوڑے کی کیا تعریف کروں کہ وہ پہاڑوں اور دریاؤں کو ہوا کی سی تیزی سے عبور کرتا تھا۔ دورانِ جنگ نگاہ سے بھی زیادہ سُرعت سے حملہ آور ہونے کے لئے تیار رہتا تھا اور پہاڑ اس کی طاقت سے خائف ہو کر طوفان کی مانند اُڑنے لگتے تھے اس کی دوڑ قیامت کے فتنوں کو اپنے پہلو میں سمیٹے ہوتی تھی اور وہ پتھروں کو اپنے سموں کی ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیتا تھا۔

ایک دن اُس انسان جیسے بلند مرتبہ حیوان کو پیٹ کے درد نے بے حال کر دیا۔ حیوانات کے ڈاکٹر نے اسے علاج کی غرض سے شراب پلا دی۔ گھوڑا تو تندرست ہو گیا لیکن بادشاہ پھر اُس پر کبھی سوار نہ ہوا کیونکہ وہ تقویٰ کی روش پر سختی سے کاربند تھا اور یہ روش ہمارے طرز زندگی سے یکسر مختلف ہے۔ لہٰذا اے مخاطب! اگر خدا تجھے قلب و جگر عطا کرے تو تو اس مسلمان مرد کی اطاعت گزاری دیکھ :

سرے از اسرارِ دیں برگویمت
داستانے از مظفر گویمت
اندر اخلاصِ عمل فرد فرید
پادشاہے بامقامِ بایزید
پیشِ او اسپے چو فرزندان عزیز
سخت کش چون صاحبِ خود درستیز
سبز رنگے از نجیبان عرب
باوفا، بے عیب، پاک اندر نسب
مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس
چیست جز قرآن و شمشیر و فرس
من چہ گویم وصف آن خیرالجیاد

کوہ و روے آبہا رفتے چوباد
روز ہیجا از نظر آمادہ تر
تند بادے طائف کوہ و کمر
در تگِ او فتنہ ہاے رستخیر
سنگ از ضربِ سم او ریز ریز
روزے آن حیواں چو انساں ارجمند
گشت از دردِ شکم زار و نژند
کرد بیطارے علاجش از شراب
اسبِ شہ را وارھاند از پیچ و تاب
شاہِ حق بین دیگر آں یکراں نخواست
شرعِ تقویٰ از طریقِ ما جداست
اے ترا بخشد خدا قلب و جگر
طاعتِ مردِ مُسلمانے نگر

(ص ۷۹۲، ۷۹۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! میں تجھے زمانۂ عرب کا حال سناتا ہوں تاکہ تو اس کے اُتار چڑھاؤ سے آگاہ ہو سکے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب تک اہلِ عرب نے لاالہ کو مدارِ زندگی نہیں بنایا وہ بدترین غلامی میں گرفتار رہے لیکن جیسے ہی انہوں نے اس کلمے کے اقتضاپر عمل کیا لات و منات یعنی تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا اور اگرچہ وہ دنیا میں رہے لیکن علائق دنیوی سے آزاد ہو گئے۔ انہوں نے اسی کلمے کی بدولت قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے۔ صحراؤں اور سمندروں میں اپنی یلغاروں سے ہنگامہ برپا کر دیا اور ایک عالم کو اس کی آگ میں تنکے کی طرح جلا کر رکھ دیا۔ اسی کی بدولت انہوں نے نئی دنیا پیدا کی۔ آج دنیا میں علوم و فنون کی جس قدر گرم بازاری ہے اس کی داغ بیل عربوں نے ہی ڈالی۔ جب عربوں نے غیر اللہ کا تصور اپنے دل سے نکال دیا یعنی جب یہ عقیدہ ان کے دل میں راسخ ہو گیا کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی یا قوم ہم پر حکمران نہیں ہو سکتی تو اُن کے بدنِ خاکی سے سینکڑوں ہنگامے پھوٹ نکلے :

باتومی گویم ز ایّامِ عرب
تا بدانی پختہ و خامِ عرب
ریز ریز از ضربِ او لات و منات

در جہات آزاد از بندِ جہات
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او
گاہ دشت از برق و بارانش بدرد
گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد
عالمے در آتشِ او مثلِ خس
این ہمہ ہنگامۂ لا بود و بس
اندرین دیر کہن پیہم تپید
تاجہانے تازۂ آمد پدید
بانگ حق از صبح خیزیہائے اوست
ہرچہ ہست از تخم ریزیہائے اوست
اینکہ شمع لالہ روشن کردہ اند
از کنارِ جوئے او آوردہ اند
لوحِ دل از نقشِ غیراللہ شُست
از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رُست

(ص ۸۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح تو جانتا ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں روس میں عوام اور حکمرانوں کے درمیان جنگ واقع ہوئی۔ روسی عوام ملوکیت کے ظلم و ستم سے تنگ آگئے تو انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ہم پر کوئی حکمران نہیں ہے چنانچہ انہوں نے زارِ روس کا خاتمہ کر دیا اور اشتراکی نظام نافذ کیا۔ میں نے اُن کے اس نئے نظام کا مطالعہ کیا جس کی بنیادی تعلیمات میں ملوکیت، کلیسا اور خدا تینوں سے انکار کیا گیا گویا اس قوم کا تفکر ''لا'' کی منزل سے آگے نکل کر ''الا'' کی جانب گامزن نہ ہوا۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب روسی قوم لاالہ کی منزل سے نکل کر الا اللہ کی منزل تک پہنچ جائے گی کیونکہ محض لاالہ سے زندگی آسودہ نہیں ہوتی بلکہ کائنات کا نظام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اُس کا خالق مادہ نہیں خُدا ہے:

ہمچنان بینی کہ در دورِ فرنگ
بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں

از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

آن نظام کہنہ را برہم زدست

تیز نیشے بر رگِ عالم زدست

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ

لا سلاطین، لاکلیسا، لاالہ

فکرِ او در تندبادِ لا بماند

مرکب خود را سوے الا نراند

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں

خویش را زیں تند باد آرد بروں

درمقام لانیاساید حیات

سوے الا می خرامد کائنات

(ص ۸۱۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مسلمان ایک دوسرے سے جنگ وجدل میں مصروف ہیں اور مذہبی معاملات میں ایک دوسرے سے اختلاف کے سواان کا کوئی کام نہیں لیکن جس مسجد میں وہ خود نہیں جاتے اگر کوئی شخص اس کی ایک اینٹ بھی نکال لے یعنی اس کے انہدام کا ارادہ کرے تو وہ ایک ہنگامہ برپا کر دیتے ہیں :

مسلماناں بخویشاں درستیز اند

بجز نقشِ دوئی بردل نریزند

بنالند ار کسے خشتے بگیرد

ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزند

(ص ۹۲۱ کلیات اقبال فارسی)

یہاں علامہ اقبال نے مسجد شہید گنج (جسے عبداللہ بیگ نے ۱۷۲۰ء میں تعمیر کرایا تھا) کے انہدام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس مسجد کو پنجاب کے سکھوں نے حکومت برطانیہ کے نمائندے یعنی گورنر پنجاب کی تائید اور حمایت سے برطانوی سنگینوں کے زیرسایہ ۱۸ جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید کیا تھا اور مسلمانوں نے اس کی شہادت پر ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ لیکن اس کی شہادت سے قبل نماز کی ادائیگی کے لئے اس کی طرف رُخ کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔



۳۔ فطرت کا مطالعہ اور اس کے مظاہر کا بیان

علامہ اقبال کی شاعری میں وصف فطرت موجود ہے لیکن اس میں اقبال کا عمقِ بیان اور مقصدیت سبکِ خراسانی کی حدود سے ماوراء ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ علامہ اقبال کی فطرت نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> ''ان کی تصانیف میں خاصہ حصہ ایسے اشعار کا ہے جن میں فطرت نگاری کی گئی ہے مگر اس کا مقصود فطرت نگاری نہیں بلکہ وہ فطرت کی اس تصویر کو کسی دوسرے موضوع کی تمہید یا پس منظر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔''(۲۴)

مثلاً رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ بہار کے موسم میں بلبل کا جوش و خروش اور باغ میں کلیوں اور پھولوں کی بے پناہ کثرت دیدنی ہوتی ہے۔ کلیاں دلہنوں کی طرح یوں آراستہ ہوتی ہیں جیسے زمین سے ستاروں کی پوری بستی نکل آئی ہو۔ شبنم سبزے کا منہ دھوتی ہے اور نہر کا پانی اُسے لوریاں دے کر سلاتا ہے۔ شاخ سے پھوٹ کر نکلنے والے غنچے کو نسیم اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور پھول چُننے والے کے ہاتھ لگنے والا غنچہ خوشبو کی مانند باغ سے کوچ کر جاتا ہے۔ قمری گھونسلا بناتی ہے تو بلبل اُڑ جاتی ہے۔ شبنم کا قطرہ آتا ہے تو خوشبو رخصت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہزاروں گل لالہ پیدا ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے چمن کی رونق بنتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں لیکن بہار کی رونق نہیں گھٹتی۔ نقصان کے باوجود اس کے خزانے میں بہتات کا وہی عالم رہتا ہے اور ہنسنے والے پھولوں کی محفل بدستور سجی رہتی ہے۔ سیوتی، گلاب اور چنبیلی کے پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں لیکن بہار کا موسم ان سب سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے اور باقی رہتا ہے :

در بہاراں جوش بلبل دیدۂ
رستخیز غنچہ و گل دیدۂ
چون عروساں غنچہ ھا آراستہ
از زمیں یک شہرِ انجم خاستہ
سبزہ از اشکِ سحر شوئیدہ
از سرودِ آب جو خوابیدہ
غنچۂ بر می دمد از شاخسار
گیردش بادِ نسیم اندر کنار
غنچۂ از دستِ گلچین خوں شود

از چمن مانندِ بو بیرون رود
بست قمری آشیاں، بلبل پرید
قطرۂ شبنم رسید و بو رمید
رُخصت صد لالۂ ناپائیدار
کم نسازد رونقِ فصلِ بہار
از زیاں گنجِ فراوانش ہمان
محفل گل ھاے خندانش ہمان
فصلِ گُل از نسترن باقی تراست
از گل و سرو و سمن باقی تراست
(ص ۱۱۷، ۱۱۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب تو کشمیر میں قیام کر اور وہاں کے پہاڑ ٹیلے اور گھروں کا نظارہ کر۔ تو دیکھ کہ ہر جگہ سبزہ اُگا ہوا ہے اور ہر باغ میں لالے کے بے شمار پھول کھلے ہوئے ہیں۔ بہار کی ہوا موجوں کی شکل میں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی ہے۔ بہار کے پرندے کثرت سے دکھائی دے رہے ہیں اور صلصل اور سار جیسے سُریلی آواز والے پرندے جوڑوں کی شکل میں انار کے درختوں پر بیٹھے ہیں۔ تو دیکھ کہ زمین کے چہرے نے نسترن کے پھولوں کا برقع اوڑھ رکھا ہے تاکہ اس کی زیب و زینت پر فتنہ اٹھانے والے آسمان کی نگاہ نہ پڑے۔ لالہ کا پھول زمین سے پھوٹ نکلا ہے اور ندی میں موج تڑپ رہی ہے۔ لالے کی کثرت کی وجہ سے زمین گویا شرارے اُگل رہی ہے اور موجوں کی کثرت کی بنا پر پانی پر گویا شکنیں پڑی ہیں۔ مضراب سے ساز کے تاروں کو چھیڑ اور جام میں شراب ڈال کیونکہ محفل بہار کے قافلے اُتر رہے ہیں۔ پہلے لالہ جیسے سُرخ رخسار اور چنبیلی جیسے سفید بدن والی برہمن لڑکی کو دیکھ پھر اپنے آپ کو دیکھ :

رخت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببین لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج برسرِ نارون نگر
تانہ فتد بہ زینتش چشمِ سپہر فتنہ ساز
بستہ بچہرۂ زمیں برقع نسترن نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بآبجو تپید

خاکِ شرر شرر ببین آب شکن شکن نگر

زخمہ بہ تارِ ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز

قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

دختر کے برہمنے لالہ رُخے سمن برے

چشم بروے او کشا باز بخویشتن نگر

(ص ۳۰۳، کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے نوجوان اٹھ کر دیکھ کہ موسمِ بہار کے بادلوں نے جنگلوں، میدانوں اور پہاڑوں میں اپنے خیمے نصب کر دیئے ہیں۔ طوطی بلبل اور تیتر و سار جیسے مغنی پرندوں نے موسمِ بہار کی آمد پر اپنی نغمہ ریزیوں سے جشنِ بہار کا سماں پیدا کر دیا ہے۔ نہر کے کنارے گل و لالہ کے بے شمار خوش رنگ پھول کھلے ہیں۔ اے غافل حسُن فطرت کو دیکھنے والی آنکھ پیدا کر اور دیکھ کہ کوہ و دشت میں کس طرح حسُنِ فطرت بکھرا پڑا ہے۔

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

مست ترنم ہزار

طوطی و دراج سار

بر طرفِ جوئبار

کشتِ گل و لالہ زار

چشمِ تماشا بیار

خیز کہ درکوہ ودشت خیمہ زد ابر بہار

اٹھ اور دیکھ کہ باغ اور سبزہ زار میں بے شمار پھول کھل اٹھے ہیں۔ موسم بہار کی معطر خوشبودار ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ خوش الحان پرندوں نے فضاؤں میں اپنی موسیقی کا رس گھول دیا ہے۔ گل لالہ نے جوش جنوں میں اپنا گریباں تار تار کر دیا ہے حسُن فطرت نے تازہ گل کھلائے ہیں اور مُرغانِ چمن کے عشقیہ جذبات میں ہیجان برپا ہو گیا ہے :

خیز کہ درباغ و راغ قافلۂ گُل رسید

بادِ بہاران وزید

مرغ نوا آفرید

لالہ گریبان درید

حسن گل تازہ چید

عشق غمِ نو خرید

خیز کہ درباغ و راغ قافلۂ گل رسید

بلبلیں محوِ ترنم ہیں قمریوں نے اپنے پر جوش نغموں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔ چمن کا خون گرم ہے یعنی پھولوں پر بھی جوبن ہے اور پرندے بھی جوش بہار سے مسلسل چہچہا رہے ہیں ایسے دلفریب موسم میں تو کیوں خاموش بیٹھا ہے عقل و ہوش کے آئین کو توڑ ڈال اور شرابِ معرفت و حقیقت پی۔ جوشِ بہار میں گیت گا اور پھولوں کا رنگین لباس زیب تن کر۔

بلبلگاں در صفیر، صلصلگاں در خروش

خونِ چمن گرم جوش

اے کہ نشینی خموش

در شکن آئین ہوش

بادۂ معنی بنوش

نغمہ سرا گل بپوش

بلبلگاں در صفیر، صلصلگاں در خروش

تنہائی میں بیٹھنا چھوڑ اور صحرا میں قیام کر۔ نہر کے کنارے بیٹھ کر آبِ رواں کا نظارہ کر اور دیکھ کہ نرگسِ دلنواز جو موسم بہار کی جان ہے جھک کر اس کی پیشانی کو چوم رہی ہے۔

حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزین

برلبِ جوے نشین

آب رواں را ببین

نرگس ناز آفرین

لختِ دل فرودیں

بوسہ زنش بر جبین

حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزین

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تو اپنے ماحول سے بیگانہ ہے۔ ظاہری آنکھوں کے علاوہ دل کی آنکھیں بھی کھول تاکہ تو فطرت کی جلوہ گری سے لطف اندوز ہو سکے۔ دیکھ تو سہی لالے کے پھول کس کثرت سے کھلے ہوئے ہیں اور سب سُرخ رنگ کی صدری پہنے ہوئے ہیں اور اُن پر شبنم ٹپک رہا ہے جو دراصل اشکِ سحر ہے۔ گلِ لالہ کی سُرخ پتیوں پر شبنم کے قطرے ایسے چمک رہے ہیں جیسے شفق میں ستارے۔

دیدۂ معنی کشا اے زعیاں بے خبر

لالہ کمر در کمر

یمۂ آتش بہ بر

می چکدش بر جگر

شبنم اشکِ سحر

در شفق انجم نگر

دیدۂ معنی کشا اے زعیاں بے خبر

باغ کی مٹی نے رنگا رنگ پھول اُگا کر کائنات کے باطن یعنی اس کے پوشیدہ حسُن کو آشکار کر دیا ہے۔ اے مخاطب تجلیات الہی کا یہ مسلسل ظہو اور استتار سب ذاتِ حق کی جلوی گری ہے اور اسی کا دوسرا نام حیات و ممات ہے و گرنہ جسے انسان اپنی نادانی کی بنا پر حیات و ممات سمجھتا ہے اس کو بھی کوئی ثبات نہیں۔

خاکِ چمن وانمود رازِ دل کائنات

بود و بنودِ صفات

جلوہ گریہاے ذات

آنچہ تو دانی حیات

آنچہ تو خوانی ممات

ہیچ ندارد ثبات

خاک چمن وانمود راز دل کائنات

(ص ۲۶۱ تا ۲۶۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ موسم سرما اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے اور موسمِ بہار کی آمد سے درختوں کی شاخوں میں پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی ہے۔ ندی کی جانب سے آنے والی ہوائیں پھولوں کو رنگ اور نمی عطا کر رہی ہیں۔ اور بہار کی ہوا دشت و صحرا میں لالے کے پھول کھلا رہی ہیں:

زمستاں را سرآمد روزگاراں

نواھا زندہ شد در شاخساراں

گلاں را رنگ و نم بخشد ہواہا

کہ می آید زطرف جویباراں

چراغ لالہ اندر دشت و صحرا
شود روشن تر از باد بہاراں
(ص ۴۳۰ کلیات اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو وادی کشمیر کے پہاڑوں کی برفیلی چوٹیاں دیکھ اور ان کے چناروں کی آگ اُگلتی ٹہنیوں کا نظارہ کر۔ اس کے حسنِ بے مثال کا کیا کہنا کہ بہار کے موسم میں اس کے پتھروں سے موتیوں جیسے جھرنے بہتے ہیں۔ اور اس کی مٹی سے رنگارنگ پھولوں کا ایک طوفان اٹھتا ہے اس کے پہاڑوں اور وادیوں میں بادلوں کے ٹکڑے روئی دھننے والے کی کمان سے نکلے روئی کے گالے محسوس ہوتے ہیں اور اس کے پہاڑ، دریا اور ڈھلتے سورج کے مناظر مجھے خدا کے جلووں کی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کوہ ھاے خنگ سارِ او نگر
آتشِ دستِ چنار او نگر
در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ
خیزد از خاکش یکی طوفانِ رنگ
سکہ ہاے ابر در کوہ و دمن
پنبہ پراں از کمان پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدا را دیدم آنجا بے حجاب
(ص ۷۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ جس محل میں نادر، ابدالی اور سلطان شہید جلوہ افروز ہیں اس کے در و دیوار فیروزے کے ہیں اور یہ نیلے آسمان کو بھی اپنی بغل میں لئے ہوئے ہے یعنی انتہائی بلندی کا حامل ہے۔ یہ محل دیگر اشیاء سے اس قدر اونچا ہے کہ اس کی رفعت انسانی تفکر کو بھی مات کر رہی ہے۔ یہاں کھلے گلاب اور چنبیلی کے پھول، ان کی شاخیں اور ان کی لطافتیں بہار کی تصویر پیش کر رہی ہیں۔ ہر موسم میں گلاب کے پھول اور درختوں کی پتیاں ذوقِ نمو کے باعث ایک نیا ہی رنگ رکھتے ہیں۔ صبح کی ہوا ایسی جادوگری کرتی ہے کہ پلک جھپکتے ہی پیلا رنگ سُرخ رنگ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر طرف فوارے موتی برسا رہے ہیں اور جنت کے پرندے چہچہا رہے ہیں اس بلند محل کی بارگاہ کا ایک ایک ذرہ اپنی کمند میں آفتاب کا حامل ہے اور اس کی چھت، دیواریں، ستون اور میخیں عتیق اور فرش سنگِ یشم کا بنا ہوا ہے۔

قصرے از فیروزہ دیوار و درش

آسمانِ نیلگوں اندر برش

رفعت او برتر از چند و چگون

می کند اندیشہ را خوار و زبوں

آن گل و سروسمن آن شاخسار

آن لطافت مثلِ تصویرِ بہار

ہر زماں برگِ گل و برگِ شجر

دارد از ذوقِ نمو رنگ دگر

این قدر بادِ صبا افسون گراست

تامژہ برہم زنی زرد احمر است

ہر طرف فوارہ ھا گوہر فروش

مرغکِ فردوس زا اندر خروش

بارگاہے اندر آن کاخِ بلند

ذرۂ او آفتاب اندر کمند

سقف و دیوار و اساطین از عتیق

فرش او از یشم و پرچین از عتیق

(ص ۷۶۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کابل کا شہر جنت نما خطہ ہے یہاں کے انگوروں سے آبِ حیات حاصل کر اور رات کی تاریکی میں چنبیلی کے باغات کا نظارہ کر اور دیکھ کہ صبح کے وقت سبزے پر پڑتی سورج کی کرنوں کے نتیجے میں سبزہ کیسے رنگ بدلتا ہے۔ یعنی سبزے کی بساط پر سحر کو لوٹ پوٹ ہوتا دیکھ۔ یہ دھرتی انتہائی خوبصورت اور پاک ہے اور اس کی ہوا شام اور روم کی ہوا سے بھی زیادہ خوشگوار ہے اس کا پانی اور مٹی تابناک ہے اور اس کی نرم و ملائم ہوا میں یہ تاثیر ہے کہ اس کی وجہ سے بے جان مٹی بھی زرخیز ہو جاتی ہے۔ اس کے اسرار کا تذکرہ زبان سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کے پہاڑوں میں آفتابِ سو رہے ہیں یعنی اس کے پہلو میں بے شمار خزانے چھپے ہوئے ہیں۔

شہرِ کابل خطۂ جنت نظیر

آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر

در ظلامِ شب سمن زارش نگر

بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر

آن دیارِ خوش سواد آن پاک بوم

بادِ او خوشتر زبادِ شام و روم

آبِ او براق و خاکش تابناک

زندہ از موجِ نسیمش مُردہ خاک

ناید اندر حرف و صوت اسرارِ او

آفتاباں خفتہ درکہسار او

(ص ۸۵۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ قندھار وہ جنت نما خطہ ہے جس کی خاک بھی اہلِ دل کے لئے خاکِ مُراد کا درجہ رکھتی ہے یہاں رنگ برنگے اور ہوا کو معطر کرتے پھولوں اور چاندی کی طرح چمکتے پانیوں کے بے شمار نظارے ہیں یہاں کے کوہساروں میں گلِ لالہ بکثرت اُگتا ہے اور یہاں کے انار یعنی ان کے دانے اس قدر سُرخ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے قدرت نے آگ کو یخ بستہ کر دیا ہے۔

قندھار آن کشورِ مینو سواد

اہلِ دل را خاکِ او خاکِ مُراد

رنگ ہا، بوھا، ہواہا، آب ہا

آب ہا تابندہ چون سیماب ہا

لالہ ہا در خلوتِ کہسارہا

نارہا یخ بستہ اندر نارہا

(ص ۸۷۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ موسمِ بہار میں جنگلوں میں گلِ لالہ اُگے ہوئے ہیں اور احباب سیر و تفریح کے لئے آئے ہوئے ہیں لیکن میں کسی کی یاد میں اس قدر مضطرب ہوں کہ مجھے صحبتِ احباب میں کوئی لطف نہیں آتا بلکہ میں تو کسی پہاڑی ندی کے کنارے تنہا بیٹھا کسی کی یاد میں محو رہنا چاہتا ہوں۔

بہ راغاں لالہ رُست از نو بہاراں

بصحرا خیمہ گستردند یاراں

مرا تنہا نشستن خوشتر آید

کنارِ آبجوے کوہساراں

(ص ۹۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

لیکن ان تمام مثالوں سے ہٹ کر ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول :

"اشیائے فطرت سے اقبال کو جو دلچسپی اور دلبستگی تھی اس کا اظہار اُن سینکڑوں اور ہزاروں تشبیہوں اور استعاروں سے بھی ہوتا ہے جن میں کائنات کی حسین و جمیل اشیاء سے شاعر نے مشابہتیں اور مماثلتیں حاصل کی ہیں۔"(۲۵)

بلکہ بقول ڈاکٹر عبدالمغنی :

اقبال کے شاعرانہ وسائل کا سب سے بڑا اسلحہ خانہ مظاہر فطرت ہیں۔ طیور، اشجار، کوہسار، آب رواں اور گل ہائے رنگ رنگ کا ایک پورا نظام ہے جس کے استعارے قدم قدم پر معنی آفرین ہیں۔ فطرت کے نظاروں اور صداؤں کی یہ جنت نگاہ اور فردوسِ گوش ہر لحہ دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔ اقبال کے کلام میں فکر کی دماغ سوز دقیقہ سنجیوں کے باوجود فن کی جو اتنی روح پرور تازگی اور رعنائی پائی جاتی ہے وہ بیشتر نقوش فطرت ہی کی شوخی اور طراوت کا فیض ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر کا تخیل قدرت کی بو قلمونیوں میں جذب ہو گیا ہے۔ اس کا اندیشہ فضائی حسُن کے جلوؤں اور آوازوں سے لبریز ہے۔ شاید اسی لئے اقبال "معنیٔ رنگین" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کے اشعار میں قوسِ قزح کے سات رنگ برابر جھلملاتے رہتے ہیں۔ اس یک چمن شادابی کے چند نمونے ملاحظہ ہوں :

بشاخِ زندگیء مانمے زتشنہ لبی است
تلاشِ چشمۂ حیواں دلیل کم طلبی است
(پیامِ مشرق)

چو موج سازِ وجودم زسیل بے پرواست
گمان مبرکہ دریں بحر ساحلے جویم
(پیامِ مشرق)

لالۂ این گلستان داغ تمنائے نداشت

نرگسِ طنازِ او چشم تماشائے نداشت

(زبورِ عجم)

صبح و ستاره و شفق و ماه و آفتاب

بے پرده جلوه ها بنگاہے توان خرید

(زبورِ عجم)(۲۶)

☆☆☆

۴۔ مشاہدے اور تجربے پر مبنی شاعری

علامہ اقبال نہ صرف اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ فن دراصل کسی مخصوص ماحول میں فنکار کی اپنی شخصیت، تجربات اور مشاہدات کے اظہار کا نام ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہی فنی تخلیق مؤثر بھی ہوتی ہے جو دیکھنے، سننے اور پڑھنے والے کو اپنی زندگی سے قریب تر دکھائی دے۔ اسی لئے علامہ اقبال کا فکر نہ صرف زندگی سے قریب تر ہے بلکہ انہوں نے اس کی تفہیم کے لئے اپنے روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کا سہارا بھی لیا۔ مشاہدے اور تجربے پر مبنی شاعری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

آشنائے لذتِ گفتارِ شو

اے درائے کارواں بیدار شو

(ص ۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مردِ مومن! تو کیوں خاموش ہے اپنی بات کہنے اور دوسروں تک اپنا پیغام پہنچانے میں بڑی لذت ہے۔ اس کا مزہ چکھ۔ تجھے قافلے میں جرس کی حیثیت حاصل ہے۔ تیرا منصب یہی ہے کہ خود جاگ اور دوسروں کو جگا۔

پرانے وقتوں میں قافلے کی روانگی سے قبل گھنٹہ بجا کر اس بات کا اعلان کیا جاتا تھا کہ وہ افراد جو سفر کا ارادہ رکھتے ہیں بیدار ہو کر شریکِ قافلہ ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے اپنے اسی مشاہدے کو بنیاد بنا کر مردِ مومن کو جرس قرار دیا ہے جس کی اپنی بیداری بھی انہیں مطلوب ہے اور اس بات کے بھی خواہاں ہیں کہ وہ دوسروں کو بیدار کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دے۔

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

تا بکے چون غنچہ می باشی خموش

نکہتِ خود را چو گل ارزاں فروش

(ص ۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے اقبال تو کب تک کلی کی طرح چپ بیٹھا رہے گا۔ اپنی خوشبو کو پھول کی طرح ہر طرف بکھیر دے۔

کلی جب تک کلی ہوتی ہے خوشبو سے محروم ہوتی ہے لیکن جونہی وہ کھل کر پھول بنتی ہے اس کی خوشبو چار سو پھیل جاتی ہے اور ساری فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اسی مشاہدے کو بنیاد بنا کر مولانا جلال الدین رومی کی زبانی اپنے آپ کو پھول بن جانے کی نصیحت کی ہے بالفاظ دگر اپنے افکار کو اپنی ذات تک محدود رکھنے اور فکر سے عاری قرار پانے کی نہیں انہیں دوسروں تک پہنچانے کی تلقین کی ہے :

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

کودکے را دیدی اے بالغ نظر

کو بود از معنیٔ خود بے خبر
ناشناس دور ونزدیک آنچنان
ماه را خواہد کہ برگیرد عناں
از ہمہ بیگانہ آن مامک پرست
گریہ مست و شیر مست و خواب مست
زیروبم را گوشِ او درگیر نیست
نغمہ اش جز شورش زنجیر نیست
سادہ و دوشیزہ افکارش ہنوز
چون گہر پاکیزہ افکارش ہنوز
جستجو سرمایۂ پندارِ او
از چرا چوں کے کجا گفتارِ او
نقش گیرِ این و آن اندیشہ اش
غیر جوئی، غیر بینی پیشہ اش
چشمش از دنبال اگر گیرد کسے
جانِ او آشفتہ می گردد بسے
(ص ۴۵ اکلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے بالغ نظر انسان! تو نے کبھی بچے کو دیکھا ہے جو اپنی حقیقت سے بے خبر ہو تا ہے۔ اسے نزدیکی اور دوری میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ چاندنی میں اسے لٹادیا جائے تو اس انداز سے ہاتھ پاؤں مار تا ہے گویا چاند کو پکڑ لینا چاہتا ہے۔ وہ ماں کے سوا کسی کو نہیں پہچانتا۔ یا تو رو تا ہے یا دودھ پیتا ہے یا سو رہتا ہے اس کے کان سروں کے اونچا اور نیچا ہونے سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ دروازے کی زنجیر ہلا کر شور پیدا کیا جائے تو بچہ اس کو نغمہ سمجھ لیتا ہے اس کے افکار بالکل سادہ اور اچھوتے ہوتے ہیں۔ اس کی باتوں میں موتی کی سی پاکیزگی ہوتی ہے پھر اُس کا شعور ترقی پاتا ہے تو اس کی سمجھ بوجھ کا سرمایہ یہ ہو تا ہے کہ ہر شے کی حقیقت معلوم کرے وہ پوچھتا رہے گا۔ یہ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کس طرح ہوئی؟ کہاں سے آئی؟ اس کی فکر کے ورق پر مختلف چیزوں کے نقش بنتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہر وقت اس شغل میں رہتا ہے کہ اپنے سوا جو کچھ ہے اُسے دیکھے اور اس کی حقیقت معلوم کرے اگر پیچھے سے کوئی اس کی آنکھیں بند کر دے تو وہ بیقرار ہو جاتا ہے۔

رموزِ بے خودی میں اسی موضوع پر آگے چل کر فرماتے ہیں:

فکر خامش در ہوائے روزگار
پر کشا مانندِ بازِ نوشکار
در پئے نخچیر ھا بگزاردش
باز سوے خویشتن می آردش

(ص ۱۴۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی بچے کی ناپختہ فکر زمانے کی ہوا میں اس طرح اُڑتی ہے جس طرح نیا نیا شکاری باز اُڑاتا ہے بچہ اس فکر کو شکار کے پیچھے چھوڑ دیتا ہے پھر واپس لے آتا ہے۔

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے بچے کی فطرت کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس کی وضاحت کے لیے بعد کے اشعار میں عام مشاہدے پر مبنی ایک حقیقت بیان کی ہے کہ جب باز کو شکار پر لگایا جاتا ہے تو اس کے پاؤں ایک ڈور سے باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ نو آموز شکاری جب چاہے اشارہ کر کے یا ڈور کھینچ کر اُسے واپس لے آئے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس طرح باز شکار کو شکاری کے پاس لانے کا عادی ہو جائے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

سحر می گفت بلبل باغبان را
دریں گل جز نہال غم نگیرد
بہ پیری می رسد خارِ بیاباں
ولے گل چون جوان گردد بمیرد

(ص ۱۹۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی صبح کے وقت ایک بلبل باغبان سے کہہ رہا تھا کہ دنیا کا کارخانہ بھی عجیب ہے یہاں کی مٹی کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں صرف رنج و غم کا پود نمو پاتا ہے یعنی انسان اس دنیا میں قدرتی طور پر حسین و جمیل اشیاء سے دل لگاتا ہے لیکن ان اشیاء کو ثبات و قرار نہیں ہے اس لئے جب یہ حسین و جمیل اشیاء چند روز اپنی بہار دکھا کر فنا ہو جاتی ہیں تو عاشق کفِ افسوس ملتارہ جاتا ہے جبکہ کانٹا حسن رکھتا ہے اور نہ دلکشی اور اس بنا پر کوئی شخص اسے حاصل کرنا بھی پسند نہیں کرتا لیکن وہ عرصۂ دراز تک شاخ پر لگا رہتا ہے یعنی بوڑھا ہو کر مرتا ہے لیکن پھول جس میں حسن پایا جاتا ہے اُدھر جوان ہوا اُدھر اُسے موت آئی یعنی صبح کو شگفتہ ہوا شام کو مرجھا گیا۔

علامہ اقبال نے اس مضمون کی بنیاد عام مشاہدے پر مبنی ایک حقیقت پر رکھی ہے کہ کانٹا تو عرصۂ دراز تک شاخ پر رہتا ہے لیکن پھول جلد ہی مرجھا جاتا ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

گذشتی تیز گام اے اخترِ صبح
مگر از خواب ما بیزار رفتی
من از نا آگہی گم کردہ راہم
تو بیدار آمدی بیدار رفتی

(ص ۲۰۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے صبح کے ستارے ! تو بہت تیزی سے گزر گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تو ہمیں کوئی پیغام دینے آیا تھا لیکن جب تو نے دیکھا کہ بیداری کا وقت ہے اور ہم لوگ سو رہے ہیں تو تو ہم سے بیزار ہو کر چل دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے (یعنی بنی آدم نے) اپنی غفلت کی وجہ سے اپنی راہ گم کر دی۔ میں سوتا رہا اسی لئے اپنا مقصدِ حیات حاصل نہ کر سکا اور تو چونکہ بیدار تھا اس لئے کامیاب ہو گیا۔

علامہ اقبال نے یہاں عام مشاہدے پر مبنی اس حقیقت سے کہ صبح کا ستارہ بہت جلدی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ایک خوبصورت نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ستارہ قوانین فطرت کا پابند ہے اور اپنا فرض منصبی ادا کر رہا ہے لیکن انسان نہ تو قوانینِ فطرت سے آگاہ ہے اور نہ ہی اپنے مقصدِ حیات کے حصول کے لئے کوشاں ہے اسی لئے ستارہ ہم سے بیزار ہے اور اس بیزاری کی وجہ سے وہ بہت تیزی سے ہماری نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتا ہے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

نوائے من ازاں پر سوز و بیباک و غم انگیز است
بخاشاکم شرار افتاد و بادِ صبحدم تیز است

(ص ۴۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میری آواز اس لئے سوزناک، بےباک اور غم انگیز ہے کہ میرے خس و خاشاک میں چنگاری آن گری ہے اور صبح کی ہوا تیز ہے جو اسے مزید بھڑکانے کا باعث بن رہی ہے۔ مراد یہ کہ میرے اندر آتشِ عشق روشن ہو چکی ہے اور اسے الاؤ میں تبدیل کرنے کے لئے حالات بھی کافی سازگار ہیں لہذا میں انتہائی بےباکی سے اپنے کلام کے ذریعے غمِ عشق کا اظہار کر رہا ہوں۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں عام مشاہدے میں آنے والی ایک حقیقت بیان کی ہے کہ خس و خاشاک میں آگ لگ جائے تو تیز ہوا اُسے بجھاتی نہیں بلکہ مزید بھڑکاتی ہے اور الاؤ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید

تپِ شعلہ کم نگردد زگستن شرارہ

(ص ۴۰۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں اس لئے غزل سرا ہوا کہ شاید میری آواز کو قرار آجائے لیکن شعلے کی تپش چنگاریوں کے پھیلنے سے کم نہیں ہوتی مراد یہ کہ میں نے اپنی شاعری کے ذریعے غمِ عشق کا اظہار کیا تاکہ اس کی شدت میں کچھ کمی واقع ہو جائے لیکن جس طرح شعلے کی تپش چنگاریوں کے پھیلنے سے کم نہیں ہوتی اسی طرح میرے غم میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

علامہ اقبال نے اس شعر میں عام مشاہدے پر مبنی ایک حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جب آگ دہک رہی ہوتی ہے تو اُس میں سے چنگاریاں نکل کر پھیل رہی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود آگ کی حدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش

گردِ خود گردندہ چون پرکار باش

(ص ۷۹۱ کلیاتِ اقبا ل فارسی)

یعنی اے مخاطب ! تجھے چاہئے کہ تو کم کھائے کم سوئے اور بے جا گفتگو سے پرہیز کرے اور پرکار کی طرح اپنے گرد گھومتا رہے یعنی اپنی خودی کی حفاظت کرے یہ ایک فطری عمل ہے کہ جس شخص کو کم خوری کی عادت ہو اُس کا زیادہ وقت بیداری میں گزرتا ہے۔ لیکن علامہ اقبال مردِ مسلمان کو صرف اسی بات کی تلقین نہیں کرتے بلکہ وہ اُسے کم گو ہونے کا بھی مشورہ دیتے ہیں کیونکہ اسی خوبی کی بدولت وہ زیادہ وقت اپنے دل و دماغ سے کام لینے میں صرف کرے گا۔ اپنے اردگرد پرکار کی طرح گھومے گا اپنی ذات کو مسخر کرے گا اور پھر اس کائنات کی تسخیر کی طرف قدم بڑھائے گا۔

علامہ اقبال نے اس شعر کے مضمون کی بنیاد اپنے ایک عام مشاہدے پر رکھی ہے اور وہ یہ کہ پُرکار سے جب کام لیا جاتا ہے تو وہ اپنے ہی اردگرد گھومتے ہوئے ایک دائرہ بناتا ہے لہذا وہ مسلمان کو بھی پرکار کی طرح اپنے اردگرد گھومنے کی تلقین کرتے ہوئے اپنی ذات میں ڈوبنے اور اس سے آشنا ہونے کا درس دیتے ہیں کیونکہ یہی آشنائی اُن کے کائنات پر غلبے اور آخر کار خدا سے آشنائی کا سبب بنے گی۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

رزق زاغ و کرگس اندر خاک و گور

رزق بازاں در سواد ماہ و ہور

(ص ۷۹۲ کلیاتِ فارسی)

یعنی کوے اور گدھ اپنا رزق مٹی اور قبروں یعنی زمین پر پڑے مُرداروں میں تلاش کرتے ہیں جبکہ شاہین اپنا رزق چاند

اور سورج یعنی آسمانوں میں محوِ پرواز پرندوں کو بناتا ہے۔ مُراد یہ کہ مادہ پرست لوگ ہمیشہ مادی منفعتوں کے حصول کے خواہاں رہتے ہیں جبکہ روحانی ترقی کے حصول کے خواہاں ہمیشہ علائقِ دنیوی سے بالاتر ہو کر سوچتے ہیں۔

علامہ اقبال نے اس شعر کے مضمون کی بنیاد اپنے ایک عام مشاہدے پر رکھی ہے اور وہ یہ کہ کوے اور گدھ آسمانوں میں شکار نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ زمین پر دوسروں کے مارے ہوئے جانوروں کی تلاش میں رہتے ہیں جبکہ شاہین ایک ایسا پرندہ ہے جو خود بھی بلند پرواز ہے اور اپنا شکار بھی آسمانوں میں اُڑتے پرندوں کو ہی بناتا ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

مرغک اندر شاخسارِ بوستاں
بر مُرادِ خویش بندد آشیاں
تو کہ داری فکرتِ گردوں مسیر
خویش را از مرغکے کمتر مگیر
(ص ۸۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے انسان یہ حقیقت تجھ پر عیاں ہے کہ پرندہ باغ کے کسی بھی درخت کی کسی بھی شاخ پر اپنی مرضی سے گھونسلا بناتا ہے لہذا تو جو بلندیٔ فکر رکھتا ہے اپنے آپ کو پرندے سے کمتر نہ سمجھ اور اپنی مرضی سے اپنا آشیانہ بنا یعنی دوسروں کی خواہش کے مطابق زندگی گزارنا چھوڑ اور اپنی مرضی سے جینا سیکھ کیونکہ تو آزاد پیدا ہوا ہے۔

علامہ اقبال نے ان اشعار میں موجود مضمون کی بنیاد اپنے ایک عام مشاہدے اور تجربے پر رکھی ہے اور وہ یہ کہ پرندے کسی دوسری مخلوق یا اپنے ہی کسی ہم جنس کی متعین کردہ جگہ پر اپنا آشیانہ نہیں بناتے بلکہ اپنی مرضی سے جگہ کا انتخاب کرتے ہیں اسی طرح انسان کو بھی اپنی زندگی دوسروں کے متعین کردہ طریقے سے نہیں گزرانی چاہئے بلکہ اپنے لئے نئی راہیں تراشنی چاہئیں۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

قلندر جرہ باز آسمانہا
بہ بالِ او سبک گردد گرانہا
فضاے نیلگوں نخچیر گاہش
نمی گردد بگرد آشیانہا
(ص ۱۰۱۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی قلندر یا مردِ مومن آسمانوں میں پرواز کرنے والے باز کی حیثیت رکھتا ہے جس کی اڑان کے سامنے پہاڑوں کی بھی

کوئی حقیقت نہیں وہ دوسرے پرندوں کی مانند آشیانہ بنانے کی فکر میں نہیں رہتابلکہ نیلا آسمان اس کی شکار گاہ بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس مضمون کی بنیاد اپنے ایک عام مشاہدے پر رکھی ہے کہ باز دوسرے پرندوں کی طرح آشیانہ بنانے میں دلچسپی نہیں رکھتابلکہ ان کے مقابلے میں ہمیشہ اُونچی اُڑان اُڑتا ہے اور اونچی فضاؤں میں اپناشکار تلاش کرتا ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

نہاں اندر دو حرفے سرکارِ است

مقامِ عشق منبر نیست دار است

براہیماں ز نمروداں نترسند

کہ عودِ خام را آتش عیار است

(ص ۱۰۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی کامیابی کا راز ان دو حروف میں پنہاں ہے کہ عشق کا مقام واعظانہ زندگی بسر کرنے سے نہیں منصور حلاج کی طرح سولی پر چڑھ جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ خدا کے عاشق یعنی ابراہیم نمرودوں یعنی دشمنانِ دین کی طرف سے دیئے جانے والے مصائب سے نہیں گھبراتے کیونکہ خالص قسم کی عود کی لکڑی کی یہی پہچان ہے کہ جب اُسے آگ میں ڈالا جائے تو وہ خوشبو دیتی ہے۔ جبکہ ناخالص عود کی لکڑی کے ساتھ معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ ان اشعار میں دی جانے والی عود کی لکڑی کی مثال عام مشاہدے اور تجربے کی بات ہے۔



۵۔ زبان کا فطری پن، سادگی
اور بے ساختگی

علامہ اقبال ذولسانین شاعر تھے اور ایسے شاعر سے عموماً یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ غیر مادری زبان میں گنجلک اور مشکل الفاظ استعمال کرے گا اور زبان وبیان کی ہنر نمائی کی طرف توجہ دے گا لیکن علامہ اقبال کو احساس تھا کہ انہوں نے مسلمان قوم کو بالخصوص اور دنیا کو بالعموم زندگی یا بالفاظ دگر اسلام کا پیغام دینا ہے اسی لئے انہوں نے اپنے خیالات کو سادہ رواں اور بے ساختہ انداز میں پیش کیا۔

مولانا شبلی نعمانی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

> "نظم کا در حقیقت سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اس کو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہو سکے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہے جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائے گا اُسی قدر شعر زیادہ صاف برجستہ رواں اور ڈھلا ہوا ہو گا۔"(۲۷)

لیکن اس کا لحاظ رکھنا بجائے خود ایک قسم کی آورد ہے بلکہ کلام میں یہ وصف اُس وقت سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے جب شاعر پر ایک نیم شعوری کیفیت طاری ہو اور وہ بلا قصد وارادہ شعر موزوں کرتا چلا جائے اور ڈاکٹر صاحب پر یہ کیفیت اکثر طاری رہتی تھی۔

بلکہ بقول شیخ عبدالقادر :

> "ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں سخت روانی پائی جاتی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بغیر کسی جذباتی تحریک کے شعر نہیں کہتے تھے اسی لئے وہ فرمائشی اشعار کہنے پر قادر نہ تھے لیکن جب وہ ازخود شعر کہنے کی طرف مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی اور ایک ایک نشست میں بے شمار شعر کہہ ڈالتے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ خود ان کے ہاتھ میں کاغذ اور قلم نہیں ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا ہوا چلا آرہا ہے۔"(۲۸)

علامہ اقبال کے یہاں روانی اور بے ساختگی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اونٹ کا شیوہ یہ ہے کہ وہ محنت اور مشقت سے کام لے، خدمت سرانجام دے اور صبر واستقلال کا مظاہرہ کرے وہ ہر صحرا و بیابان سے گزرتا ہے، کم کھاتا ہے، کم سوتا ہے اور محنت و مشقت سے کام لیتا ہے۔ پیٹھ پر کجاوہ لئے مست و سرشار چلتا ہے اور رقص کرتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے وہ رفتار کے نشے میں مگن ہو کر چلتا ہے اور دورانِ سفر اپنے سوار سے زیادہ صبر کا ثبوت دیتا ہے۔

اے انسان تو بھی اُن فرائض کا بوجھ اٹھانے سے سرتابی نہ کر جو خدا نے تیرے ذمے لگا دیئے ہیں اسی طرح تو اس بہترین ٹھکانے پر پہنچ جائے گا جو خدا کے پاس ہے۔ ان خیالات کی ادائیگی کے لئے بیان کی سادگی اور بے ساختگی ملاحظہ ہو :

خدمت و محنت شعار اشتر است
صبر واستقلال کارِ اشتر است
نقش پایش قسمتِ ہر بیشۂ
کم خورو کم خواب و محنت پیشۂ
مست زیرِ بارِ محمل می رود
پائے کوباں سوے منزل می رود
سرخود از کیفیتِ رفتار خویش
در سفر صابر تراز اسوارِ خویش
تو ہم از بارِ فرائض سرمتاب
برخوری از عندۂ حسن المآب
(ص ۴۰ کلیات اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ایران کے بادشاہ یزد جرد کے سالاروں میں سے ایک سالار میدانِ جنگ میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اُس نے مسلمان سپاہی کو اپنے نام یا رتبے سے آگاہ نہ کیا بلکہ درخواست کی کہ میری جان بخشی کی جائے اور مسلمانوں کے شیوے کے مطابق مجھے امان دی جائی مسلمان نے یہ درخواست سنتے ہی تلوار میان میں کرلی جائے اور کہا کہ اب تیرا خون بہانا میرے لئے جائز نہیں ہے :

اس مضمون کو کس سادگی اور بے ساختگی سے بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو :

شد اسیرِ مسلمے اندر نبرد
قائدے از قائدانِ یزد جرد

از مقامِ خود خبردارش نکرد
هم زنامِ خود خبردارش نکرد
گفت می خواہم کہ جان بخشی مرا
چون مسلمانان امان بخشی مرا
کرد مسلم تیغ را اندر نیام
گفت خونت ریختن برمن حرام
(ص ۱۰۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ خدا نے انسان سے کہا کہ میں نے اس جہان کو یعنی تمام انسانوں کو یکساں پیدا کیا یعنی سب کی اصل پانی اور مٹی ہے لیکن تو نے ان کو مختلف قوموں یعنی ایرانی تورانی اور حبشی وغیرہ میں تقسیم کر دیا۔ میں نے زمین سے خالص فولاد پیدا کیا لیکن تو نے اس دھات سے جسے میں نے فائدے کے لئے بنایا تھا مہلک آلات مثلاً تلوار تیر اور بندوق بنا دیئے نیز تو نے اس سے درختوں کو کاٹنے کے لئے کلہاڑی بنائی اور پرندوں کو قید کرنے کے لئے پنجرے بنائے۔ یہ سن کر انسان نے جواب دیا کہ اے خدا تو نے رات پیدا کی تو میں نے تیری تاریک رات کو منور کرنے کے لئے چراغ بنایا تو نے مٹی پیدا کی تو میں نے اُس مٹی سے پیالے بنائے۔ تو نے بیابان، کوہسار اور جنگل پیدا کئے تو میں نے پھولوں کی کیاریاں اور گلزار اور چمن بنائے تو نے پتھر پیدا کیا میں نے اسے صیقل کر کے آئینہ بنا دیا۔ تو نے زہر پیدا کیا لیکن میں نے زہر کو دوا میں تبدیل کر دیا۔
ان خیالات کی ادائیگی کے لئے سادہ اور بے ساختہ الفاظ کا چناؤ ملاحظہ ہو:

(خدا)

جہاں رازیک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

(انسان)

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم
(ص ۲۸۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ساحل سمندر نے جو روزِ آفرینش سے سکون کی حالت میں ہے یہ کہا کہ اگرچہ میں بہت جیا لیکن قطعاًنہ جان سکا کہ میں کون ہوں۔ ایک موج نے جو جذبۂ عمل سے سرشار تھی یہ بات سنی تو بڑی تیزی سے حرکت میں آئی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ میری زندگی تو حرکت و عمل پر منحصر ہے اگر میں ساکن ہو جاؤں تو فنا ہو جاؤں۔ اس مضمون کو کس قدر رواں اور بے ساختہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے ملاحظہ ہو :

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم گرنروم نیستم
(ص ۲۹۸ کلیات اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ نہ میرے فکر وخیال میں کفر وایمان کی جنگ چھڑی ہے اور نہ میرے دلِ غمناک کو جنت کے باغ کا لالچ ہے۔ اگر تو میرے باطن کو کھوجے گا تو اُسے اپنے ہی تصور کی آماجگاہ پائے گا اور صحرا میں چاند کی چاندنی کی طرح جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہوتی ہے یہاں بھی ہر طرف اپنے آپ کو ہی دیکھے گا۔ ان خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ کی سادگی اور بے ساختگی ملاحظہ ہو :

نہ در اندیشۂ من کار زارِ کفر و ایمانے
نہ در جانِ غم اندوزم ہوائے باغ رضوانے
اگر کاوی درونم را خیالِ خویش را یابی
پریشان جلوۂ چون ماہتاب اندر بیابانے
(ص ۴۲۵ کلیاتِ اقبا ل فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مومن! حیرت ہے کہ آفاق تو تم سے روشن ہیں لیکن تمہاری ذات ہی درمیان سے غائب ہے۔ تم کب تک غفلت اور بطالت اور گمنامی وجہالت کی زندگی گزارتے رہو گے۔ تمہاری روشنی نے دنیائے

قدیم کو روشن کیا اور تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لئے منارۂ نور بن کر رہا۔ تمہاری آستین میں ہمیشہ یدِ بیضا موجود رہا۔ تم آج گھروندوں میں گھوم رہے ہو۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تم انہیں پھلانگ بھی سکتے ہو۔ تم تو اُس وقت بھی تھے جب یہ کائنات نہ تھی اور اس وقت بھی رہو گے جب یہ نہ ہو گی۔ اے مردِ جاوداں! تم موت سے ڈرتے ہو حالانکہ موت کو تم سے ڈرنا چاہیئے۔

موت تمہاری گھات میں نہیں ہے بلکہ تم اس کی گھات میں ہو۔ تمہیں جاننا چاہیئے کہ آدمی کی موت روح کی جدائی سے نہیں ہوتی بلکہ ایمان اور یقین کی کمی سے ہوتی ہے۔ تم مجھ سے نقاشی کا ہنر سیکھ لو شاید اسی توسط سے تم اپنے آپ کو دوبارہ پا سکو۔ ان خیالات کو کسی سادگی اور بے ساختگی سے ادا کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

بینی جہان را خود را نہ بینی
تا چند نا داں غافل نشینی ؟
نورِ قدیمی شب را برافروز
دستِ کلیمی در آستینی
بیرون قدم نہ از دورِ آفاق
تو پیش ازینی تو پیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید
مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی
صورتگری را از من بیاموز
شاید کہ خود را باز آفرینی

(ص ۷۰۵ کلیات اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے جاوید! تو ذوقِ نظر یعنی ذاتِ حق سے عشق کرنا اور اس کی وحدانیت کی آگ میں جلنا مجھ سے سیکھ۔ اگر تو لاالہ کہنا چاہتا ہے تو اس کی محض زبان سے ادائیگی پر اکتفامت کر بلکہ اسے دل و جان سے ادا کر تاکہ تیرے روئیں روئیں سے توحید کی خوشبو آسکے یعنی تیری پوری زندگی اس کی صداقت پر گواہی دے سکے۔ یاد رکھ کہ یہ سورج، چاند، ستارے یعنی اجسامِ فلکی سب لاالہ کے سوز کی وجہ سے گردش کر رہے ہیں اور میں نے اسکے سوز کا مشاہدہ پہاڑوں میں بھی کیا ہے اور گھاس کی پتیوں میں بھی کیا ہے لاالہ کے یہ دو حرف یعنی کلمۂ توحید محض قال نہیں بلکہ حال ہے یعنی یہ ایک

ایسی تلوار ہے جو ہر وقت باطل سے برسرِ پیکار ہے جس شخص میں توحید کا سوز پیدا ہو جاتا ہے وہ حق تعالیٰ کی صفت قہاریت کا مظہر بن جاتا ہے یعنی ہر وقت کافروں سے جنگ میں مصروف رہتا ہے اور لاالہ اس کے لئے محض کلمہ نہیں رہتا بلکہ ضرب کاری بن جاتا ہے۔ ان خیالات کی ادائیگی کے لئے سادہ اور بے ساختہ الفاظ کا چناؤ ملاحظہ ہو :

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر
سوختن در لاالہ از من بگیر
لاالہ گوئی بگو ازروے جاں
تاز اندامِ تو آید بوے جاں
مہر و مہ گردد زسوزِ لاالہ
دیدہ ام این سوزرا درکوہ وکہ
این دو حرف لاالہ گفتار نیست
لاالہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است
لاالہ ضرب است و ضرب کاری است
(ص ۷۸۷، ۷۸۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو اخلاص کی روش کو مضبوطی سے تھام لے یعنی اپنے دل سے غیر اللہ کے خیال کو کلی دور کر دے اور اپنی زندگی کو اللہ کے لئے خالص کر دے یعنی ہر مشکل میں صرف اللہ کی خوشنودی کو مدِ نظر رکھ اور بادشاہوں کے خوف سے آزاد ہو جا۔ عدل کو قہر و مہر کسی بھی صورت میں ہاتھ سے نہ جانے دے اور تونگری اور مفلسی دونوں صورتوں میں قصد یعنی میانہ روی اختیار کر۔ احکامِ شریعہ کی تعمیل میں تاویلاتِ باطلہ سے اجتناب کر اور اپنے دل کو اپنار ہنمابنا۔ ہر وقت ذکر و فکر میں مشغول رہنا اور جوانی میں ضبطِ نفس کرنا جان اور تن دونوں کی حفاظت کرنا ہے۔ اور جان و تن دونوں کی حفاظت ہی انسان کو تمام دنیا کی حکمرانی عطا کرتی ہے۔ ان خیالات کو کس قدر سادہ اور بے ساختہ پیرایۂ بیان عطا کیا گیا ہے ملاحظہ ہو :

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوف سلطان و امیر
عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

حکم دشوار است تاویلے مجو
جز بقلبِ خویش قندیلے مجو

حفظِ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب
حفظ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب

حاکمی در عالم بالا و پست
جز بحفظ جان و تن ناید بدست

(ص ۹۱ے ، ۹۲ے کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مرنا اور جینا دونوں اعتباری امور ہیں مثلاً بہرے کے لئے آواز کا کوئی وجود نہیں لہذا وہ آواز کے لئے مُردے کی حیثیت رکھتا ہے اور اندھے کو اگرچہ سازو آواز مست بنا دیتی ہے لیکن اس کے لئے رنگ کا کوئی وجود نہیں لہذا وہ رنگ کے لئے مُردے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح انسانی روح کو اگر معیت حق نصیب ہے تو وہ زندہ ہے ورنہ مردہ ہے یعنی حق تعالیٰ کی نگاہ میں صرف وہی انسان زندہ ہے جسے حضوری کی دولت حاصل ہے اور چونکہ حق تعالیٰ حقیقی معنوں میں زندہ ہے کیونکہ اُسے موت نہیں آسکتی اس لئے حقیقی حیات اس شخص کو نصیب ہو سکتی ہے جو خُدا کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہو جو شخص حضور یعنی معیتِ حق سے محروم ہے وہ دراصل مُردہ ہے۔ یہ دوسری بات کہ دنیا والے اس کی موت کا ماتم نہیں کرتے یعنی اگرچہ دنیا والوں کی نظر میں وہ شخص زندہ ہے لیکن خدا کی نظر میں مُردہ ہے۔ ان خیالات کے اظہار کے لئے بیان کی سادگی اور بے ساختگی ملاحظہ ہو :

مردن و ہم زیستن اے نکتہ رس
این ہمہ از اعتبارات است و بس

مردِ کر سوزِ نوا را مُردۂ
لذتِ صوت و صدا را مُردۂ

پیشِ چنگے مست و مسرور است کور
پیش رنگے زندہ در گور است کور

روح باحق زندہ و پایندہ است
ورنہ این را مُردہ آن راز زندہ است

آنکہ حیؔ" لایموت آمد حق است
زیستن باحق حیاتِ مطلق است

ہر کہ بے حق زیست جز مُردار نیست
گرچہ کس در ماتمِ او زار نیست
(ص ۸۸۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ غلامی کی زندگی گہری نیند نہیں دائمی موت ہے یہ وہ موت نہیں جو اللہ کے حکم سے آسمان سے آتی ہے بلکہ وہ موت ہے جو زندگی کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے یعنی غلامی وہ موت ہے جسے انسان خود اپنے اوپر وارد کرتا ہے۔ خارج سے اُس پر طاری نہیں ہوتی۔ اس کے شکار شخص کو نہ غُسل دینے والے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ کفن کی، نہ قبر کی اور نہ کوئی شخص اس کی موت پر رنجیدہ ہوتا ہے، اور غلام مرنے کے بعد دوزخ میں نہیں جاتا بلکہ یہی دنیا اس کے لئے دوزخ بن جاتی ہے یعنی وہ جیتے جی دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ان خیالات کو کس سادگی اور بے ساختگی سے ادا کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

زندگانی بر مُرادِ دیگراں
جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں
نیست این مرگے کہ آید زآسمان
تخمِ او می بالد از اعماقِ جاں
صیدِ او نے مردہ شو خواہد نہ گور
نے ہجومِ دوستاں از نزدو دور
جامۂ کس در غم او چاک نیست
دوزخِ او آنسوے افلاک نیست
(ص ۸۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا مجھ جیسے درویش انسان کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور میں عنقریب اس دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ پیغام جو میں نے اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو دیا نہیں دوبارہ سننے کو ملے گا یا نہیں اور میری طرح قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے آگاہی رکھنے والا اور قوم کو ان سے روشناس کرانے والا دوبارہ آئے گا یا نہیں۔ ان خیالات کی ادائیگی کے لئے سادہ اور بے ساختہ الفاظ کا انتخاب ملاحظہ ہو :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ این فقیرے

دگر دانائے راز آید کہ ناید

(ص ۸۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

٦۔ خلوص اور صداقت

علامہ اقبال کی شاعری اوّل تا آخر خلوص اور صداقت کی حامل ہے کیونکہ انہوں نے ایک خاص مقصد کے تحت شاعری کی اور وہ مقصد تھا اسلامی اقدار کا فروغ اور ایک بہتر انسان اور صحت مند معاشرے کی تشکیل۔ اور علامہ اقبال نے انتہائی خلوص اور صداقت سے اس مقصد کو اپنے کلام کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ گدائی کے تھیلے کا سمندر پانی میں آگ کا سیلاب ہے۔ ذاتی کوشش سے اگر اوس کے چند قطرے بھی حاصل ہوں تو وہ گدائی کے سمندر سے بہتر ہیں۔ تو بُلبلے کی طرح مردانہ غیرت کا پیکر بنا رہ اور سمندر میں بھی اپنے پیالے کو اُلٹائے رکھ :

قلزمِ زنبیل سیلِ آتش است
گرز دستِ خود رسد شبنم خوش است
چون حباب از غیرتِ مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش
(ص ۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کی ہستی دستور و آئین پر موقوف ہے۔ رسولؐ کے دین کی حقیقت و معنویت یہی ہے۔ ذرا کائنات پر نظر ڈالئے۔ ایک چھوٹی سی پنکھڑی ایک آئین و دستور کی پابند ہوئی تو پھول بن گئی۔ پھولوں نے اپنے آپ کو آئین کا پابند کیا تو گلدستہ بن گئے۔ اسی طرح آواز جب ایک خاص ضبط اور پابندی کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو نغمہ پیدا ہوتا ہے اور یہ ضبط اور پابندی رخصت ہو جائے تو یہی نغمہ شور و غل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے گلے میں جو سانس آتا جاتا ہے وہ ہوا کی ایک لہر کے سوا کیا ہے ؟ یہی ہوا بانسری میں خاص طریق پر پابند ہو جاتی ہے تو نوا بن جاتی ہے۔ اے مسلمان کیا تجھے معلوم ہے کہ تیرا آئین کیا ہے اور اس آسمان کے نیچے تیرا قیام اور ٹھہراؤ کس پر موقوف ہے۔ ہاں تیرا دستور وہ زندہ کتاب ہے جو قرآن حکیم کے نام سے معروف ہے۔ اس کی حکمتیں ابتدائے آفرینش سے مسلم چلی آ رہی ہیں اور انہیں کبھی زوال نہ آئے گا :

ہستئ مسلم ز آئین است و بس
باطنِ دین نبیؐ این است و بس
برگِ گل شد چون ز آئین بستہ شُد
گل ز آئین بستہ شد گلدستہ شد
نغمہ از ضبط صدا پیداستے

ضبط چون رفت از صدا غوغاستے
درگلوے ما نفس موجِ ہواست
چون ہوا پابندِ نے گردد نواست
توہمی دانی کہ آئین تو چیست؟
زیرِ گردوں سرِ تمکین توچیست؟
آن کتاب زندہ، قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم
(ص ۱۲۱ کلیاتِ اقبا ل فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہم مسلمان نہ افغانی ہیں نہ ترکی ہیں اور نہ تاتاری ہیں۔ بلکہ چمن کے نہال ہیں اور ایک ہی شاخ سے پھوٹے ہیں۔ لہذا رنگ وبو کی تفریق ہم پر حرام ہے کیونکہ ہم ایک ہی نوبہار کے پروردہ ہیں ہم سب دین اسلام کے پیرو ہیں :

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و ازیک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم
(ص ۲۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ انسان صاحبِ بصیرت نہ تھا اس لئے اس نے اپنے ہی ہم جنس کی غلامی اختیار کرلی۔ وہ گوہر جیسی قیمتی صفات کا حامل تھا لیکن اس نے انہیں بادشاہوں کی نذر کر دیا اور اپنی غلامانہ عادت کے باوصف کتوں سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہو گیا جن کو میں نے انتہائی اسفل ہونے کے باوجود اپنے ہی ہم جنسوں کی غلامی اختیار کرتے کبھی نہیں دیکھا :

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قبادو جم کرد
یعنی از خوے غلامی زسگاں خوار تراست
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد
(ص ۳۰۴ کلیاتِ اقبا ل فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے شاہین تم نے باغ میں اپنا گھونسلا بنا کر مجھے خوفزدہ کر دیا ہے کیونکہ اس کی آب وہوا تمہیں آسمان کی بلندیوں کی بجائے نچلی سطح پر اُڑنا سکھائے گی۔ مراد یہ کہ اے مومن تم نے جفاکشی کی بجائے پر آسائش زندگی کا انتخاب کر لیا ہے جو تمہاری صلاحیتوں کو نکھارنے کی بجائے انہیں زنگ آلود بنا دے گی اور یہی بات مجھے خوفزدہ کئے دے رہی ہے کیونکہ تم اُمتِ مسلمہ کے فردِ واحد ہو اور یہ اُمت تمام اُمتوں میں سے بہترین قرار دی گئی ہے اور یہ کائنات تمہارے لئے ہی تخلیق کی گئی ہے تاکہ تم اسے مسخر کرو لیکن اس کی تسخیر کے لئے آرام طلبی نہیں جفاکشی کی ضرورت ہے :

تو اے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
ہوائے او ببالِ تو دہد پروازِ کوتا ہے
(ص ۴۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب ! اگر تو اپنے باپ کی میراث میں سے ایک لعل کا بھی خواہاں ہو تو تجھے اپنی اس خواہش پر پشیمان ہونا چاہئے کیونکہ اس کے مقابلے میں اس لذت بے پایاں کا کوئی ٹھکانہ نہیں جو پتھر سے خود ہیرا تراش کر حاصل ہوتی ہے۔

پشیمان شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی
کجا عیشِ برون آوردن لعلے کہ در سنگ است
(ص ۵۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب ! میں نہیں کہتا کہ تو اس دنیا سے قطع تعلق کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے رنگ وبو کی یہ دنیا تیرے لئے بنائی ہے لہذا تو اس سے دل کھول کر استفادہ کر۔ اس کی مٹی سے موتیوں جیسا اناج حاصل کر اور شاہین کی طرح اس کے آسمانوں میں اپنا شکار کر۔ اپنے تیشے سے پہاڑ کھود اور اپنی عقل سے کائنات کے مخفی خزانوں کو تلاش کر۔ بُت پرستی سے دور رہ۔ اور اپنی مرضی کے مطابق نئی دنیا تراش۔ دنیا سے دل نہ لگا بلکہ اپنے دل کو خدا کے سپرد کر کیونکہ یہ اُسی کی قبلہ گاہ ہے :

من نگویم درگذر از کاخ و کو
دولتِ تست این جہان رنگ و بو
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر
صید چون شاہین ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود راہکہسارش بزن
نورے از خود گیرو بر تارش بزن

از طریقِ آزری بیگانہ باش
بر مُراد خود جہانِ نو تراش
دل برنگ و بو و کاخ و کومدہ
دل حریم اوست جز با اومدہ
(ص ٦٦١ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ سلطان شہید مسلمانوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اگر تم نے بے مقصد زندگی گزارنی ہے تو اس دنیا میں مت آؤ یعنی بغیر مقصد کے اس دنیا میں جینا یا اس سے گزر جانا برابر ہے لیکن اگر آئے ہو تو پھر چنگاری کی طرح زندگی مت بسر کرو کہ ادھر چمکی ادھر غائب ہو گئی بلکہ کسی خرمن کی تلاش کرو تا کہ اُس میں الاؤ بن کر بھڑک سکو۔ اور اگر سورج کی مانند تب و تاب رکھتے ہو تو آسمان کی وسعتوں میں اپنا ٹھکانہ بناؤ اور پہاڑ، پرندے، باغ، صحرا اور دریا کی تہہ میں موجود مچھلیوں تک کو اپنی تب و تاب سے جلا ڈالو۔ اگر تمہارے سینے میں تیر کھانے کی اہلیت ہے تو دنیا میں شاہین کی طرح جیئو اور شاہین کی طرح مرو یعنی اس دنیا کی مشکلات سے دلیرانہ انداز میں پنجہ آزمائی کرو اور مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤ:

در سرائے ہست و بود آئی؟ میا
از عدم سوے وجود آئی؟ میا
ور بیائی چون شرار از خود مرو
در تلاشِ خرمنے آوارہ شو
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر
پابنہ در وسعت آبادِ سپہر
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز
ماہیان را در تہِ دریا بسوز
سینۂ داری اگر در خوردِ تیر
در جہاں شاہین بزی شاہین بمیر
(ص ٧٧٢، ٧٧٣ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جب کسی قوم کے افکار و خیالات غلط ہو جاتے ہیں تو کھری چاندی بھی اس کے ہاتھ میں آکر کھوٹی ہو جاتی ہے یعنی وہ دنیا کی کسی اچھی یا مفید بات یا چیز سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتی۔

اس قوم کا دل مُردہ ہو جاتا ہے یعنی وہ قوم روحانیت، پاکیزگی، تقویٰ اور طہارت سے بیگانہ ہو جاتی ہے اور اس کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ برائی کو اچھائی اور اچھائی کو برائی تصور کرنے لگتی ہے اور بے عملی کو مدارِ حیات سمجھ لیتی ہے اسی لئے وہ میدانِ جنگ میں جانے سے جی چراتی ہے اور موت سے ڈرنے لگتی ہے۔اس کے دریا سے کوئی موج نہیں اٹھتی اور اس کے موتی مٹی کے ٹھیکرے کی طرح بے قیمت ہو جاتے ہیں پس جب کسی قوم کی حالت یہ ہو جائے تو اس کی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی فکر کی تطہیر کی جائے یعنی اس کی ذہنیت کو خیالاتِ فاسدہ اور عقائد باطلہ سے پاک کیا جائے اس کے بعد اس کی فکر کی تعمیر کی جائے یعنی اسے صحیح اسلامی عقائد کی تلقین کی جائے :

چون شود اندیشۂ قومے خراب
ناسرہ گردد بدستش سیم ناب
میرد اندر سینہ اش قلبِ سلیم
در نگاہ او کج آید مستقیم
برکراں از حرب و ضربِ کائنات
چشم او اندر سکون بیند حیات
موج از دریاش کم گردد بلند
گوہرِ او چون خزف نا ارجمند
پس نخستین بایدش تطہیرِ فکر
بعد ازاں آسان شود تعمیرِ فکر

(ص ۸۰۷ کلیاتِ اقبالِ فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان کا مسلمان اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے مدت سے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو اس کے اندر ذوقِ یقین اور جذبۂ جہاد پیدا کر سکتا ہو۔ نتیجۃً وہ قوتِ دین سے بد ظن ہو چکا ہے یعنی اس کے دل سے یہ حقیقت محو ہو چکی ہے کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آئے تو دوبارہ کفار پر غالب آسکتا ہے اور چونکہ وہ ایمان سے محروم ہے اس لئے اپنے ہی قافلے کے لئے لٹیرا بن گیا ہے۔ تین صدیوں سے یہ ذلیل و خوار قوم عشق کے بغیر زندگی بسر کر رہی ہے اس کی فکر پست ہو چکی ہے۔ طبیعت ادنیٰ چیزوں کی طرف مائل ہے اور مذاق بگڑ گیا ہے اور اس کے مذہبی پیشوا عشق کی نعمت سے محروم ہیں اسی لئے ان کے حلقہ ہائے درس و تدریس میں سب کچھ ہے مگر عشقِ رسولؐ کی تلقین نہیں ہے عقائد کی خرابی نے اس قوم کو زندگی کے ہر شعبے میں ذلیل و خوار کر رکھا ہے اسی لئے وہ فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہے بلکہ اپنے آپ سے بیزار ہے اور چونکہ وہ اپنے مقام سے بیگانہ ہے یعنی اس حقیقت سے ناآشنا

ہے کہ اللہ نے اُسے ساری قوموں کا سردار بنایا ہے اس لئے اس میں انقلاب برپا کرنے کا جذبہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ مسلمان مردِ خبیر کی صحبت اختیار نہیں کرتا اس لئے مایوس، شکستہ دل اور صداقت سے بیگانہ ہے۔ وہ مردود بارگاہِ ایزدی ہے نیز مفلس اور اپنے فرائض سے غافل ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ نہ اس کے پاس دولت ہے کہ کوئی بادشاہ اس کے حصول کی غرض سے اس کی طرف متوجہ ہو اور نہ اسکے دل میں ایمان کا نور ہے جس سے محروم کرنے کے لئے شیطان اس کی جانب مائل ہو۔ اس کی دینی اور روحانی پستی کا عالم یہ ہے کہ جو شخص ان کی اصلاح کا مدعی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میں کسی ولی مثلاً بایزید بسطامی سے کم نہیں ہوں لیکن اس کا حال یہ ہے کہ وہ حکومتِ برطانیہ کو رحمتِ ایزدی قرار دیتا ہے یعنی انگریز کا مُرید ہے اور وہ مسلمانوں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اگر تم انگریزوں کی غلامی پر قانع رہو گے تو دینِ اسلام کو رونق حاصل ہو گی۔ اگر تم زندگی کے طالب ہو تو خودی سے بیگانگی اختیار کر لو۔ المختصر اس نے حکومتِ اغیار کو رحمت قرار دیا اور انگریز حکومت کی شان میں قصیدہ خوانی کرتے کرتے مر گیا۔

مُسلم این کشور از خود نااُمید
عمرھا شُد با خدا مردے ندید
لاجرم از قوتِ دیں بدظن است
کاروانِ خویش را خود راہزن است
از سہ قرن این اُمت خوار و زبوں
زندہ بے سوزو سرورِ اندرون
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و ملائے او محرومِ شوق
زشتیِ اندیشہ او را خوار کرد
افتراق او را ز خود بیزار کرد
تا نداند از مقام و منزلش
مُرد ذوق انقلاب اندر دلش
طبع او بے صحبتِ مردِ خبیر
خستہ و افسردہ و حق ناپذیر
بندۂ رد کردۂ مولاست او
مفلس و قلاش و بے پرواست او
نے بکف مالے کہ سلطانے برد

نے بدل نورے کہ شیطانے بُرد
شیخ او لردِ فرنگی را مُرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شُمرد
رقص ھا گردِ کلیسا کردو مُرد
(ص ۸۱۹۔۸۲۰ کلیات اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان تو نے اپنی حماقت کی بدولت فرنگی بتوں کی پرستش شروع کر دی اور انگریزوں کی غلامی قبول کر کے اپنے اوپر روحانی موت وارد کر لی۔ افسوس مسلمان ہو کر تو نے بزدلوں کی موت گوارا کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تیری عقل دل سے ناآشنا رہی اور تیرا سینہ عشقِ رسولؐ کے جذبے سے عاری رہا۔ شاید تو نے انگوروں کی اس بیل سے کشید کردہ شراب نہیں پی جو تیرے بزرگوں نے لگائی تھی یعنی تو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر نہیں چلا اگر تو ایسا کرتا تو عاشقِ رسولؐ ہوتا انگریزوں کی غلامی ہرگز قبول نہ کرتا۔

بہ افرنگی بُتاں خود را سپُردی
چہ نامردانہ در بُتخانہ مُردی
خرد بیگانۂ دل سینہ بے سوز
کہ از تاکِ نیاگاں مے نخوردی
(ص ۱۰۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانہ سراسر مادہ پرستی کی تعلیم دے رہا ہے یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام اس کے ہاتھوں بہت نالاں ہے بظاہر اس دور نے لوگوں کو آزادی عطا کر دی ہے لیکن سچ پوچھو تو اس نام نہاد آزادی کے پردے میں سینکڑوں قیود عائد کر دی ہیں یعنی کہنے کو آجکل ہر شخص آزاد ہے لیکن دراصل وہ بہت سی بُری عادات یا فیشنوں کے ضوابط کا غلام بن چکا ہے اور اس دور نے انسانیت کو مسخ کر کے دنیا سے تہذیب و شرافت کا خاتمہ کر دیا ہے۔

چہ عصر است این کہ دیں فریادیٔ اوست
ہزاراں بند در آزادیٔ اوست
زروے آدمیت رنگ و نم بُرد

غلط نقشے کہ از بہزادیٔ اوست

(ص ۷۷۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

۷۔ جوش و خروش اور ولولہ

علامہ اقبال کا فلسفہ چونکہ دینی تھا اس لئے ان کے اندر یقین کی ایسی شدید کیفیت پیدا ہو گئی کہ کسی قسم کا شک یا ظن ان کے افکار میں راہ نہ پا سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی شاعری میں رنگ یقین پیدا ہو گیا۔ وہ جو کچھ کہتے اُس میں ذوقِ یقین کار فرما ہوتا۔ کسی بات میں تذبذب یا شک نہ ہوتا اس لئے ان کے کلام میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا اور یہی جوش ان کے کلام میں ترنم پیدا کرنے کا باعث بنا جس نے نہ صرف ان کے اشعار کو قارئین کے ذہن پر نقش کیا بلکہ موسیقی کے سانچے میں ڈھل کر غنائی کیفیت بھی پیدا کی۔

ڈاکٹر عبد المغنی اس ضمن میں لکھتے ہیں :

> ''شاعری کے جزو اول تمثال خانے سے بھی زیادہ وافر اقبال کے یہاں شعر کی موسیقی ہے۔ شعر کی یہ اندرونی آواز شاعری کا جزو ثانی نہیں، جزو اعظم ہے اور یہ جزو اقبال کی افتادِ مزاج ہے۔ اُن کے روحانی کوائف انہیں ہمیشہ سرمست رکھتے ہیں اور اس سرشاری سے نغمے کا ایک سیلِ بے پناہ رواں ہوتا ہے۔ ایک وجد آفرین گنگناہٹ اشعار کی رگ رگ میں ساری ہے زمزمے کی یہ کیفیت چند غزلوں اور نظموں تک محدود نہیں پورے کلام پر طاری ہے۔ یہ ترنم بحر اور ردیف و قافیے پر ہی منحصر نہیں۔ یہ دراصل الفاظ کی ایک خاص وجدانی ترکیب سے صورت پذیر ہوتا ہے یہ فنکار کی طبیعت کے فطری سرجوش کا آہنگ ہے اس کو ایک لفظ میں ولولہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔''(۲۹)

علامہ کے یہاں جوش و خروش اور ولولے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ تو اگر قطرہ بھی ہو تو اپنے آپ کو اپنے پاؤں میں نہ گرا۔ اپنے اندر طوفان کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کر اور سمندر سے نبرد آزمائی کر۔ تو موتیوں کی سی چمک کا طلبگار ہو اور گوہر کا ٹکڑا بن جا تاکہ آویزہ بن کر کسی محبوب کے کان تک پہنچ جائے یا اپنے آپ کو بڑھا اور تیز رفتار ہو جا بلکہ بادل بن جا جس سے بجلیاں گرتی ہیں اور دریاؤں کو لبریز کر دینے والا پانی برستا ہے۔ ان خیالات کی ادائیگی کے لئے الفاظ کا ترنم اور شکوہ ملاحظہ ہو :

قطرۂ؟ خود را بپائے خود مریز
در تلاطم کوش و با قلزم ستیز
آبِ گوہر خواہ و گوہر ریزہ شو
بہرِ گوش شاہدے آویزے شو

یا خود افزا شو، سبک رفتار شو

ابرِ برق انداز و دریا بار شو

(ص ۶۱ کلیات اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جنگل کے کنارے سے ایک ببر شیر نکلا اور اس طرح دھاڑا کہ آسمان بھی لرز اٹھا۔ اس نے انسان کی بو محسوس کی اور اس کی طرف بڑھا اور نماز میں مصروف عالمگیر کی کمر پر پنجہ دے مارا۔ بادشاہ نے آنکھ اٹھائے بغیر خنجر کھینچا اور شیر کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ وہ قطعاً خوفزدہ نہ ہوا اور اس نے ایک لمحے میں جنگل کے شیر کو قالین کا شیر بنا دیا۔

ان خیالات کے اظہار کے لئے جوشیلے اور موسیقی سے بھرپور الفاظ ملاحظہ ہوں :

شیرِ ببر آمد پدید از طرفِ دشت

از خروشِ او فلک لرزندہ گشت

بوے انسان دادش از انسان خبر

پنجہ عالمگیر را زد برکمر

دست شاہ نادیدہ خنجر برکشید

شرزہ شیرے را شکم از ہم درید

دل نخود راہے نداد اندیشہ را

شیرِ قالین کرد شیرِ بیشہ را

(ص ۹۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں قصۂ آدم کے موضوع پر جوش وخروش سے بھرپور اور گنگناتے ہوئے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

فرماتے ہیں کہ ظہور آدم سے پہلے کائنات میں کوئی ہستی خالق کائنات سے محبت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی لیکن اس کے ظہور میں آتے ہی عشق نعرہ زن ہوا کہ عاشق وجود میں آگیا اور حُسن پر لرزہ طاری ہوا کہ مدرکِ جمال پیدا ہو گیا۔

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد

حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد

انسان نے اگرچہ اُس مٹی سے جنم لیا جو مجبور ہے مختار نہیں لیکن انسان مجبور ہونے کے ساتھ ساتھ مختار بھی کہلایا اور اسی خوبی کی بنا پر اُس نے اپنی خودی کو مستحکم کیا یعنی خودگر بنا، اجتماعی شان پیدا کرنے کی غرض سے اپنے اوپر قیود وارد کیں یعنی خود شکن بنا اور اپنی معرفت حاصل کر کے روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوا یعنی خودنگر بنا۔

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے خود شکنے، خود نگرے پیدا شُد

ظہورِ آدم کی اطلاع آسمانوں سے ہوتی ہوئی شبستانِ ازل میں عالم ملکوت تک پہنچی کہ کائنات کے ساتھ ساتھ ان کی دنیا کے مخفی اسرار کو بھی آشکار کرنے والا پیدا ہو گیا۔

خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شُد

انسان کی پیدائش سے پہلے کسی ہستی میں آرزو کار فرمانہ تھی لیکن جب انسان پیدا ہوا تو وہی آرزو جو زندگی کی آغوش میں اپنے وجود سے بھی بے خبر تھی بیدار ہو گئی اور اس کی بیداری ایک نئی دنیا کو وجود میں لانے کا سبب بنی۔

آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد جہانِ دگرے پیدا شُد

ظہورِ آدم سے پہلے زندگی سراسر مادی تھی لیکن آدم کے دم قدم سے وہ خاک سے ابھر کر افلاک تک پہنچی یعنی مادیات کے دائرے سے نکل کر روحانیت کے عالم میں داخل ہوئی مراد یہ کہ ساری کائنات میں صرف انسان ہی وہ واحد ہستی تھی جو روح، بقائے روح، حیات بعد الموت، عالم مثل اور عالمِ لاہوت کا تصور کر سکتی تھی۔

زندگی گفت کہ درخاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شُد
(ص ۲۵۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ الفاظ کا ترنم اور شکوہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ :

اے مخاطب! میں مسلمان ہوں اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کروں اور تیر و سنان اور خنجر و شمشیر کے زخم اپنے جسم پر کھاؤں۔ اگر تو دنیا کا طالب ہے تو میری ہم نشینی اختیار نہ کر کیونکہ میں تو مسلکِ شبیر پر عمل کرنا چاہتا ہوں یعنی خدا کی راہ میں اپنا سر کٹانا چاہتا ہوں :

تیر و سنان و خنجرو شمشیرم آرزوست
بامن میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

تو دیکھ کہ میں آشیانہ بنانے کے لئے تنکے جمع کر رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسے شعلے کا بھی آرزومند ہوں جو میرے آشیانے کو جلا کر رکھ دے۔ مراد یہ کہ اگرچہ میں دنیا میں رہتا ہوں اور جائز طریقے سے دولت بھی اکٹھی کرتا ہوں لیکن میں اپنی جان اور اپنا مال دونوں خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوں کیونکہ عاشق صادق کا مقصود دنیا نہیں ہوتا۔

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز این نگر کہ شعلۂ درگیرم آرزوست

محبوبِ حقیقی نے مجھ سے کہا کہ میرا راز کسی پر فاش مت کرنا۔ میں نے جواب دیا۔ بہت خوب! میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا لیکن اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ نعرۂ تکبیر بلند کروں یعنی اہل دنیا کو یہ سنادوں کہ اللہ اکبر یعنی اللہ سب سے بڑا۔ اور اللہ کے تمام اسرار چونکہ اسی نعرۂ تکبیر میں پوشیدہ ہیں۔ لہذا ایک مسلمان جب اللہ اکبر کہتا ہے تو بالفاظ دگر وہ ان تمام اسرار کو فاش کر دیتا ہے :

گفتند لب بہ بندو ز اسرارِ ما مگو
گفتم کہ خیر نعرۂ تکبیرم آرزوست

محبوب نے مجھ سے کہا کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہو عطا ہوگا۔ میں نے کہا میں اپنی تقدیر کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہوں یعنی اپنے حقیقی مقام سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں اور مسلمان کا حقیقی مقام یہ ہے کہ وہ عبدہ بن جائے یعنی مقامِ عبدیت پر فائز ہو جائے اور چونکہ اس سے بلند تر کوئی مقام نہیں ہے اس لئے ہر مسلمان کو اس کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔

گفتند ہرچہ در دلت آید زما بخواہ
گفتم کہ بے حجابیٔ تقدیرم آرزوست
(ص ۳۲۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ جوش و خروش سے بھرپور اور مترنم اشعار ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر اور ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہ کہ اس کیفیت میں پختگی کا رنگ پیدا ہو اور جب تو یہ دیکھ لے کہ پختگی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے تو ملوکیت کا تختہ الٹ دے اور حکومت الٰہیہ قائم کر دے۔

بانشۂ درویشی در سازو دما دم زن
چون پختہ شوی خودرا بر سلطنتِ جم زن

کارکنان قضا و قدر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تو نظامِ ملوکیت میں اسلامی زندگی بسر کر سکتا ہے میں نے کہا نہیں تو انہوں نے کہا : اگر ایسا ہے تو اس نظام کو مٹا دے اور اسلامی نظام قائم کر دے :

گفتند جہانِ ما آیا بتومی سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

آج کل مدرسوں اور خانقاہوں میں کوئی شخص مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی تلقین نہیں کرتا اس لئے میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ مغبچوں یعنی خام طبع لوگوں کی بجائے "رستم دستاں" یعنی مردانِ خدا کی صحبت اختیار کر۔

درمیکدہ ھا دیدم شائستہ حریفے نیست
بارستم دستاں زن بامغبچہ ھا کم زن

اے لالۂ صحرا یعنی اے زاہد! تو خلوت میں ساری عمر برباد مت کر بلکہ اپنا سوزِ دروں مسلمانوں کے قلوب میں منتقل کر دے یعنی مجاہدوں کی جماعت تیار کر اور باطل کو مٹا دے۔

اے لالہء صحرائی تنہا نتوانی سوخت
این داغِ جگر تابے برسینۂ آدم زن

اے مسلمان تو اپنی نادانی کی وجہ سے اس دنیا کو اپنا حاکم سمجھتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات تیری مخدوم نہیں ہے بلکہ خادم ہے تو اس کائنات پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے تو اس کائنات کا سوزِ دروں ہے یعنی اسکی رونق صرف تیرے دم سے ہے اور اس میں جو زندگی نظر آرہی ہے یہ بھی تیری ہی بدولت ہے اگر تجھے میری بات کا یقین نہ ہو تو اس کائنات کے پیکر کو چاک کر کے دیکھ لے یعنی فطرت کا مشاہدہ کر تجھے خود معلوم ہو جائے گا کہ تو اشرف المخلوقات ہے یہاں جو کچھ ہے سب تیرے ہی فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے تمام عناصر کائنات تیرے خادم اور غلام ہیں اگر تو اپنی خودی کو مستحکم کر لے تو یہ کائنات تیری مطیع ہو جائے گی۔

تو سوزِ درونِ او، تو گرمیٔ خونِ او
باور نکنی چا کے در پیکرِ عالم زن

خدا نے تجھے دو قوتیں عنایت کی ہیں ایک عقل ہے جو چراغ کی مانند ہے اور جس کی روشنی میں عناصر کائنات کو مسخر کیا جاسکتا ہے دوسری عشق ہے جو مردانِ خدا کی صحبت اختیار کرنے سے اپنے کمال کو پہنچتی ہے اور اس کا حامل انسان دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔

عقل است چراغِ تو در راہگذارے نہ
عشق است ایاغ تو بابندۂ محرم زن

میں اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی جگہ خون آلود دل کے ٹکڑے بہا رہا ہوں۔ تو میرے اس بدخشاں سے ہیرے چُن کر اپنی انگوٹھی میں جڑ لے یعنی میں نے تجھے حقائق و معارف قرآنی سے آگاہ کر دیا ہے اب تیرا فرض یہ ہے کہ تو میری تعلیم کو حرزِ جان بنائے تاکہ دنیا اور دین دونوں میں سربلندی حاصل کر سکے۔

لختِ دل پر خونے از دیدہ فرو ریزم
لعلے زبدخشانم بردار و بخاتم زن
(ص ۷۶۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ جوشیلے اور موسیقی سے بھرپور اشعار ملاحظہ ہوں، فرماتے ہیں کہ :

اے سوئے ہوئے غنچے نرگس بینا کی طرح اٹھ کھڑا ہو۔ ہمارا گھر غموں کے حملے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا اٹھ کھڑا ہو۔ باغ کے پرندے کی آہ و فریاد اور اذان کی آواز سے اُٹھ کھڑا ہو۔ دردِ دل رکھنے والوں کے سوزش انفاس سے اٹھ کھڑا ہو۔ گہری نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔

اے غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن، از بانگِ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفسان خیز
از خواب گراں خواب گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز

سورج نے سحر کی پیشانی پر ٹیکہ سجایا اور اپنے خونِ جگر سے اس کے کان میں بالا پہنایا۔ دشت و صحرا سے قافلوں نے رختِ سفر باندھا۔ اے دنیا کو دیکھنے والی آنکھ رکھنے والے تو بھی دنیا کے دیدار کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔ خوابِ غفلت سے اٹھ کھڑا ہو۔

خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست
آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
از دشت وجبل قافلہ ھا رختِ سفر بست
اے چشم جہاں بیں بہ تماشاے جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز

سارا مشرق راستے کے گرد و غبار کی طرح ہے یہ ایک ایسی فریاد کی طرح ہے جو چیختے چیختے خاموش ہو گئی ہے اور ایک بے اثر آہ کی طرح ہے۔ اس خاک کا ہر ذرہ کسی کی نگاہ کا اسیر ہے۔ ہندوستان سے، سمرقند سے، عراق سے اور ہمدان سے اٹھ کھڑا ہو۔ گہری نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔

خاور ہمہ مانند غبارِ سر راہے است
یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرۂ این خاک گرہ خوردہ نگاہے است

از ہند و سمرقند و عراق و ہمدان خیز
از خواب گراں خواب گراں خوابِ گراں خیز
از خواب گراں خیز

تیرا دریا طلاطم امواج سے بے نیاز ایک پر سکون صحرا کی مانند ہے جس میں وقت کی گزران کے ساتھ اضافہ نہیں ہوا بلکہ کمی ہوئی ہے اور یہ طوفانوں اور مگرمچھ سے بیگانہ ہے لہذا تو اس کے چاک سینے سے متحرک موج کی طرح اٹھ کھڑا ہو۔ گہری نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔

دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست
دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد وکاست
بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست
از سینۂ چاکش صفتِ موجِ رواں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

یہ نکتہ چھپے ہوئے بھیدوں کو ظاہر کرتا ہے کہ ملک جسم ہے اور دین اس کی جان ہے اور جسم اور جان اپنے ربط کی وجہ سے ہی زندہ رہتے ہیں لہذا تو گدڑی، جانماز، تیر اور تلوار لئے اٹھ کھڑا ہو۔ گہری نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔

این نکتہ کشایندۂ اسرارِ نہان است
ملک است تنِ خاکی و دیں روحِ روان است
تن زندہ و جان زندہ ز ربط تن و جان است
باخرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خواب گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

اللہ کی ازلی امانت کا تو امین ہے۔ تو کائنات کے مالک کا دست وبازو ہے۔ اے خاکی بندے تو ہی زمان ہے اور تو ہی زمین ہے یقین کی شراب پی جا اور گمان کے بُت خانے سے اٹھ کھڑا ہو۔ گہری نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہان را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی

صہبائے یقین در کش و از دیرِ گمان خیز
از خواب گراں خواں گراں خواب گراں خیز
از خوابِ گراں خیز

انگریز اور ان کی دلآویزی سے فریاد ہے ان کی دغابازی اور محبوبیت سے فریاد ہے۔ ان کے ظلم و ستم سے سارا جہان ویران ہو گیا ہے۔ اے حرم کے معمار اٹھ اور اس جہان کی تعمیر نو کر۔ گہری نیند سے اٹھ کھڑا ہو۔

فریاد ز افرنگ و دلآویزی افرنگ
فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ
معمارِ حرم بازبہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز
(ص۴۷۵ تا ۴۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا آیۂ تسخیر کس کی شان میں نازل ہوئی؟ یہ کائنات کس کی عظمت شکوہ اور علو مرتبت پر حیران ہے؟ علم الاسماء کے اسرار سے کون آگاہ تھا؟ تیرا عاشق کون تھا اور تیرے عشق کی شراب سے پیدا ہونے والی مستی کسے حاصل تھی؟ تو نے تمام مخلوقات میں کس کو اشرف قرار دیا اور کسے راز دروں سے آشنا کیا؟ تیرے تیروں نے اگرچہ ہمارے سینے چھلنی کر دیئے لیکن تو نے کبھی سوچا کہ حرفِ ادعونی (یعنی تم مجھے پکارو) کس نے کہا اور کس سے کہا؟ تیرا دیدار ہی میرا ایمان ہے اور میرے لئے قرآن کا درجہ رکھتا ہے تو پھر تو نے مجھے اپنے جلووں سے محروم کیوں کر رکھا ہے حالانکہ سورج کی سینکڑوں شعاعوں کے نقصان سے سورج کے سرمائے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان خیالات کے اظہار کے لئے مترنم اور جوشیلے الفاظ ملاحظہ ہوں:

آیۂ تسخیر اندر شان کیست؟
این سپہر نیلگوں حیران کیست؟
رازدانِ علم الاسما کہ بود؟
مست آن ساقی و آن صہبا کہ بود؟
برگزیدی از ہمہ عالم کرا؟
کردی از راز دروں محرم کرا؟

اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سفت
حرفِ ادعونی کہ گفت و باکہ گفت ؟
روے تو ایمان من، قرآنِ من
جلوۂ داری دریغ از جانِ من
از زیانِ صد شعاعِ آفتاب
کم نمی گردد متاعِ آفتاب
(ص ۵۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے قوم عرب! خدا کرے تمہارا ملک قیامت تک باقی رہے ذرا یہ تو بتاؤ کہ کس قوم نے دنیا میں سب سے پہلے ملوکیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا یعنی کس قوم نے دنیا کو ملوکیت کی لعنت سے پاک کیا؟ کس قوم نے قیصر اور کسریٰ کی سطوت کو خاک میں ملادیا؟ دنیا میں سب سے پہلے کس قوم نے قرآن حکیم کی تلاوت کی؟ یعنی اللہ کا کلام سب سے پہلے کس قوم نے دنیا والوں کو سنایا؟ کارکنان قضاو قدر نے کس قوم کو کلمۂ توحید سے آشنا کیا؟ اور توحید کا چراغ کس ملک میں روشن کیا؟ دنیا میں جس قدر علوم وفنون آج مروج ہیں یہ سب کس قوم کے دستر خوان کے ریزہ خوار ہیں۔ اور یہ آیت کہ :

اذ کنتم اعدا فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا.

اور یاد کرو احسان کو جو اس نے تم پر کیا جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی جس کی بدولت تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

کس کی شان میں نازل ہوئی ؟

ان خیالات کے اظہار کے لئے جوش وخروش سے بھرپور اور گنگناتے ہوئے الفاظ ملاحظہ ہوں :

اے درو دشتِ تو باقی تا ابد
نعرۂ لاقیصر وکسریٰ کہ زد ؟
درجہان نزد و دورودیر و زود
اولین خوانندۂ قرآن کہ بود ؟
رمز الا اللہ کرا آموختند ؟
این چراغ اول کجا افروختند ؟

علم و حکمت ریزۂ از خواں کیست؟
آیہ فاصبحتم اندر شان کیست؟
(ص ۸۳۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :

مسلمان فاقوں کا شکار ہے اور فقیروں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے اور اسی حالت میں مست بھی ہے جس کی بدولت انسان ہی نہیں فرشتے بھی اس پر ماتم کناں ہیں۔ اے خدا تو ایک نئی ملت کی بنیاد رکھنے میں میری مدد فرما کیونکہ یہ قوم اپنے انہی اعمال کی وجہ سے دنیا کے لئے بوجھ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان خیالات کی ادائیگی کے لئے الفاظ کا جوش اور موسیقی ملاحظہ ہو :

مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است
زکارش جبرئیل اندر خروش است
بیا نقش دگر ملت بریزیم
کہ این ملت جہان را بارِ دوش است
(ص ۸۹۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا میرے کلام کی تاثیر سے اس دنیا میں ہنگامہ برپا کر دے اور اس ہنگامے کی بدولت زمین و آسمان کو تہ و بالا کر کے رکھ دے تو نفع و نقصان کی سوچ بچار کرنیوالے انسان کو ختم کر کے ہماری مٹی سے ایک نیا انسان پیدا کر جو علائق دنیوی سے یکسر آزاد ہو اور تیری تعلیمات پر عمل پیرا ہو۔ اس مضمون کے اظہار کے لئے الفاظ کا ترنم اور شکوہ ملاحظہ ہو :

زمن ہنگامۂ دہ این جہان را
دگرگوں کن زمین و آسمان را
زخاکِ ما دگر آدم بر انگیز
بکش این بندۂ سود و زیان را
(ص ۸۹۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

۸۔ قریب الفہم تشبیہات اور استعارات کا استعمال

علامہ اقبال کے براہِ راست مخاطب اگرچہ مسلمان تھے لیکن ان کا پیغام پورے عالمِ انسانیت کے لئے تھا جس کے اظہار کے لئے اگر وہ گنجلک پیرایہ استعمال کرتے تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے یعنی اپنے افکار کو ہر کس و نا کس تک نہ پہنچا پاتے لہٰذا انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے نہ صرف عام فہم الفاظ استعمال کیے بلکہ قریب الفہم تشبیہات و استعارات بھی استعمال کئے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ :

تو اپنی مُٹھی بھر خاک کو پراگندہ نہ کر۔ خودی اور خودداری کا تقاضا یہ ہے کہ چاند کی طرح اپنے پہلو کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر رزق کا سامان کرتا رہ :

مشتِ خاک خویش را از ہم مپاش
مثلِ مہ رزقِ خود از پہلوِ تراش
(ص ۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں روزی کے لئے اپنا پہلو کاٹنے کو بدر بننے کے بعد چاند کے برابر گھٹنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رزق ذاتی جدوجہد سے حاصل کیا جائے نہ کہ غیروں کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔

اسرار خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مردِ مومن! تو آگ ہے زمانے کی محفل کو جگمگا دے جس جلن سے تو خود جل رہا ہے اُسی سے دوسروں کو بھی جلا کر راکھ کر دے۔

آتش استی بزمِ عالم برفروز
دیگراں را ہم ز سوزِ خود بسوز
(ص ۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں علامہ اقبال نے اپنے آپ کو استعارتاً آگ قرار دیا ہے جو نور اور حرارت کے ساتھ ساتھ جلنے جیسے وصف کی بھی حامل ہوتی ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں اس دنیا میں خنجر کی طرح سخت کوش ہوں کیونکہ میں بھاری پتھر سے آب حاصل کرتا ہوں۔ یعنی مصائب بھری زندگی میری فکر کو جلا بخشتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے خنجر کو سنگِ گراں پر تیز کیا جائے تو اس کی دھار بھی تیز ہوتی ہے اور آب و تاب بھی بڑھتی ہے۔

سخت کوشم مثلِ خنجر درجہاں
آبِ خود می گیرم از سنگِ گراں

(ص ۸۲ کلیاتِ اقبا ل فارسی)

علامہ اقبال نے یہاں اپنے آپ کو ایک سخت کوش خنجر سے تشبیہہ دی ہے جو پتھر پر رگڑ کھا کر اپنے لئے آب و تاب حاصل کرتا ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں سمندر ہوں لیکن میری موجوں میں کوئی بے قراری نہیں اور میرے ہاتھ میں بھنور کا کاسہ نہیں :

گرچہ بحرم موجِ من بے تاب نیست

برکفِ من کاسۂ گرداب نیست

(ص ۸۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

گرداب کی شکل بظاہر گول ہوتی ہے۔ اس لئے اسے استعارۃً کاسہ قرار دیا گیا ہے۔ کاسہ بھیک مانگنے کی دلیل ہے اسی لئے فرمایا ہے کہ میں سمندر تو ہوں لیکن عام سمندر کی طرح میرے ہاتھ میں کاسہ نظر نہیں آئے گا خواہ وہ گرداب کا ہی کیوں نہ ہو۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کارکنانِ قضاو قدر نے جذبۂ عشق میری سرشت میں داخل کر کے مجھے بادِ نسیم کی طرح آوارہ مزاج بنادیا اور میرے دل کو جدائی کے صدموں سے پھول کی مانند صدپارہ کر دیا۔ میری نگاہ کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ظاہر یعنی اس کائنات کو بھی نہیں دیکھ سکتی لیکن عشق کا کمال دیکھو کہ مجھے لذتِ دیدار کا شہید بنادیا گیا :

مرا مثلِ نسیم آوارہ کردند

دلم مانندِ گل صد پارہ کردند

نگاہم را کہ پیدا ہم نہ بیند

شہیدِ لذت نظارہ کردند

(ص ۲۴۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے یہاں اپنی آوارگی کو بادِ نسیم کی آوارہ مزاجی سے تشبیہہ دی ہے اور دل کو اپنی صدپارگی کی بدولت پھول کی مانند قرار دیا ہے جو سینکڑوں پتیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس بستانسرا یعنی دنیا سے دل نہیں لگایا اور اس کے علائق سے آزاد رہا۔ صبح کی ہوا کی طرح تھوڑی دیر کے لئے گھوما پھرا اور پھولوں کو تروتازگی دے کر واپس چل دیا :

نہ پیوستم درین بستانسرا دل

زبند این و آن آزادہ رفتم

چو باد صبح گردیدم دمے چند
گلاں را آب و رنگے دادہ رفتم
(ص ۲۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے یہاں دنیا کے لئے بستانسرا کا استعارہ استعمال کیا ہے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ انسان ہستی کی تلاش میں موج کی طرح تڑپ رہا ہے لیکن جس طرح پانی کی سطح سے بلند ہونے کے باوجود موج کا رشتہ پانی سے منقطع نہیں ہوتا یعنی وہ کمر تک اپنی اصل یعنی پانی کا حصہ رہتی ہے گویا نیستی کا شکار رہتی ہے اُسی طرح انسان بھی کمر تک نیستی کا شکار ہے۔ یعنی خدائے واحد اگر سمندر ہے تو انسان اس سمندر کی ایک موج ہے جس سے بلند ہو کر وہ لاکھ اپنے ہونے کا اظہار کرنا چاہے کلی طور پر اپنے آپ کو اس سے منقطع نہیں کر سکتا کیونکہ اس نے بہر حال ایک دن اُسی ذاتِ مطلق میں فنا ہو جانا ہے:

چو موج می تپد آدم بجستجوئے وجود
ہنوز تابہ کمر درمیانۂ عدم است
(ص ۴۸۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں انسان کو موج سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ اور موج علامہ اقبال کی ایک محبوب علامت ہے جو پانی کی سطح سے اس لئے بلند ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہونے کا ثبوت دینا چاہتی ہے علامہ اقبال بھی مردِ مومن سے اسی بات کے خواہاں ہیں کہ وہ اپنی خودی مضبوط کرے اور موج کی طرح اپنے ہونے کا ثبوت دے اور انسان یقیناً اسی کوشش میں مصروف بھی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ موج کی طرح کلی طور پر اپنا رشتہ اپنی اصل سے منقطع نہیں کر سکتا۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو اس دنیائے رنگ و بو کو پوشیدہ یا بالفاظِ دگر سراب قرار دے رہا ہے جبکہ یہ دکھائی دیتی ہے یعنی حقیقتاً موجود ہے اور ایک ایسا ساز ہے جس کے لئے تو بمنزلہ مضراب ہے لہذا تو اپنے آپ کو اس کے تاروں پر بجا یعنی یہ دنیا تیرے لئے تخلیق کی گئی ہے لہذا تو اس سے حتی الامکان استفادے کی کوشش کر۔

جہانِ رنگ و بو پیدا تو می گوئی کہ راز است این
یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است این
(ص ۵۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں ساز استعارہ ہے دنیا سے کیونکہ جس طرح ساز میں بے شمار سُر ہوتے ہیں اسی طرح دنیا میں بے شمار رنگ ہوتے ہیں اور مضراب استعارہ ہے انسان سے کیونکہ جس طرح مضراب ساز میں چھپے مختلف سُروں کو بیدار کرتا ہے اُسی طرح ہر انسان دنیا کی رنگینیوں سے مختلف انداز سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آسمان پر ستاروں کا ہجوم ہے لیکن ہر ستارہ دوسرے ستارے کے مقابلے میں زیادہ تنہا ہے اور ہماری طرح بے بسی اور نیلے آسمان میں آوارگی کا شکار ہے :

گرچہ برگردوں ہجوم اختر است
ہر یکے از دیگرے تنہا تر است
ہر یکے مانندِ ما بیچارہ است
در فضائے نیلگوں آوارہ است
(ص ۵۹۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے ان اشعار میں ستاروں کو ان کی تنہائی اور بے چارگی کے باعث انسان سے تشبیہہ دی ہے جو اپنے ہم نفسوں کے بے پناہ ہجوم میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص مادیات میں منہمک ہے اور یہ انہماک جس قدر زیادہ ہو گا اُسی قدر خود غرضی اور نفس پرستی کا رنگ غالب آئے گا۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ بندۂ حق یعنی مومن یا مجاہد شیر ہوتا ہے اور موت اس کے سامنے ہرن کا درجہ رکھتی ہے یعنی وہ موت پر اس طرح غالب آجاتا ہے جس طرح شیر ہرن پر غالب آجاتا ہے بالفاظ دگر وہ شہید ہو کر مرتا ہے اور شہادت کی موت موت نہیں ہوتی بلکہ ایک نئی اور بہتر زندگی کی ابتداء ہوتی ہے جبکہ بندۂ دنیا ہرن ہوتا ہے اور موت اس کے لئے شیر کا درجہ رکھتی ہے جو اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے جبکہ یہی موت مردِ مومن کی زندگی کے مقامات میں سے ایک مقام کا نام ہے۔

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ
(ص ۷۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں علامہ اقبال نے مردِ مومن کے لئے شیر اور موت کے لئے ہرن کو استعارۃً استعمال کیا ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب تو کب تک سمندر میں تنکے کی مانند جئے گا تجھے چاہئے کہ اپنے نفس پر قابو پا کر پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جا :

زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چون کوہ از ضبطِ نفس
(ص ۸۳۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں علامہ اقبال نے مردِ مسلمان کو تنکے سے تشبیہہ دی ہے اور اسے پہاڑ کی طرح مضبوط بننے کی ترغیب دی

ہے۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اپنے اندر محبت الٰہی کا رنگ پیدا کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگرچہ بظاہر تم ذرّے کی طرح حقیر ہو لیکن محبت الٰہی کی بدولت تم میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ تم کائنات پر حکومت کر سکو گے :

از مقام ذوق و شوق آگاہ شو

ذرۂ صیاد مہر و ماہ شو

(ص ۸۵۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں علامہ اقبال نے مسلمانوں کو استعارۃً ذرّہ کہا ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشاق کا حال مت پوچھو کیونکہ اُن کی کیفیت لفظوں کے ذریعے بیان نہیں کی جا سکتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محبوب کو مقصدِ حیات بنا کر دنیاوی علائق سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ جب قافلے کی روانگی کا گھنٹہ بجتا ہے تو اُن کے اندر نیستان میں موجِ نسیم کے باعث پیدا ہونے والے ہنگامے کی مانند ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے :

مپرس از کاروانِ جلوہ مستاں

ز اسبابِ جہاں برکندہ دستاں

بجانشاں ز آوازِ جرس شور

چو از موجِ نسیمے در نیستاں

(ص ۹۰۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں علامہ اقبال نے عشاق کے دل میں اٹھنے والے طوفان کو نیستان میں موجِ نسیم کے باعث پیدا ہونے والے ہنگامے سے تشبیہہ دی ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا تیری دنیا اس وقت نااہلوں کے قبضے میں ہے، تیرے بندے ظالموں کے ستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں اور کارخانوں میں کام کرنے والا ہنرمند انسان اپنے آپ کو چند درندہ صفت لوگوں کے تعیش کے لئے قتل کر رہا ہے۔

جہانِ تُست در دستِ خسے چند

کسانِ او بہ بند ناکسے چند

ہنرور درمیان کارگاہاں

کُشد خود را بہ عیش کرگسے چند

(ص ۸۹۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے یہاں درندہ صفت لوگوں کے لئے کرگس کا لفظ استعارۃً استعمال کیا ہے جن کے تعیش کے لئے ہنرور طبقہ اپنے آپ کو ختم کئے جارہا ہے۔



۹۔ اخلاقیات اور پند و موعظت

علامہ اقبال کے فکر و فن کی جولا نگاہ تمام عالم انسانیت خصوصاًامت مسلمہ تھی جو غلامی، رسوائی اور مصائب و آلام کا شکار تھی۔ لہذا اگر وہ ایک طرف اسلاف کے کارناموں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے اور زندگی کے حقائق پر نظر رکھتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگی چاہتے تھے تو دوسری طرف احیائے اسلام کے بھی آرزومند تھے جو حیات و کائنات کی ازلی اور ابدی صداقتوں کا نام ہے اسی لئے ان کی شاعری پند و نصائح سے بھر پور دکھائی دیتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! تو قرآن مجید کی حکمت کا امانت دار ہے جس وحدت کو کھو بیٹھا ہے اسے پھر حاصل کرنے کی کوشش کر کیونکہ اول تو قرآن مجید کی حکمت کا درس یہی ہے دوسرا جب تک مسلمان متحد نہ ہوں گے اس امانت کا حق ادا نہیں کر سکتے جو حکمت قرآن کی شکل میں ان کے سپرد ہوئی :

اے امین حکمت ام الکتاب
وحدتِ گم گشتۂ خود بازیاب
(ص ۶۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ قال کو چھوڑ اور حال کا دروازہ کھٹکھٹا۔ یعنی صرف باتوں اور زبانی دعوؤں سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کے حکموں پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے۔ انسان عمل سے کبھی دور نہیں رہ سکتا لیکن جو عمل خدا کی رضا کے خلاف ہو گا وہ سراسر تاریک اور سیاہ ہو گا۔ فرماتے ہیں کہ حق کے نور سے عملوں کی یہ ظلمت دھو ڈال یعنی ہر عمل خدا کی رضا کے تابع رکھ :

قال را بگذار و بابِ حال زن
نورِ حق بر ظلمتِ اعمال زن
(ص ۶۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو کیوں غم کے قید خانے میں جکڑا بیٹھا ہے رسولؐ کی بارگاہ سے لاتحزن کا سبق حاصل کر :

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیم لا تحزن بگیر
(ص ۹۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ حالات کتنے ہی ناموافق ہو جائیں انسان کو کبھی غمگین نہیں ہونا چاہئے۔

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ پیرِ مغان نے جس قدر شراب کشید کرنی تھی کر چکا۔ انگور کی

بیل میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں اقسام کی شراب پوشیدہ ہے جس کا مزہ تم نے ابھی تک نہیں چکھا۔ بے شک یہ چمن یعنی دنیا بہت دلکش مقام ہے لیکن تم غنچے کی طرح زندگی مت گزارو کہ ہوا کا ایک جھونکا اس کی پتیوں کو منتشر کر دیتا ہے۔ اگر تم زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہو تو کبھی بھی کسی ایسے دل کی تلاش یا حصول کی کوشش مت کرو جو آرزو کی نعمت سے محروم ہو۔ پہاڑ کی طرح مجتمع اور مضبوطی سے زندگی بسر کرو۔ خس و خاشاک کی طرح مت جیئو کیونکہ ہوا تیز ہے اور شعلہ بے باک ہے یعنی مخالف عناصر تمہارے خاتمے پر تلے ہوئے ہیں :

گمان مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است
چمن خوش است و لیکن چو غنچہ نتواں زیست
قبائے زندگیش از دم صبا چاک است
اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوے و مگیر
دلے کہ از خلشِ خار و آرزو پاک است
بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است
(ص ۲۶۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے انسان! تو کب تک ذلت کی زندگی بسر کرتا رہے گا اور چیونٹیوں کی طرح زمین میں اپنا گھر بناتا رہے گا۔ اُڑان کی صلاحیت پیدا کر اور شاہین کی سی زندگی بسر کرنا سیکھ لے تو کب تک زمین پر اپنا رزق تلاش کرتا رہے گا یعنی مادیات سے بالاتر نہیں ہوگا :

قبائے زندگانی چاک تا کے؟
چو موراں آشیاں در خاک تا کے؟
بہ پرواز آ و شاہینی بیآموز
تلاش دانہ در خاشاک تا کے؟
(ص ۲۴۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مومن! شاید تجھے علم نہیں لیکن تو چمکتے ہوئے سورج سے بھی زیادہ درخشاں ہے لہذا تو اس طرح زندگی گزار کہ ہر ذرے تک تیری روشنی پہنچے۔ مراد یہ کہ خدا نے تجھے بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے لہذا تو ان سے آگاہی حاصل کر۔ ان میں نکھار پیدا کر۔ اور ان کے توسط سے ہر ہم نفس کو فیض پہنچا :

تو فروزندہ تراز مہرِ منیر آمدۂ
آنچناں زی کہ بہ ہر ذرہ رسانی پر تو
(ص ۵۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبور عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! تو اس دنیا سے زمانے کی طرح گزر یعنی جس طرح زمانہ دنیا کو اپنے پاؤں تلے روندتا ہوا گزر جاتا ہے تو بھی اپنے ہر سانس سے اسے تہ وبالا کر کے رکھ دے:

بہر نفس کہ بر آری جہان دگر گوں کُن
درین رباط کہن صورت زمانہ گزر
(ص ۴۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! اس موت سے اجتناب کر جو قبر سے موافقت کر لے یعنی تجھے ابدی نیند سلا دے۔ ایسی موت حیوانات کی موت ہوتی ہے۔ مردِ مومن تو خدا سے اس موت کا طلبگار ہوتا ہے جو اسے دوبارہ زندگی عطا کرے اور وہ موت منزلِ عشق کی انتہا یا محبت کی آخری منزل ہے یعنی شہادت فی سبیل اللہ یا اللہ کی راہ میں سر کٹانا، میدانِ جنگ میں اللہ اکبر کہہ کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑنا اور جامِ شہادت نوش کرنا۔

بگذر از مرگے کہ سازد بالحد
زانکہ این مرگ است مرگِ دام و دو
مردِ مومن خواہد از یزدان پاک
آن دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آن دگر مرگ انتہاے راہِ شوق
آخرین تکبیر درجنگاہِ شوق
(ص ۷۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ حکمت یا علم ودانش کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے۔ لہذا اے مخاطب! تجھے جہاں کہیں یہ نعمت ملے اسے حاصل کر لے:

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا این خیر را بینی بگیر
(ص ۶۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں حکمت یعنی علم ودانش سے علامہ اقبال کی مراد تمام انفس وآفاق کا علم اور ایسی سمجھ بوجھ ہے جس کی بدولت انسان

اخلاقِ اراذل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کو اپنا رہنما بنا کر اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا کر سکے جبکہ خیرِ کثیر انتہائی نافع، قیمتی اور مفید چیز یا بالفاظ دگر نعمتِ عظمیٰ کو قرار دیا ہے۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! حق تعالیٰ کے احکام کی پابندی کر اور اس کی رحمت سے ناامید مت ہو۔ اپنی خودی کی مخفی طاقتوں کو آشکار کر تا کہ یہ کائنات تیری مطیع ہو جائے۔

اے مسلمان جز بہ راہِ حق مرو
نا امید از رحمت عامے مشو
پردہ بگذار آشکارائی گزین
تابہ لرزد از سجود تو زمین

(ص ۸۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ سمندر صاحب قوت ہے اس لئے دشت و در سے برسرِ پیکار رہتا ہے لہذا تو اگر سمندر ہے یعنی صاحبِ قوت ہے تو باطل کے خلاف صف آرائی کر۔ اسی طرح شبنم ضعیف ہے طاقت پیکار نہیں رکھتی مگر غنچوں کو نفع پہنچاتی ہے لہذا تو اگر شبنم ہے یعنی ضعیف ہے تو بنی آدم کو راحت پہنچانے کی کوشش کر یہ سچ ہے کہ کمزور آدمی جنگ نہیں کر سکتا مگر دوسروں کی خدمت ضرور کر سکتا ہے۔

قلزمی، بادشت و درپیہم ستیز
شبنمی، خود را بہ گلبرگے بریز

(ص ۸۰۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ایک مگر مچھ نے اپنے بچے سے کتنی اچھی بات کہی کہ ہمارے مذہب میں ساحل کی زندگی حرام ہے۔ لہذا تو موجوں سے ٹکرا اور ساحل سے دور رہ کیونکہ ہمارا ٹھکانہ دریا ہے ساحل نہیں۔

نہنگے بچۂ خود را چہ خوش گفت
بہ دینِ ما حرام آمد کرانہ
بہ موج آویز و از ساحل بپرہیز
ہمہ دریاست مارا آشیانہ

(ص ۹۸۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ دنیا کا سمندر اگر تلاطم سے آسودہ ہو جائے یعنی اگر دنیا میں مصائب اور مشکلات کا وجود باقی نہ رہے تو یہی دنیا انسان کے حق میں موت کا پیغام بن جائے گی کیونکہ جب جدوجہد ختم ہو جائے گی تو انسانی ترقی بھی رُک جائے گی۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے انسان زمانے کے ظلم و ستم کی شکایت ترک کر دے اور یاد رکھ کہ جو شخص دنیا کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کرتا وہ اپنی خودی کو کبھی مستحکم نہیں کر سکتا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ چشمے کا پانی جب پتھروں سے ٹکراتا ہے تو حسین معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح مردِ مومن جب مصائب سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی خودی میں حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔

گلہ از سختیِ ایّام بگذار
کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است
نمی دانی کہ آبِ جویباراں
اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است
(ص ۹۹۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی، دکتر محمد ریاض، ص ۲۰

۲۔ایضا،ص

۳۔شاہنامہء فردوسی،پادشاھی کیکاؤس،بیت ۴۱۰

۴۔دیوان حکیم قطران تبریزی،بسعی واہتمام محمد نخجوانی،چاپخانہء شفق تبریز،۱۳۳۳ھ ش ص ۲۰۹

۵۔دیوان اُستاد منوچہری دامغانی،بکوشش محمد دبیر سیاقی،چاپخانہء پاکت چی تہران،

۱۳۲۶خورشیدی، ص ۱۳۸

۶۔ تاریخ ادبیات در ایران، ج ۱،دکتر ذبیح اللہ صفا،انتشارات فردوس،تہران،چاپ دوازدہم،

۱۳۷۱،ص ۳۸۵

۷۔دیوان حکیم عنصری،چاپ دورہء قاجاریہ،ص ۱۸۱

۸۔ تاریخ ادبیات در ایران، ج ۱،دکتر ذبیح اللہ صفا، ص ۳۸۵

۹۔دیوان استاد منوچہری دامغانی،ص ۶

۱۰۔ تاریخ ادبیات در ایران، ج ۱،دکتر ذبیح اللہ صفا، ص ۳۹۲

۱۱۔شاہنامہء فردوسی،داستان دوازدہ رخ،بیت ۱۶۹۶

۱۲۔دیوان حکیم فرخی سیستانی،ص ۹۰

۱۳۔شاہنامہء فردوسی،داستان سہراب،بیت ۱۶۲۲

۱۴۔چہار مقالہ،نظامی عروضی سمرقندی،باھتمام دکتر محمد معین،انتشارات امیر کبیر تہران،

۱۳۶۶،ص ۵۲

۱۵۔ مقاماتِ اقبال' ڈاکٹر سیّد عبداللہ' لاہور اکیڈمی لاہور' ۱۹۶۴ء' ص ۹۶
۱۶۔ تاریخِ ادبیات در ایران' ج ۱' دکتر ذبیح اللہ صفا' ص ۴۵۱
۱۷۔ مقاماتِ اقبال' ڈاکٹر سیّد عبداللہ' ص ۹۷
۱۸۔ دیوان عنصری' مطبع منشی نولکشور' ۱۹۲۲ء' ص ۹۸
۱۹۔ دیوان حکیم فرخی سیستانی' ص ۱۷۵
۲۰۔ شاہنامہء فردوسی' داستان دوازدہ رخ' بیت ۲۴۰۳
۲۱۔ ایضاً' داستان پادشاھئی منوچہر' بیت ۴۰۲
۲۲۔ اقبال کامل' مولانا عبدالسلام ندوی' مطبع معارف' اعظم گڑھ' ۱۹۴۸ء ص ۲۳۰' ۲۳۱
۲۳۔ نقوشِ اقبال' مولوی شمس تبریز خان' ترجمہ روائح اقبال از مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی' مجلس نشریات اسلام' کراچی' ۱۹۸۸ء' ص ۲۹۵' ۲۹۶
۲۴۔ مسائلِ اقبال' ڈاکٹر سیّد عبداللہ' اُردو اکیڈمی لاہور' ۱۹۸۷ء' ص ۲۰۱
۲۵۔ ایضاً' ص ۲۰۱
۲۶۔ تنویرِ اقبال' ڈاکٹر عبدالمغنی' مکتبہء تعمیر انسانیت' لاہور' ۱۹۹۰ء' ص ۱۹۸' ۱۹۹
۲۷۔ موازنہ انیس و دبیر' شبلی نعمانی' مرتبہ سید عابد علی عابد' مجلس ترقی ادب لاہور' ۱۹۶۴' ص ۲۸
۲۸۔ کلیاتِ اقبال اُردو' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۹۰ء' ص ۴۱
۲۹۔ تنویرِ اقبال' ڈاکٹر عبدالمغنی' ص ۲۰۰' ۲۰۱

باب سوّم

سبکِ عراقی

سبکِ عراقی اور اس کی خصوصیات

یہ اس طرزِ نو کا نام ہے جو سبکِ خراسانی کے بعد عراق و اصفہان و تبریز کے شعراء نے ایجاد کی۔ ڈاکٹر محمد ریاض سبک عراقی کی ابتداء کے متعلق لکھتے ہیں :

> ''مقصود از ''عراق'' در ''سبکِ عراقی'' عراق عجم است (ری و اصفہان تا آذر بائیجان) و این سبک را سبک فارسی (فارسی مرادف شیراز) نیز گفتہ اند۔ سبک عراقی دلآویز ترین سبک ہای فارسی است کہ از اواساط قرن ہفتم تا اواخر قرن دہم ہجری در سایر نقاط قلمرو فارسی بویژہ در ایران ادامہ یافتہ است چون در ''عراق عجم'' و ''فارس'' (قرنھای ہفتم و ہشتم ہجری) استادان کم نظیر شعر فارسی مانند رومی و عراقی و سعدی و امیر خسرو و خواجو کرمانی و حافظ و غیر ہم وجود داشتہ اند، لذا این سبک را این چنین موسوم ساختہ اند'' (۱)

لیکن اس طرز کی ابتداء دفعتاً نہیں ہوتی۔ غزنویوں کے آخری دور اور سلاجقہ اول کے زمانے میں کئی شاعر ایسے تھے جو رودکی، فرخی، عنصری وغیرہ کی پیروی کے باوجود ایک خاص دائرے میں اپنی خاص روش بھی پیدا کرتے رہے اسی طرح سلجوقی دور کے نصف دوم میں بھی بعض شعراء دور غزنوی کی روش کا بدستور تتبع کرتے رہے لیکن بعض باتوں میں الگ بھی دکھائی دیتے تھے مثلاً امیر معزی ادیب صابر اور جمال الدین اصفہانی جن کے قصائد کی تشبیب میں تغزل کا رنگ بہت نمایاں تھا اور اسی تغزل کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز بھی رہے۔ رموزِ عشق بیان کرنے میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا اور وہ جو کچھ کہتے اس میں ان کی قلبی واردات کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا۔ انہوں نے قصیدے کی تشبیب کو موجودہ غزل سے قریب تر کیا اور تشبیب کے لئے ایسے الفاظ و تراکیب استعمال کئے جو صرف غزل کے لئے ہی موزوں تھے امیر معزی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

اگرچہ خرمئی ہر کس از بہار بود
ہمیشہ خرمئی من ز روی یار بود
بجویبار شوم پیش سرو سجدہ کنم
اگرچہ قامت او سرو جویبار بود
بنفشہ گرچہ بدیع است ازو چہ اندیشد
کسی کہ بستۂ آن زلفِ تابدار بود (۲)

اسی طرح عمر خیام کی رباعیات اور ناصر خسرو کی مثنویاں اور قصیدے شاعری کے مروجہ موضوعات سے ہٹ کر فلسفیانہ اسرار ورموز، اخلاق، پندو موعظت، عقل ودانش اور دینی مسائل پر مبنی تھے۔ خاقانی، نظامی گنجوی اور جمال الدین اصفہانی کے اکثر قصائد اور قطعات کا موضوع بھی فلسفہ واخلاق ہی رہا اور انوری نے بھی فلسفہ، حکمت، ریاضی اور علم ہیئت کے نکات کو شعروں کے پیکر میں سمو کر قصائد کو ممدوح کی تعریف و توصیف تک محدود نہ رہنے دیا بلکہ انہیں مختلف علمی مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا مثلاً

تو اگر شعر نگویی چکنی خواجہ حکیم
لی وسیلت نتوانی کہ بدرہا پویی
من اگر شعر نگویم پی کاری گیرم
کہ خلاصی دہد از جاہلی و بد خویی
من ہمہ شب ورق زرق فرو می شویم
تو ہمہ روز رخ آز بخون می شویی
قیمت عمر من و عمر تو یکسان نبود
کانچہ من جویم از این عمر تو آن کی جویی
باد رنگین بدل عمر کہ در خانہ نہد
بوی آن می برم الحق تو ہمانا اویی
ضایع از عمر من آنست کہ شعری گویم
حاصل از عمر تو آنست کہ شعری گویی (۳۰)

ابو سعید ابوالخیر اور حکیم سنائی نے تصوف کو پہلی مرتبہ شاعری کا موضوع بنایا۔ ابو سعید نے اپنے عارفانہ تاثرات رباعیات میں پیش کئے لیکن ان کا کلام تصوف کی کوئی باقاعدہ اور مستقل تصنیف نہ تھی اس کے برعکس حکیم سنائی کی تمام مثنویاں تصوف کے اسرار ورموز کے متعلق باقاعدہ تصنیف تھیں حکیم سنائی کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

مکن در جسم و جان منزل کہ این دون است و آن والا
قدم زین ہر دو بیرون نہ، نہ اینجا باش و نہ آنجا
بہ ہر چہ از راہ دور افتی چہ کفر آن حرف وچہ ایمان
بہ ہر چہ از دوست و امانی چہ زشت آنجا وچہ زیبا
ترا دنیا ہمی گوید کہ دل در ما نہ بندی بہ

تو خود می پند ننیوشی ازین گویان نا گویا(۴)

غزنوی دور تک شاعری میں انہی حالات سے متاثر ہو کر جذبات نگاری کی جاتی تھی جو بڑی وضاحت سے شعراء کے سامنے ہوتے تھے لیکن نظامی نے جذبات کے ان دقیق اور عمیق پہلوؤں کو بھی بیان کیا جو عام نگاہوں سے او جھل تھے مثلاً

غمی دارم ہلاک شیر مردان
بر این غم چون نشاطم چیر گردان
ندارم طاقت این کورۂ تنگ
خلاصی دہ مرا چون لعل از سنگ
توئی یاری رس فریاد ہر کس
بفریاد من فریاد خوان رس
بہ آبِ دیدۂ طفلانِ محروم
بسوزد سینۂ پیران مظلوم
بداور داور فریاد خواہان
بیارب یارب صاحب گناہان
بمحتاجان در بر خلق بستہ
بمحرومان خون بر خون نشستہ
بدور افتادگان از جان و مانہا
بواپس ماندگان از کاروانہا
بنوری کز خلایق در حجابست
بانعامی کہ بیرون از حسابست
بہر طاعت کہ نزدیکت صوابست
بہر دعوت کہ پیشت مستجابست
کہ رحمی بر دل پُر خونم آور
وزین غرقاب غم بیرونم آور(۵)

خاقانی کے یہاں تخیل کی ابتدائی جھلکیاں دیکھنے کو ملیں انہوں نے اپنی شاعری میں ایسی تراکیب و تشبیہات بھی استعمال کیں جو سبک خراسانی میں بہت کم دکھائی دیتی تھیں اور مختلف علوم اور زبانوں کی ایسی اصطلاحات اور تلمیحات بھی استعمال کیں جن کو

سمجھنے کے لئے ان علوم اور زبانوں سے آگہی از حد ضروری ہے مثلاً :

تاخیال کعبہ نقش دیدۂ جان دید اند
دیدہ را از شوق کعبہ زمزم افشان دیدہ اند
عشق بر کردہ بہ مکہ آتشی کز شرق و غرب
کعبہ راہر ہفت کردہ ہفت مردان دیدہ اند
ماہ نو را شمہ قندیل عیسیٰ یافتہ
دجلہ را پر حلقۂ زنجیر مطران دیدہ اند
بر سر دجلہ گذشتہ تا مدائن خضر وار
قصر کسریٰ و زیارت گاہ سلمان دیدہ اند
پس بجوفہ مشہد پاک امیرالنحل را
ہم چو جیش نحل جوش انسی وجان دیدہ اند
راندہ از رحبہ دواسپہ تا منارہ یکسرہ
از سم گوران سر شیران ہراسان دیدہ اند (۶)

اسی طرح عبدالواسع جبلی نے اپنے کلام میں صنائع بدائع کا بکثرت استعمال کیا مثلاً :

چون شد از باد خزاں ای شمسۂ خوبان چین
باغ چون رویم برنگ و آب چون زلفت بچین
سوی کاشانہ خرام و عذر مستانہ مگوی
گرد پیمانہ بگرد و یار فرزانہ گزین
حبذا عشرت بروی دلبران غم گسار
فرخا نزہت بیاد دوستان راستین
گاہ نوشیدن بہ رغبت بادۂ لعلِ کہن
گہ نیوشیدن بعشرت نالۂ چنگ حزین (۷)

گویا سبک عراقی کی وہ خصوصیات جن کی ابتدائی جھلکیاں غزنوی اور سلجوقی دور کے مذکورہ بالا شعراء کے ہاں دکھائی دینے لگی تھیں مختصراً کچھ یوں تھیں :

۱۔ قصیدے کی تشبیب کو غزل سے قریب تر کیا گیا۔

۲۔ تصوف و عرفان کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔

۳۔ فلسفہ واخلاق، پند و موعظت اور عقل و دانش کی باتیں شاعری کا حصہ بنیں۔

۴۔ جذبات نگاری میں شدت آئی۔

۵۔ تخیل کا استعمال ہونے لگا۔

۶۔ علمیت کا اظہار ہونے لگا۔

۷۔ اور شاعری کی فنی خوبیوں کی طرف دھیان دیا گیا۔

اور یہی وہ خصوصیات تھیں جو سبکِ عراقی کے عروج کے زمانے میں زیادہ نکھر کر سامنے آئیں۔

سبکِ عراقی کے عروج کا زمانہ تاتاری اور تیموری حملوں کا زمانہ تھا۔ ساتویں صدی ہجری کی پہلی چوتھائی میں جب وسط ایشیا میں چنگیز خان کی بڑھتی ہوئی طاقت کی شہرت آگ کی طرح پھیل رہی تھی ایران میں علاؤالدین خوارزم شاہ حکمران تھا۔ چنگیز خان جلد ہی ایران پر حملہ آور ہوا۔ علاؤالدین اور اس کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین نے اگرچہ چنگیز خان کا انتہائی دلیری سے مقابلہ کیا لیکن بالآخر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ چنگیز خان کے بعد ہلاکو خان نے ایران کا رخ کیا اور آگ و خون کے وہ طوفان بپا کیے جو چنگیز خان کے طوفانوں سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔ چنگیز خان اور ہلاکو ہر دو کی بربریت کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کا خون بہا۔ شہروں کے شہر پیوند زمین ہوئے۔ مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ بڑے بڑے قدیم علمی ذخیرے ورق ورق کر کے اُڑا دیئے گئے او عالم اسلام ایک بہت بڑے حادثے سے دوچار ہوا۔ ہلاکو اور اس کے جانشینوں نے ایران میں ایلخانی عہد کی بنیاد رکھی جس کا خاتمہ امیر تیمور کے ہاتھوں ہوا۔ امیر تیمور ترکستان کے برلاس قبیلے کا فرد تھا۔ اس نے ترکستان کی فوج میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد ترکستان پر قبضہ کیا اور بعد ازاں ایران پر حملہ آور ہوا۔ اس کی فتوحات کی ہلاکت اور تباہی چنگیزی بربریت کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی لیکن انسانی خون بہانے اور آباد گھروں کو برباد کرنے کا وہ بھی والہ و شیدا تھا کسی علاقے کے لوگ جب ہتھیار ڈال دیتے تو وہ اپنی تلوار میان سے نکالتا جس کی پیروی کرتے ہوئے ہزارہا تلواریں آن کی آن میں انسانوں کے خون بے گناہ سے رنگین ہو جاتیں۔ اس کے بعد حکم ہوتا کہ شہر تباہ و برباد کر دیا جائے چنانچہ گھروں کے گھر سطح زمین کے برابر کر دیئے جاتے یہاں تک تباہی ہوتی کہ نباتات کا نشان بھی مٹا دیا جاتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ بے گناہوں کے سر کاٹ کر ان کے مینار کھڑے کر دیئے جاتے تاکہ وحشت اور ہلاکت کی داستانیں دور دور تک پھیل جائیں اور کسی کو جرات نہ ہو کہ تیموری یلغاروں کے مقابلے کا خیال کر سکے۔ امیر تیمور کے بعد اس کی آل اولاد اس کے مفتوحہ علاقوں پر حکمران رہی جن کے بعد صفویوں نے ایران کا اقتدار سنبھالا۔

تاتاری اور تیموری یلغاروں کے نتیجے میں جہاں زندگی کے دیگر شعبوں کو تباہی و بربادی کا سامنا ہوا وہاں فنونِ لطیفہ خصوصاً فارسی شعر و ادب میں بھی ایک بہت بڑی تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ بادشاہت کو خطرات لاحق ہوئے تو درباری زندگی بھی

موقوف ہوئی اور درباری زندگی نہ رہی تو شعراء نے بھی جن کی شاعری کا بڑا سبب شاہی انعام واکرام تھا سابقہ شعری روش کو جس میں خارجیت پسندی کا عنصر غالب تھا ترک کیا اور شاعری کو ذاتی جذبات واحساسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے غزل کو جواب تک تشبیب کی صورت میں قصیدے ہی کا حصہ تھی ایک علیٰحدہ اور مستقل صنف سخن کی حیثیت سے ترقی دی، اس کے موضوعات میں وسعت پیدا کی اور اس کے لئے ایک پختہ اسلوبِ بیان تیار کیا جس کا کمال شیخ سعدی، خواجو کرمانی اور حافظ شیرازی کی غزل میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر سیروس شمیسا اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"قالب مسلط در این دورہ غزل است کہ اندک اندک بہ لحاظ تعداد ابیات و تخلص وضعی ثابت می یابد۔ تخلص در شعر قبل از مغول وضع ثابتی نداشت وحتیٰ سعدی گاہی در بیت ما قبل آخر تخلص کردہ است"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۶۰

شیخ سعدی، خواجو کرمانی اور حافظ شیرازی نے جذبے کے خلوص، فکر کی رفعت اور حسن بیان کے امتزاج سے ایک بدیع طرز ایجاد کی اور مدعا اور بیان دونوں کی اہمیت پر بیک وقت زور دے کر ایک لطیف امتزاجی روش اختیار کی۔ یعنی انہوں نے مضامین و معانی کی جزالت اور اسلوب بیان کو جس میں صنعت گری بھی شامل تھی شیر و شکر کر کے ایک نیا اسلوب ایجاد کیا۔ سعدی کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

مشتاقی و صبوری از حد گزشت یارا
گر تو شکیب داری طاقت نماند مارا
باری بچشم احسان بر حال ما نگاہی
کز خوان پادشاہان راحت بود گدا را
سلطان کہ خشم گیرد بر بندگان حضرت
حکمش رسد و لیکن حدی بود جفا را
من بی تو زندگانی خود را نمی پسندم
کاسائشی نباشد بی دوستاں بقا را(۸)

حالات کی ناسازگاری کی بدولت شعراء کی طبیعتیں تصوف کی طرف مائل ہوئیں اور عشق حقیقی شاعری کا موضوع بنا۔ شعراء اپنی فانی حیثیت سے محبت تو حسن مطلق سے کرتے اور اس تصور میں ماسوا اللہ کو بھول جاتے لیکن جب وہ اپنی عاشقانہ واردات کا اظہار کرتے تو انسان ہونے کی حیثیت سے الہیاتی نہیں بلکہ انسانی طریق بیان اختیار کرتے اسی لیے ان کے عشق حقیقی پر عشق مجازی کا گمان گزرتا مثلاً فخر الدین عراقی جو حضرت بہاؤالدین زکریا کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے ان کا عشق حقیقی

سراسر عشق مجازی دکھائی دیتا ہے ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

از پردہ برون آمد ساقی قدحی در دست
هم پردهٔ ما بدرید هم توبهٔ ما بشکست
بنمود رُخ زیبا گشتیم همه شیدا
چون هیچ نماند از ما آمد بر ما بنشست
زلفش گرہی بگشاد بند از دل ما برخاست
جان دل ز جهان برداشت و اندر سر زلفش بست
در دامِ سر زلفش ماندیم همه حیران
وز جام می لعلش گشتیم همه سرمست (۹)

لیکن عطار اور رومی نے اظہار عشق میں کسی ابہام وایہام سے کام نہ لیا بلکہ تصوف کے اسرار ورموز برملا کہے۔ ان میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ عالمِ مجاز میں سخن سرائی کر رہے ہیں یا عالمِ حقیقی میں۔ ان کا عشق بھی حقیقی ہے اور بیان بھی حقیقی۔ عطار کی ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

دست در دامنِ جان خواهم زد
پائی بر فرق جهان خواهم زد
اسپ بر جسم و جهت خواهم تاخت
بانگ بر کون و مکان خواهم زد
و آنگه آن دم که میان من و اوست
از همه خلق نهاں خواهم زد
چون مرا نام و نشان نیست پدید
دم ز بی نام و نشان خواهم زد (۱۰)

شیخ سعدی کے یہاں البتہ عشق حقیقی و مجازی میں واضح امتیاز موجود ہے وہ جب عشق حقیقی کو موضوع غزل بناتے تو ایسے کہ اہل حال و قال پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی مثلاً :

بجهان خرم ازانم که جهان خرم ازوست
عاشقم برهمه عالم که همه عالم ازوست
بغنیمت شمر ای دوست دم عیسی صبح

تادل مُردہ مگر زندہ کُنی کاین دم ازوست

تحلاوت نخورم زہر کہ شاہد ساقیست

بارادت ببرم درد کہ درمان ہم ازوست

سعدیا! گر بکند سیل فنا خانۂ دل

دل قوی دار کہ بنیاد بقا محکم ازوست(۱۱)

اور عشقِ مجازی کی بات کرتے تو خالصتاً اسی کو پیشِ نظر رکھتے اور وہ تمام کیفیات جو عشقِ مجازی میں محسوس کی جا سکتی ہیں پوری شدت سے بیان کرتے لیکن ان کا عشق کسی ایک شخص تک محدود نہیں رہا بلکہ ساری کائنات سے متعلق تھا مثلاً :

آمدی وہ کہ چہ مشتاق و پریشان بودم

تا برفتی ز برم صورت بیجان بودم

نہ فراموشیم از ذکرِ تو خاموش نشاند

کہ در اندیشۂ اوصاف تو حیران بودم

بتولای تو در آتش محنت چو خلیل

گوئیا در چمن لالہ و ریحان بودم

تا مگر یک نفسم بوی تو آرد دم صبح

ہمہ شب منتظر مرغِ خوان بودم(۱۲)

مزید برآں وہ عاشقانہ مضامین کو اتنی جدت کے ساتھ ادا کرتے کہ معمولی مضمون بھی آپ کے اسلوب بیان سے بلند ہو جاتا۔ مثلاً مضمون یہ تھا کہ محبوب میں کچھ خوبیاں ہیں جن کے باعث ہم اسے دل دے بیٹھے ہیں اس کو انہوں نے اس طرح ادا کیا :

دوستان منع کنندم چرا دل بتو دادم

باید اول بتو گفتن کہ چنین خوب چرائی(۱۳)

یا محبوب کی مستی بھری آنکھیں ہزاروں فتنے بپا کرتی ہیں۔ اس مضمون کو انہوں نے اپنے حسن بیان سے اس طرح بلند کیا :

برخیز کہ چشم ہای مستت

خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار(۱۴)

سبکِ عراقی کے پیرو دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ سعدی نے بھی غزل کو صرف عشق حقیقی و مجازی کے اظہار کا وسیلہ

ہی نہیں بنایابلکہ انہوں نے اخلاقیات کو بھی موضوع بنا کر غزلیں کہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ تاتاری فتنے کے ہاتھوں جب سر زمین ایران بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی، گھر ویران اور مسجدیں تباہ ہو چکی تھیں، علم وادب کے مرکز فنا ہو چکے تھے تو دیگر شعراء کی طرح انہیں بھی دربدری کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا ان کی اپنی طبیعت بھی ایک جگہ قیام پر مطمئن نہ تھی۔ لہذا وہ شیراز سے نکل کر بغداد، شام، فلسطین، مکہ، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ تک ہو آئے جہاں ان کی ملاقات طرح طرح کے لوگوں سے ہوئی، زندگی کے گوناگوں تجربات سے بھی ان کا واسطہ پڑا اور معاشرتی ناہمواریوں کا بھی انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا لہذا انہوں نے اپنی شاعری کو انسانی کردار کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔ مثلاً :

همه عیب خلق دیدن نه مروتست و مردی
نگهی بخویشتن کن که تو هم نگاه داری
ره طالبان و مردان کرمست و لطف و احسان
تو خود از نشانِ مردی مگر این کلاه داری
بدر خدای قربی طلب ای ضعیف همت
که نماز این تقرب که به پادشاه داری
تو حسابِ خویشتن کن نه عتاب خلق سعدی
که بضاعت قیامت عمل تباه داری (۱۵)

ان کے قصائد بھی خوشامد سے قطعاً پاک اور پند و موعظت کے بھرپور وعظ پر مبنی تھے۔ انہوں نے قصیدے کسی دنیاوی منفعت کے خیال سے نہیں لکھے بلکہ محض اخلاقی ضرورت کے پیشِ نظر لکھے۔ خواجہ فریدالدین عطار نے بھی اپنے قصائد میں مدحت سرائی کو ترک کیا اور انہیں نعت و پند و موعظت جیسے مضامین کے لئے مخصوص کیا اور ابن یمین کی بیشتر شاعری بھی پند و موعظت پر مبنی تھی ابن یمین کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

مرد باید که هر کجا باشد
عزت خوشتین نگهدارد
خود پسندی و ابلهی بحند
هرچه کبر و منیست بگذارد
بطریقی رود که مردم را
سر موئی زخود نیازارد
همه کس را ز خویش به داند

هیچ کس را حقیر نشمارد
سر و زر در طلب نهد آنکه
تا مگر دوستی بدست آرد (۱۶)

ڈاکٹر سیروس شمیسا سبک عراقی کے فکری خصائص کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"اگر شعری عاشقانہ باشد دیگر مقام معشوق پست نیست بلکہ چنان والا است کہ قابل اشتباہ با معبود است واگر عرفانی باشد، عرفانی است کہ دیگر از شرع و پند و اندرز و اخلاق (کہ در قرن ششم مرسوم بود) دور شدہ است و حتیٰ مسائلی بہ آن افزودہ شدہ کہ در عبارات مشائخ قدیم سابقہ نداشتہ است۔ مسائل مھم عرفانی مطرح در شعر این دورہ عبارت است: وحدت وجود، تفوق عشق بر عقل، استناد بہ حدیث قدسی کنت کنزا، مسالہ تجلی و ظہور، ستایش شراب و بی خودی و بی خردی..... اما در کنار این ھا حملہ بہ زاھد و صوفی ھم مرسوم است بدین ترتیب ادبیات این دورہ بر خلاف ادبیات سبکِ خراسانی ادبیاتی است درون نگرا، عشق گرا، محزون و غیر رالستی کہ بیش از آنکہ بہ آفاق نظر داشتہ باشد بہ انفس نظر دارد۔

مقایسہء مختصات فکری سبکِ خراسانی و عراقی

خراسانی	عراقی
ستایش خرد	ستایش عشق
اعتدال در اغراق	غلو و مبالغہ
فقدان عرفان	رواج عرفان
تفکر حماسی	تفکر غنایی
شادی گرایی	غم گرایی
وصال	فراق
واقع گرایی	آرمان گرایی
عینیت یا توجہ بہ دنیای بیرون	ذھنیت یا توجہ بہ دنیای درون
توجہ بہ حماسہء ملی ایران	توجہ بہ معارف اسلامی

اختیار وارادہ	قضاو قدر
مناعت و غرور	زبونی
پستی مقام معشوق	علو مقام معشوق
عدم توجہ بہ علوم	باز تاب علوم

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۵۹، ۲۶۰

سبکِ عراقی کے پیرو شعراء کو فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا اسی لئے ان کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن کے دوسرے مصرعے عربی ہیں۔ اس کے علاوہ ان شعراء کے یہاں اسلامی اصطلاحات اور قرآنی تلمیحات بھی بکثرت ملتی ہیں مثلاً :

حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے :

الا ای یوسف مصری کہ کردت سلطنت مغرور

پدرا باز پرس آخر کجا شد مہر فرزندی (۱۷)

اسی طرح مولانا رومی کے چند اشعار ہیں :

گفت پیغمبر بآواز بلند

با توکل زانوی اشتر بند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو

از توکل در سبب غافل مشو

گر توکل می کنی درکار کن

کارکن پس تکیہ برجبار کن (۱۸)

ان شعراء کی نظر آرائش بیان اور اسلوب کی عمارت گری پر بھی مرکوز رہی اسی لئے انہوں نے منفرد الفظ و تراکیب استعمال کئے مثلاً سلمان ساوجی کے چند شعر ہیں :

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد

گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد

لالہ در دامن کوہ آتش موسی بنمود

شاخ بیرون زگریبان ید بیضا آورد

سرو را باد صبا منصب بالا بخشید

لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد (۱۹)

اور نادر تشبیہات واستعارات کی بدولت بھی انہوں نے اپنے کلام کے حسن میں اضافہ کیا مثلاً :

امیر خسرو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

راز خون آلود خویش ای دل منہ بامن برون

کین ورق خام است حرف ازوی برون خواہد گذشت (۲۰)

یعنی اے دل تو اپنا خون آلود بھید مجھ سے نہ کہہ کیونکہ یہ تو ایک کاغذ ہے اور کاغذ بھی خام۔ یہ تیرے بھید کا متحمل نہ ہو سکے گا۔ اس شعر میں امیر خسرو نے اپنے پیکرِ جسمانی کو ورقِ خام سے تشبیہ دی ہے۔

غلام نرگس مستم کہ بامداد و پگاہ

قدح بدست گرفتہ ز خواب برخیزد (۲۱)

یعنی میں اس نرگس مست کا غلام ہوں جو صبح سویرے قدحِ شراب ہاتھ میں لئے ہوئے خواب سے بیدار ہوتی ہے۔ محبوب کی چشم مست کو نرگس سے تشبیہ دینا تو ایک مبتذل سی بات ہے لیکن نرگس سے تشبیہ دے کر یہ کہنا کہ یہ جام شراب ہاتھ میں لیے ہوئے خواب سے بیدار ہو رہی ہے کمال تشبیہ ہے۔

می روی و گریہ می آید مرا

ساعتی بنشین کہ باران بگذرد (۲۲)

محبوب کے چلے جانے پر عاشق کا آنسو بہانا کوئی نئی بات نہیں لیکن دوسرے مصرعے میں آنسوؤں کو باران کہہ کر کتنی جدت پیدا کر دی گئی ہے۔

علاوہ ازیں ان شعراء نے صنائع بدائع کو بھی جن کو محسنات شعری بھی کہا جاتا ہے اتنی خوبی اور مہارت سے استعمال کیا کہ وہ پڑھنے والے کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتے۔ مثلاً حافظ شیرازی کے چند اشعار درج ذیل ہیں :

آئینہ سکندر جامِ جم است بنگر

تابر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا

☆☆

آن گل کہ ہر دم در دست بادیست

گو شرم بادش از عندلیباں

☆☆

آدمی درعالم خاکی نمی آید بدست

عالمِ دیگر بباید ساخت وز نو آدمی (۲۳)

گویا ڈاکٹر سیروس شمیسا کے بقول سبک عراقی میں :

”توجہ بہ بیان وبدیع زیاد می شود و شاعران بہ هنر های گوناں گوں کہ هر گز در شعر سبک خراسانی وجود نداشت دست می یابند“۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۶۰

مزید برآں سبک عراقی کی زبان کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ :

”چھار چوب همان چھار چوب فارسی قدیم یعنی زبان سبک خراسانی است کہ بسیاری از مختصات کھن خود را بالکل از دست دادہ است و در عوض تا حدودی مختصات جدید یافتہ است وآن مقدار از منتصات سبک خراسانی هم کہ در آن ماندہ است بہ لحاظ بسامد با دورہء قدیم متفاوت است۔ می توان گفت کہ زبان از دیدگاہ خوانندہء امروزی مانوس تر است ۔ لغات فارسی اصیل قدیم کم شدہ وبہ جای آن لغات عربی جایگزین شدہ است۔ مختصات آوایی کہن از قبیل تشدید مخفف و تخفیف مشدد و تغییر در هیئات کلمات بہ ضرورت، خیلی کم می شود 'می' اندک اندک جای 'همی' را می گیرد۔ 'در' بہ جای 'اندر' در حال جایگزین شدن است ۔ استعمال 'مر' تقریبا نادر است و همین طور واژہ های 'ایدون' و 'ایدر' و 'ابا' و 'ابر' ..... بسیار کم بہ کار می رود۔ می توان گفت کہ زبان سبک عراقی مابین زبان کھن خراسانی وزبان جدید سبک هندی بہ بعد است“۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۵۸

سبک عراقی کے پیرو شعراء نے اگرچہ مشاہدے کے مقابلے میں تخیل کا استعمال زیادہ کیا اور بسا اوقات معنی کی وضاحت سے زیادہ دقت اور لطفِ معنی کو فن کا لازمہ سمجھا۔ اس کے علاوہ مضمون آفرینی کی بھی ابتدا ہوئی جو آگے چل کر سبکِ ہندی کی ایک نمایاں خصوصیت قرار پائی۔ اس خصوصیت کے ابتدائی نقوش تو کمال اسمٰعیل اور سلمان ساوجی کے قصائد میں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن غزل میں اس کے موجد امیر خسرو ٹھہرے جو اس زمانے میں ہندوستان میں بیٹھے سخن سرائی میں مصروف تھے۔ اس خصوصیت کے حامل ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

زہی عمرِ دراز عاشقان گر

شب ہجراں حساب عمر گیرند (۲۴)

یعنی اگر ہجر و فراق کی رات کو بھی عاشقوں کی عمر میں شامل کر لیا جائے تو ان کی عمر بہت ہی طویل ہو :

زلفت سروپا شکستہ زان است

کز سرو بلندت اوفتاد است(۲۵)

اسی طرح ایک دنیا محبوب کی تیغ ناز کی کشتہ ہے۔امیر خسرو نے اس مضمون کو کچھ اس انداز سے پیش کیا :

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی

مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی (۲۶)

یعنی اب دنیا میں کوئی نہیں جو کشتۂ تیغ ناز نہ ہوا ہو۔اب تمہاری مشقِ ستم کی صرف یہی صورت ہے کہ کُشتگانِ تیغ کو پھر سے زندہ کرو اور پھر انہیں تیغ ناز سے ہلاک کرو۔

لیکن اس کے باوجود بقول ڈاکٹر محمد ریاض یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ :

''سبکِ عراقی ہمہ مختصات تکامل یافتہ صوری و معنوی را در برداشت''(۲۷)

☆☆☆

علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر سبکِ عراقی کے اثرات

۱۔ فارسی غزل کی صوری اور معنوی تکمیل

۲۔ صوفیانہ شاعری

۳۔ ابلاغ واظہار مفہوم کے اسالیب

یعنی تراکیب، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور کنایے کا ماہرانہ استعمال

۴۔ صنایع بدایع لفظی و معنوی

۵۔ عربی زبان کا بکثرت استعمال

۶۔ تمثیل نگاری

۷۔ جذبات نگاری

ا۔ فارسی غزل کی صوری و معنوی تکمیل

رفیق خاور لکھتے ہیں :

"شاعر مشرق معتدبہ حد تک شاعرِ غزل بھی تھے اور انھوں نے اس کی آب و تاب کا حق ادا کرتے ہوئے روایت کو آگے بڑھانے اور بیش از پیش کیف و رنگ عطا کرنے میں اپنے پیش رو سلسلۂ شعراء کے فیضان میں قابلِ قدر اضافہ کیا، خصوصاً اس لئے کہ یہ صنف اپنی مخصوص نوعیت کے باعث جستہ جستہ تاثرات، مشاہدات اور ارتسامات کو منظومات کے بسیط پیرائے کے برعکس رمز و ایماء کے موجز، اشاراتی پیرائے میں ادا کرتی ہے جس سے بیک جنبشِ چشم حقائق و بصائر کی وسیع و عریض کائنات ایک ہی شعر میں سمٹ آتی ہے اور قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ہم اس کے متفرق نقوش کو یکجا کر کے ایک مجموعی کلیہ مرتب کرتے ہیں۔ اس طرح اقبال کی شاعرانہ صلاحتیں جہاں مبسوط پیرائے میں نہایت وسیع کینواس پر جلوہ گر ہو کر کشادِ فن کا ثبوت دیتی ہیں وہاں متعدد فرد رموز و نکات کو مختصر نقوش میں پیش کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیتی ہیں۔ فن کی یہ دونوں صورتیں تکمیل کار میں ایک دوسرے کی مدد و معاون ہیں اور شاعر کے افکار و تخیلات کو دو جداگانہ طریقوں سے ظاہر کر کے ان کی مجموعی شخصیت کو پوری طرح اجاگر کرتی ہیں۔"(۲۱۸)

اقبال مغرب و مشرق کی دھری تہذیبی و تمدنی میراث کے امین تھے۔ اگر مغرب نے انھیں جدید وضع کی شاعری عطا کی تو دوسری طرف مشرق نے مئے خانہ ساز یعنی غزل کا شوق اور آہنگ عطا کیا۔ مشرقی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے جہاں اس صنف کو صدھا سال سے فروغ حاصل تھا۔ اس کی روح اور ذوق و شوق ان کے دل کی گہرائیوں میں سرایت کر گئے اور انھوں نے اپنے مشرقی فیضان سے پوری طرح وفاداری کی اور فارسی اور اردو شعراء کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے غزل کو نشو و نما دینے میں پوری پوری جد و جہد کی۔ اسی لئے فارسی غزل کی صوری و معنوی تکمیل علامہ اقبال کے یہاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

عشق را نازم کہ از بیتابئ روز فراق
جان مارا بست بادرد تو پیوندِ دگر
(ص ۳۱۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں اپنے جذبۂ عشق پر ناز کرتا ہوں جس نے روزِ فراق کی بیتابی کے پیشِ نظر میرے دل میں تیرے دردِ فراق سے مزید رابطہ پیدا کر دیا۔ یعنی اس اندیشے کے تحت کہ کہیں میں فراق کی سختیوں سے تنگ آکر تجھ سے محبت کرنا نہ چھوڑ بیٹھوں

مجھے تیری محبت میں اس قدر دیوانہ کر دیا کہ فراق کی حالت میں خواہ مجھ پر کتنے ہی مصائب کیوں نہ آئیں میں تیرے خیال سے غافل نہیں ہوتا۔

ہر کس نگہے دارد ہر کس سخنے دارد
در بزم تو می خیزد افسانہ ز افسانہ
(ص ۳۳۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے محبوب! تیری محفل میں جس قدر عشاق جمع ہیں ان میں سے ہر ایک تجھے اپنی نظر یا اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر شخص تیرے حسن و جمال کے اس پہلو پر گفتگو کرتا ہے۔ جو اسے پسند ہے اور چونکہ ہر شخص کا زاویۂ نگاہ جداگانہ ہوتا ہے اور اندازِ گفتگو مختلف ہوتا ہے بلکہ موضوع سخن بھی منفرد ہوتا ہے اس لئے تیری محفل میں بات سے بات نکلتی ہے۔

عشق است و ہزار افسون، حسن است و ہزار آئین
نے من بہ شمار آیم نے تو بہ شمار آئی
(ص ۳۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگر ذات مطلق کی عظمت و جمال کا سلسلہ لامتناہی ہے تو انسان کے دل بے تاب میں بھی بے شمار نت نئے جہاں فکر و عمل آباد ہیں۔

قدم بیباک ترنہ در حریم جان مشتاقان
تو صاحب خانہ آخر چرا دردانہ می آئی ؟
(ص ۳۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے محبوب تو ہم عاشقوں کے دل میں آزادانہ داخل ہو تو تو اس گھر کا مالک ہے پھر چوروں کی طرح ڈرتے ہوئے کیوں آتا ہے۔

درین رباط کہن چشم عافیت داری
ترا بکشمکش زندگی نگاہے نیست
(ص ۳۵۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اس دنیامیں عافیت کی تمنا زندگی کے سفاک حقائق سے ناآشنائی کی دلیل ہے۔

غم عشق و لذت او اثرِ دوگونہ دارد
گہے سوز و دردمندی گہے مستی و خرابی
(ص ۳۳۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عشق کا غم اور اس کی لذت دو گونہ تاثیر کی حامل ہوتی ہے کبھی اس میں جوش و مستی اور وارفتگی کا عالم طاری ہوتا ہے اور کبھی احساس نیاز و دردمندی غالب آتا ہے۔

بضمیرت آرمیدم تو بجوش خود نمائی

بکنارہ برفگندی دُر آبدار خود را

(ص ۴۴۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے خدا میں تیری ذات کے سیپ میں سکون سے چھپا بیٹھا تھا لیکن تو نے خود نمائی کے جوش میں اپنے اس قیمتی موتی کو کنارے کی طرف اچھال دیا۔

زمشتاقاں اگر تابِ سخن بردی نمی دانی

محبت می کند گویا نگاہ بے زبانے را

(ص ۴۴۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے خدا مانا کہ عشاق کے لئے اظہار عشق بہت مشکل ہوتا ہے یا ہجر کی صعوبتوں کے باعث جو لازمۂ عشق ہیں ان میں کچھ کہنے کا حوصلہ باقی نہیں رہتا لیکن کیا تو نہیں جانتا کہ محبت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ بے زبان نگاہوں کو بھی قوت گویائی عطا کر دیتی ہے اور عاشقی میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ عاشق اور معشوق کے درمیان نگاہوں کی زبانی گفتگو ہونے لگتی ہے۔

علامہ اقبال کی غزلیات کے درج بالا اشعار میں فکری لطافت کے ساتھ ساتھ فنی لطافت بھی اپنے درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے جس کا سبب روایتی عشقیہ شاعری کے ساتھ ساتھ، جو فارسی غزل کا خاصہ رہی ہے تغزل بھی ہے، رمز و ایماء بھی ہے، ایجاز و بلاغت بھی ہے، روانی و سلاست بھی ہے، الفاظ کی موزونی بھی ہے، مضمون آفرینی بھی ہے۔ غرض کون سا وصف ہے جو علامہ کے ان اشعار کو سبک عراقی کے بڑے سے بڑے شاعر کے غزلیہ اشعار کے ہم پلہ نہیں بناتا۔ لیکن وہ وصف جو مذکورہ بالا چند اشعار اور روایتی موضوعات پر مبنی علامہ کے دیگر کئی اشعار کے برعکس ان کے بیشتر غزلیہ اشعار کو ان سب سے منفرد ٹھہراتا ہے، یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو نئے احساس اور فکر سے سمویا اور مختلف ثقیل حقائق کے اظہار کے باوجود اس کے حسن اور بانکپن میں نکھار پیدا کیا جس سے شعر پر بالعموم اور غزل پر بالخصوص ان کی بے پناہ قدرت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کی غزلیات میں ان کے فلسفے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن میں خودی، عشق و خرد، سوز و ساز، تپش و اضطراب، طلب و جستجو حرکت و عمل، دعوت مبازرت، خطر پسندی اور ملت اسلامی کی انحطاط پذیر زندگی وغیرہ جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ایسے موضوعات اگرچہ منبر و وعظ کے دائرہ کار سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر علامہ اقبال نے انھیں غزل کی جان بنا دیا۔

علامہ اقبال نے بلا شبہ کسی موضوع میں بھی غزل کے آہنگ اور مزاج سے سرِ مو انحراف نہیں کیابلکہ علامہ کے سنگین افکار غزل کی روایتی لطافتوں کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوئے ہیں کہ اپنی پوری معنویت اور اثر انگیزی کے ساتھ پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتے ہیں مثلاً :

عشق باعث تخلیق کائنات ہے اسی جذبے نے خدا کو تخلیق پر مائل کیا اور انسان کو اضطراب مسلسل سے دوچار کیا جس کی بدولت اس نے کائنات میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ اضطراب، یہ بیداری، یہ سرگرمی، یہ ہنگامہ اور یہ جوش و خروش جو کائنات میں پایا جاتا ہے یہ سب حضرت عشق کی کرشمہ سازی ہے۔

علامہ اقبال نے ایک شعر میں اس حقیقت کو انتہائی دلنشین کنایے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب بہار نے گلستان میں محفلِ نشاط آراستہ کی تو بلبل شوریدہ کے نالوں نے غنچوں کی آنکھیں کھول دیں یعنی جب فطرت نے دنیا کو گوناگوں مخلوقات سے آراستہ کیا تو انسان نے اپنے عشق کی بدولت ساری کائنات میں ہنگامہ برپا کر دیا :

بہار تابہ گلستان کشید بزمِ سرود
نوائے بلبل شوریدہ چشم غنچہ کشود
(ص ۳۱۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

انسان کا خدا کی ذات میں اپنی ہستی کو گم کر دینا کمال نہیں کمال تو یہ ہے کہ وہ خدا کی صفات اپنے اندر پیدا کرے یعنی سمندر میں داخل ہو اور موتی بن کر باہر نکلے۔ اگر فرد نے اپنے آپ کو خدا کی ذات میں فنا کر لیا تو پھر اسکی ہستی ہی ختم ہو گئی اس لئے انسان کا ذات حق میں فنا ہو جانا اس کے لئے باعثِ فخر نہیں۔

علامہ اقبال نے اسی نکتے کو ایک شعر میں انتہائی اجمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اے ناممکنات اندیش قطرے تو نے سمندر میں گر کر اپنا وجود ختم کر دیا اور اس حقیقت سے ناآشنا رہا کہ سمندر میں داخل ہونا اور موتی بن کر باہر نہ نکلنا رسوائی کا باعث ہے :

زخود گذشتہ اے قطرۂ محال اندیش
شدن بہ بحر و گہر برنخاستن ننگ است
(ص ۳۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

دنیاوی لذتیں روبزوال، ناپایدار اور فریب نظر ہیں اس کے باوجود ہر شخص ان کے حصول میں منہمک رہتا ہے اس حقیقت کو علامہ نے ایک شعر میں کنایے کے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ اے بلبل! میں نے بارہا تجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ پھول کا حسن پائیدار نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تو پھر اسے گلے لگا رہی ہے یعنی اس سے محبت کا اظہار کر رہی ہے :

اے بلبل ازوفایش صدبار با تو گفتم

تو درکنار گیری باز این رمیده بورا

(ص ۳۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

انسانی فکر کی تخلیقی استعداد اور اس کی وسعت اور گہرائی کا یہ عالم ہے کہ و ہ اس کی مدد سے نئی دنیائیں آباد کرتا ہے اور اپنے حسن تخیل اور اندیشے سے اس میں نئے رنگ بھرتا ہے اسکی تخلیقی قوت کا ٹھکانہ نہیں اور اس کے مزاج کا تنوع اور جدت پسندی اسے نئی حقیقتوں کے انکشاف کی راہ دکھاتی ہے اس حقیقت کے اظہار میں بھی علامہ نے موسیقی اور نغمے کے سروں سے زیادہ رس گھولا ہے اور شوخیٔ فکر اور جرأت گفتار کا وہ مخصوص انداز اختیار کیا ہے جو اپنے خالق سے خطاب کے سلسلے میں اکثر نظر آتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اے خدا تو نے صرف ایک ہی دنیا بنائی اور وہ بھی ایسی کہ اس میں ہر روز بلکہ ہر لمحہ لاکھوں عاشقوں کی تمناؤں کا خون ہوتا رہتا ہے یعنی تیری یہ دنیا تلخیوں سے معمور ہے لیکن ہم تیرے عاجز بندے ہر روز ایک نئی دنیا پیدا کرتے رہتے ہیں جو ہمارے تصور کی کھیتی سے پھول کی طرح اُگتی رہتی ہے۔ مراد یہ کہ ہم عاشقوں کی قوت متخیلہ اس قدر زبردست ہوتی ہے کہ ہم جب چاہیں ایک نئی اور حسین دنیا پیدا کر لیتے ہیں۔ اے خدا! تیری اس دنیا میں آج کے بعد کل اور کل کے بعد پھر کل آتا ہے اور ہر کل پہلے کل کی طرح ہوتا ہے اس میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس یکسانیت سے ہم پر حیرت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور حیرت سے لطفِ زندگی باقی نہیں رہتا۔ ہم چونکہ جدت پسند ہیں۔ اس لئے تجھ سے التماس ہے کہ کوئی نئی دنیا تخلیق کر کہ اس دنیا سے ہمارا دل سیر ہو چکا ہے۔

صد جہان می روید از کشتِ خیال ما چو گل

یک جہان و آن ہم از خونِ تمنا ساختی

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم

این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

(ص ۳۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جذبۂ عشق انسان کے اندر پیہم تپش اور اضطراب کو جنم دیتا ہے اسی سے انسان کی زندگی لازوال اور غیر فانی بنتی ہے اور وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں بیتاب و سرگرداں رہتا ہے۔ شاعر کا یہ احساس یوں نغمے میں ڈھلتا ہے کہ زندگی دراصل عشق کی آگ میں جلنے اور تڑپتے رہنے کا نام ہے اور یہ تپش انسان کو ابدیت سے ہمکنار کر سکتی ہے اس لئے میں دعا کرتا ہوں کہ خدا میری خاک کے تمام ذرات کو دل بے قرار میں تبدیل کر دے یعنی میں سراپا عشق بن جاؤں۔

میرا دل آتش عشق میں جل رہا ہے اور عاشق کو کسی جگہ قرار نہیں ہوتا نہ وہ کسی منزل میں مستقل طور پر قیام کر سکتا ہے کیونکہ قیام کا نتیجہ سکون ہے اور سکون کا نتیجہ موت ہے۔ لہذا میں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس سفر میں میرے دل کا محافظ

ہو تا کہ وہ کسی حال میں بھی اپنے مقصود حیات سے غافل نہ ہو :

تپش است زندگانی، تپش است جاودانی

ہمہ ذرہ ہائے خاکم دلِ بے قرار بادا

نہ بہ جادۂ قرارش، نہ بہ منزلے مقامش

دلِ من مسافرِ من کہ خداش یار بادا

(ص ۳۵۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

عشق انسان کے اندر جرأت کردار پیدا کرتا ہے یہ جرأت مقاومت اور مبارزت کو دعوت دیتی ہے اور انسان کے اندر خطر پسندی کا جذبہ پیدا کرتی ہے جو انسانی خودی کے استحکام اور تقویت کا باعث بنتا ہے۔ شاعر کے نزدیک زندگی کا راز ہی خطرات سے کھیلنے اور طوفانوں سے لڑنے میں پنہاں ہے یہاں تک کہ وہ ایسے سفر کعبہ پر بھی آمادہ نہیں جو خطرات سے خالی ہو۔ علامہ ان خیالات کو ایک شعر میں انتہائی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں :

بکیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است

سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

(ص ۳۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

زندگی کو کسی پل قرار نہیں۔ اس میں جمود کو راہ نہیں۔ یہ نئی منزلوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرم سفر رہتی ہے اس خیال کو علامہ اقبال ایک شعر میں انتہائی مؤثر اور دلنشین انداز سے پیش کرتے ہیں کہ خدا معلوم اس دنیا کی منزلِ مقصود کہاں ہے کہ اس دنیا کی ہر شے ریگِ رواں کی طرح اُڑتی چلی جارہی ہے :

کجاست منزلِ این خاکدانِ تیرہ نہاد

کہ ہر چہ ہست چو ریگ رواں بہ پرواز است

(ص ۳۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

حرکت اور پرواز کے اسی تصور کو پھول کی مہک اور نسیم سحر سے ہم آہنگ کر کے علامہ زندگی کے سنگین عمل کو ایک شعر میں تغزل کے لطیف سانچے میں یوں ڈھالتے ہیں کہ اے مخاطب! غنچے کے خلوت کدے سے خوشبو کی طرح باہر نکل اور نسیم سحر سے پیوستہ ہو کر دنیا کو معطر کردے یعنی اپنے حجرے سے باہر نکل اور دنیا کو اسلام کے پیغام سے منور کردے :

باز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم

بانسیمِ سحر آویز و وزیدن آموز

(ص ۳۲۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

مشرق اور مغرب اداس اور ویران ہیں وہ ذوقِ جستجو سے محروم اور عشق کی حرارت سے بے نصیب ہیں لہذا ساقیٔ ازل سے بزمِ شبانہ اور نگاہِ محرمانہ کی تمنا ہے تاکہ محفل پھر رنگ پر آئے اور زندگی کا ہنگامہ پھر سے گرم ہو جائے شاعر نے یہاں میخانے کی روایتی اصطلاحات سے ایمائیت کا کام لیا ہے :

مشرق خراب و مغرب ازاں بیشتر خراب
عالم تمام مردہ و بے ذوق جستجوست
ساقی بیار بادہ و بزم شبانہ ساز
مارا خراب یک نگہ محرمانہ ساز

(ص ۴۴۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

کائنات کے ذرے ذرے کا دل لذتِ حیات سے آشنا ہے۔ بلندی و پستی عالم پر کیف حیات چھایا ہوا ہے اور زندگی کے سوز و سرور نے ایک تخلیقی اور ارتقائی ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ زندگی کی دھڑکنیں جس طرح قلبِ انسانی میں محسوس ہوتی ہیں اسی طرح گل و لالہ میں بھی کار فرما ہیں کوئی مظہر کائنات ایسا نہیں جو زندگی کے سرور سے نا آشنا ہو۔ اس طبیعی حقیقت کو شاعر نے دو شعروں میں اس طرح موسیقی اور نغمے میں ڈھالا ہے :

بنگاہ آشنائے چو درون لالہ دیدم
ہمہ ذوق و شوق دیدم ہمہ آہ و نالہ دیدم
بہ بلند و پستِ عالم تپشِ حیات پیدا
چہ دمن چہ تل چہ صحرا رمِ این غزالہ دیدم

(ص ۵۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زندگی ایک بحرِ بیکراں ہے جس میں بقا کا سامان صرف طوفان کی ہلاکت آفرینیوں کا مقابلہ کرنے میں پنہاں ہے۔ اس خیال کو انتہائی دلکش پیرایہ عطا کیا ہے :

چو موج خیز و بہ یم جاودانہ می آویز
کرانہ می طلبی بیخبر کرانہ کجاست

(ص ۴۷۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

ہر شخص اُخروی دنیا کے احتساب سے خائف رہتا ہے لیکن چونکہ عاشق کا دل جو عشق کی آماجگاہ ہے اس جذبے کی بدولت ہر دو جہان کو تہ و بالا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہذا ہر قسم کے احتساب سے مبرا ہو جاتا ہے بلکہ وہ جذبۂ عشق کی بدولت اس مقامِ رفیع پر فائز ہو جاتا ہے جہاں بیٹھ کر دوسروں کا احتساب کرنے لگتا ہے اس حقیقت کو کنایے کی شکل میں یوں

بیان کرتے ہیں کہ اس میخانے میں شراب کا ہر پیالہ محتسب کے خوف سے لرزہ بر اندام ہے بجز عاشق کے پیالے یعنی دل کے کہ جس میں موجود شراب یعنی عشق کا جذبہ پتھروں کو بھی لرزنے پر مجبور کر دیتا ہے :

درین میخانے ہر مینا ز بیم محتسب لرزد
مگر یک شیشۂ عاشق کہ از وے لرزہ بر سنگ است
(ص ۵۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

موت کے ساتھ زندگی کا تسلسل ختم نہیں ہوتا لیکن اگر ایسا ہے تو کسی صاحبدل یا صاحب عمل کی موت خود خالق کے لئے باعث شرمندگی ہے اس خیال کو انتہائی مؤثر انداز میں یوں پیش کرتے ہیں کہ اے مخاطب! تو اس شان سے جی کہ اگر انسان کے نصیب میں دائمی موت بھی لکھ دی گئی ہے۔ تو خدا اپنے کئے پر شرمسار ہو :

چنان بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد
(ص ۶۷۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

مغربی علوم میں بظاہر بڑی چکاچوند ہے مگر یہ وہ آفتاب ہے جو کسی نئی سحر کا پیامبر نہیں اور اس سے ظلمتیں کافور نہیں ہوتیں۔ الفاظ کا ترنم ملاحظہ ہو :

قدح خرد فروزے کہ فرنگ داد مارا
ہمہ آفتاب لیکن اثر سحر ندارد
(ص ۴۴۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال ساقیٔ ازل سے ایسی شراب کے طالب ہیں جس میں شعلے کی حرارت اور تابانی ہو تا کہ وہ اس کے سرور سے قیامت خیز ولولے پیدا کر سکیں اس خواہش کے اظہار کے لئے خوبصورت تراکیب کا استعمال ملاحظہ ہو :

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز
(ص ۴۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

غرض اقبال نے غزل میں بے شمار دقیق و عمیق افکار بیان کئے لیکن زبان کے لوچ میں فرق نہیں آنے دیا ان کا مقصد ابلاغ تھا نہ کہ ہنر نمائی مگر ابلاغِ پیغام نے غزل کے تقاضوں کو اتنا معمولی مجروح کیا کہ ہر کہ ومہ اس امر کی نشاندہی بھی نہیں کر سکتا۔

ان کی بے بدل اور کم نظیری فارسی غزل کے بارے میں اے جے آربری زبور عجم کے ترجمے Persian Psalms

کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

"اقبال نے غزل کو ہیئت و مواد کی روایتی پابندیوں سمیت قبول کر لیا اس لئے کہ وہ انہیں ایسی ہی شکل میں ملی تھی۔ پھر وہ صحیح معنوں میں اپنے جوہر عبقریت کا پر توڈال کر اسے ایک منزل آگے لے گئے۔

انہوں نے غزل کے سانچے اور مورت کو تو بڑی وفاداری کے ساتھ بحال رکھا مگر اسے اپنے مخصوص و منفرد پیغام کا وسیلۂ اظہار بنا کر اس کی ہیئت کو نئے معانی عطا کر دیئے گویا اب پہلی بار غزل کی قدیم ہیئت پر جدید فلسفے کا ملبوس سجا دیا گیا۔

جب قاری اقبال کے اظہار کا توجہ سے مطالعہ کرے گا تو خود کو اس امر کی شناخت پر بخوبی قادر پائے گا کہ عام الفاظ اور عام دلالتوں کے پیچھے ان کے کیا کیا مخصوص مطالب جلوہ گر ہیں چنانچہ قاری ایک حیرت ناک تازگی و رعنائی کے ساتھ ساتھ اظہار کی مبہوت کن گیرائی اور گہرائی ملاحظہ کرے گا۔ وہ اپنے آپ کو فکر و احساس کی ایک نئی دنیا میں پائے گا۔ وہ دنیا جس میں امیدؤ آرزو اور عظیم سعی و جستجو کا ارتعاش ہے۔ وہ دنیا جس میں ایک ایسے عظیم مفکر کی بصیرت جلوہ بار ہے جس نے دکھوں سے بھرپور اور تہ و بالا ایّام میں آنے والے نئے دور کی سحر کا نظارہ کر لیا تھا۔" (۲۹)



۲۔ صوفیانہ شاعری

صوفیانہ شاعری کا بنیادی موضوع عشق الٰہی ہے۔ اور علامہ اقبال بھی حقیقت مطلقہ کی یافت میں عشق کی رہنمائی میں یقین رکھتے ہیں۔ عشق کے معاملے میں اقبال اور صوفی کے درمیان اس اتفاق رائے کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال اور صوفیوں کی قربتوں میں ایک مسئلہ عشق بھی ہے جس کے ایک سے زیادہ معنی ہیں لیکن اقبال اور صوفی دونوں متفق ہیں کہ عشق مقاصد اعلیٰ کے لئے ایک وسیلہ ہے۔"(۳۰)

اقبال کے شارحین ان کو تصوف کا مخالف سمجھتے ہیں اور بعض موافق۔ جبکہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے بقول :

"حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک خودی کی اصل بنیاد کا تعلق ہے وہ وحدت الوجود کی طرف مائل نظر آتے ہیں لیکن جہاں خودی کی انفرادیت اور مقصدیت کا تعلق ہے وہ ان صوفیوں کے سخت ناقد ہیں جنہوں نے بدھ مت، فلسفۂ ویدانت یا نو فلاطونیت کے زیرِ اثر اپنے فلسفے کی تشکیل کی ہے۔"(۳۱)

عشق الٰہی کے حوالے سے علامہ اقبال کے چند اشعار ملاحظہ ہوں اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہمارا وجود خدا کے وجود کا آئینہ ہے اور مسلمان کی ہستی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔

ذات ما آئینہ ذاتِ حق است
ہستی مسلم ز آیاتِ حق است

(ص ۵۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق الٰہی نے میرے اندر آگ بھڑکا دی ہے اب اسے فرصت مبارک ہو کہ میری جان جل چکی ہے۔ میرے پاس نے کی طرح آہ و فریاد کے سوا کچھ بھی نہیں اور یہی میرے اجڑے گھر کا دیا ہے جو غم میرے رگ و پے میں رچا ہوا ہے اسے بیان نہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ شراب کس طرح صراحی میں چھپی رہ سکتی ہے :

عشق در من آتشے افروخت است
فرصتش بادا کہ جانم سوخت است
نالۂ مانند نے سامانِ من
آن چراغِ خانۂ ویران من
از غم پنہاں نگفتن مشکل است
بادہ در مینا نہفتن مشکل است

(ص ۱۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے انسان تو کسے تلاش کر رہا ہے اور اس کی تلاش میں اس قدر سر گرداں اور پریشان کیوں ہے ؟ جسے تو ڈھونڈ رہا ہے وہ تو جلوہ آرا ہے لیکن تو پوشیدہ ہے اگر تو اسے تلاش کریگا تو انجام کار تجھے معلوم ہو جائے گا کہ وہ تو ہی ہے جسے تو ڈھونڈ رہا ہے اور اگر اپنے آپ کو تلاش کرے گا تو آخر الامر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ تو خود وہی ہے جسے تو تلاش کر رہا ہے مراد یہ کہ ساری کائنات میں بجز خدائے واحد کے کوئی دوسری ہستی موجود نہیں ہے اور جب کوئی موجود ہی نہیں تو دوئی کا سوال ہی خارج از بحث ہے :

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

(ص ۲۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیام مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے عاشق کی نگاہ میں کعبہ اور بتخانہ دونوں یکساں ہیں۔ بتخانہ اس کی جلوت گاہ ہے یعنی بتوں میں بھی اس کا ظہور ہے اور کعبہ اس کی خلوت گاہ ہے یعنی وہاں بھی وہی جلوہ گر ہے اگرچہ آنکھوں سے مستور ہے۔

فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بتخانہ
این جلوت جانانہ آن خلوت جانانہ

(ص ۳۳۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

چونکہ بتخانہ میں بت نظر آتے ہیں اور کعبہ میں کچھ نظر نہیں آتا اس لئے علامہ اقبال نے بتخانہ کو جلوت جانانہ اور کعبہ کو خلوت جانانہ سے تعبیر کیا ہے دوسرا یہ کہ عشق کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس لئے عاشق کو کعبہ و بتخانہ ہر جگہ ذات پاک ہی کے جلوے دکھائی دیتے ہیں۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا! میں اپنے عقل و دل و نگاہ سب تیرے عشق میں ہار بیٹھا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تجھے تلاش کر رہا ہوں یا اپنی تلاش میں سر گرداں ہوں :

من بتلاشِ تو روم یا بتلاشِ خود روم
عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگان کوئے تو

(ص ۲۱۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ زندگی کا گوہر یعنی زندگی جو اس دنیا میں کہیں کھو گئی ہے معلوم نہیں ہمارا وجود ہے یا وجود الٰہی ہے۔

در خاکدان ما گوہرِ زندگی گم است
این گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست
(ص ۴۸۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مجھ پر کائنات کی اصلیت منکشف ہو گئی کہ یہ کائنات بذات خود کچھ نہیں ہے۔ محض خدا تعالیٰ کی ذات کی جلوہ گری ہے اور زندگی میری نگاہ میں رباب کی صورت میں ظاہر ہو گئی یعنی جس طرح رباب کے تاروں سے مختلف آوازیں نکلتی ہیں اسی طرح حیات مطلق سے اشکال مختلفہ ظاہر ہو رہی ہیں یعنی حیات مطلق مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔

زندگی ایک ایسا رباب ہے جس کے ہر تار میں ایک رباب پوشیدہ ہے یعنی ہر اسم کی تجلی سے اس کے مناسبِ حال اشیاء ظہور پذیر ہوتی ہیں اور ہر شے اپنے اندر لا تعداد اشیاء کے ظہور کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ان سے جو نغمے نکل رہے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ہر نغمہ دوسرے نغمے سے زیادہ دلکش اور دلنواز ہے۔

کائنات میں جس قدر مخلوقات ہیں سب اس کی نار یعنی شانِ جلال اور نور یعنی شانِ جمال کے کرشمے ہیں۔ ان سب کی اصلیت ایک ہی ہے اور وہ اصل ذاتِ حق ہے۔

کارکنانِ قضاو قدر نے میری جان کے سامنے ایک آئینہ آویزاں کر دیا یعنی میں اس عالم میں پہنچ گیا جہاں میں نے اپنی جان یعنی حقیقت کو اس طرح دیکھ لیا جس طرح آئینے میں مادی اشیاء نظر آتی ہیں اور اپنا دیدار کرنے کے بعد مجھ پر حیرت اور یقین کی ملی جلی کیفیت طاری ہو گئی۔ حیرت اس لئے طاری ہوئی کہ میں تو اپنے آپ کو غیر خدا سمجھتا تھا کیونکہ تعین کا پردہ میری آنکھوں پر پڑا ہوا تھا لیکن جب پردہ اٹھایا تو اور ہی تماشا نظر آیا یعنی میں نے دیکھا کہ میں تو عینِ خدا ہوں اور یقین کی کیفیت اس لئے پیدا ہوئی کہ میں نے یہ بات کہ خودی عین خدا ہے کسی عقلی بحث یا منطقی استدلال کی بدولت معلوم نہیں کی بلکہ خود اس کی حقیقت کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔

زمانِ مادی میں امروز بھی ہوتا ہے اور دوش و فردا بھی مگر زمانِ ایزی میں نہ ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل بلکہ ہر وقت حال کی کیفیت قائم رہتی ہے۔

حق اپنے تمام حجابات کے باوجود ظاہر ہو رہا ہے اور میری نگاہ سے اپنا دیدار کر رہا ہے۔ اس کا دیدار کرنا ایسی معرفت کا سبب ہے جس میں کبھی کمی یا کوتاہی نہیں ہو سکتی اور اس کو دیکھنا گویا جسم یعنی مادیات کی قیود سے آزاد ہو جانا یا زمان و مکان پر غالب آجانا ہے۔

عبد اور مولیٰ دونوں ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں یعنی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بے تاب ہیں اور زندگی جہاں بھی ہے مصروف جستجو ہے یعنی خدا بندے کو تلاش کر رہا ہے اور بندہ خدا کو ڈھونڈ رہا ہے بالفاظ دگر اگر زندگی کا مصداق خدا کو قرار دیا جائے تو خدا اپنی صفات کے اظہار کے لئے بندے کو تلاش کر رہا ہے اور اگر اس کا مصداق بندے کو تسلیم کیا جائے تو بندہ اپنے وجود کی بقا کے لئے خدا کی جستجو کر رہا ہے :

گم شدم اندر ضمیر کائنات
چون رباب آمد بچشم من حیات
آنکہ ہر تارش ربابِ دیگرے
ہر نوا از دیگرے خونین ترے
ماہمہ یک دودمان نار و نور
آدم و مہر و مہ و جبریل و حور
پیشِ جان آئینہ آویختند
حیرتے را با یقین آمیختند
صبح امروزے کہ نورش ظاہر است
در حضورش دوش و فردا حاضر است
حق ہویدا باہمہ اسرارِ خویش
بانگاہِ من کند دیدارِ خویش
دیدنش افزودن بے کاستن
دیدنش از قبر تن بر خاستن
عبد و مولا در کمین یکدگر
ہر دو بے تاب اند ازذوقِ نظر
زندگی ہر جا کہ باشد جستجوست
حل نشد این نکتہ من صیدم کہ اوست

(ص ۷۷۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں خوشبو کی طرح زندگی بسر کرو جو اپنی ذات کے لحاظ سے مستور یعنی پوشیدہ ہے مگر اپنی تاثیر یعنی فعلیت کے اعتبار سے ظاہر و فاش ہے۔

در چمن زی مثل بو مستور و فاش

گویا مومن کو چاہئے کہ وہ دنیاوالوں سے مستور یعنی بے تعلق رہے لیکن افادہ یعنی نفع رسانی میں سرگرم رہے۔ اہلِ دنیاکو اپنی ذات سے نفع پہنچائے مگر خود ان کو مقصود حیات نہ بنائے۔ اسی نکتے کو دوسرے مصرعے میں یوں بیان کرتے ہیں :

درمیان رنگ پاک از رنگ باش

(ص ۸۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں رنگ کنایہ ہے دنیا سے۔ یعنی دنیا میں رہو مگر دنیا سے تعلق یعنی محبت مت رکھو۔ علامہ اقبال نے اس شعر میں تصوف کا خلاصہ یا اس کی روح نظم کر دی ہے۔ تصوف کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان باہمہ ہونے کے باوجود بے ہمہ ہو کہ زندگی بسر کرے لیکن جب تک ایک شخص مسلک تصوف اختیار نہ کرے اس میں یہ صفت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے دستر خوان پر روزانہ کئی ہزار نفوس کھانا کھاتے تھے۔ ہر وقت حاجت مندوں کا میلہ لگا رہتا تھا لیکن آنجناب مال و دولت کی اس قدر فراوانی کے باوجود نانِ جویں پر اکتفا کرتے تھے اور کسی شخص سے کسی بات کے طالب نہیں تھے۔ بے ہمہ ہونا کیا ہے انسانوں کو حاجت روانہ سمجھنا اس لئے کسی انسان سے دل نہ لگانا، کسی سے توقع نہ رکھنا اور باہمہ ہونا کیا ہے انسانوں کو فائدہ پہنچانا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ خوش نصیب وہ ہے جو غیر اللہ یعنی دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دے اور اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود، مطلوب اور مقصود بنا لے۔ لیکن وہ لوگ جو دنیا سے دل لگاتے ہیں اور ساری زندگی اسی کے حصول کے لئے تگ ودو کرتے رہتے ہیں دنیاوی عیش و آرام تو حاصل کر پاتے ہیں لیکن نہ تو خدا کی خوشنودی ان کو میسر آتی ہے اور نہ ہی وہ نیابت کے اُس مقام پر فائز ہو پاتے ہیں جو خدا نے اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے انسان کے لئے مخصوص کیا ہے :

اے خوش آن مردے کہ دل باکس نداد

بند غیر اللہ را از پا کشاد

(ص ۸۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے صدق دل سے اللہ ہو کہا تو کائنات کا تصور میرے ذہن سے اس طرح دور ہو گیا جس طرح کپڑے جھاڑنے سے گرد دور ہو جاتی ہے گویا جب میں مقام فناء کلی پر فائز ہوا تو یہ ساری کائنات فنا ہو گئی اور غیر اللہ کا وجود باقی نہ رہا۔ جب غیر اللہ کا وجود فنا ہو گیا تو میں بھی کب باقی رہا کیونکہ جو مضراب یعنی اللہ ہو کی ضرب میں نے اپنی ہستی کے تاروں پر لگائی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارے تار میرے آنسوؤں کی مانند ٹوٹ گئے اور میری ہستی کا ساز ختم ہو گیا۔

زجانم نغمۂ اللہ ہو ریخت
چو گرد از رخت ہستی چار سو ریخت
بگیر از دستِ من سازے کہ تارش
زسوزِ زخمہ چون اشکم فرو ریخت
(ص ۱۰۱۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ دل کی دنیا مادی دنیا سے بالکل مختلف ہے اس میں نہ رنگ وبو ہے، نہ پستی و بلندی ہے، نہ کاخ وکو ہے، نہ زمین وآسمان ہے، نہ چار سو ہے صرف اللہ ہو ہے مراد یہ کہ جب سالک کے دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں تو اس پر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ لا موجود الا اللہ یعنی اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی موجود نہیں ہے :

جہان دل جہان رنگ و بو نیست
درو پست و بلند و کاخ و کو نیست
زمین و آسمان و چار سو نیست
درین عالم بجز اللہ ہو نیست
(ص ۱۰۰۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

عشق الٰہی پر مبنی علامہ اقبال کے اس قسم کے اشعار اپنی جگہ لیکن اس حوالے سے ایک بات بے حد قابلِ غور ہے کہ سبکِ عراقی کے صوفی شعراء عشق کے والہانہ جذبے سے معمور ہو کر محویت اور استغراق اور سوز و مستی کی کیفیت دوام سے لذت حاصل کرنے پر اصرار کرتے رہے اور اس وجد و سرور نے ان کے اندر دروں بینی کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جس کی بدولت وہ کائنات کے خارجی عناصر سے بے تعلق ہو کر رہ گئے۔ وہ ان عناصر پر حکومت کرنے کی بجائے دل کی پُر اسرار کائنات میں ڈوب جانے کو ترجیح دیتے رہے اور اس کیفیت میں سکون، طمانیت اور وجد و مستی محسوس کرتے رہے۔ لیکن علامہ اقبال نے خارجی دنیا کے تصرف اور عناصر فطرت کی تسخیر کو بھی عشق کا خاصہ قرار دیا۔ کیونکہ خلوت و جلوت کے امتزاج ہی سے عشق کی پوری قوت و توانائی کا اظہار ممکن ہے خلوت میں روح کی تربیت ہوتی ہے لیکن اس باطنی تربیت کا نتیجہ جلوت میں ظاہر نہ ہو تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ جلوت کے بغیر یہ خلوت رہبانیت کی طرف لے جاتی ہے اور اس عشق سے محروم کر دیتی ہے جو فعال بھی ہے اور خلاق بھی۔

اسی لئے ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بقول :

"اقبال کا تصور عشق دوسرے شعراء کے متصوفانہ یا رسمی عشق سے بالکل مختلف ہے عشق ان کے یہاں زندگی کا ایک زبردست محرک عمل ہے جو ایک طرف

تسخیر کائنات میں انسان کی مدد کرتا ہے تو دوسری طرف اسے کائنات کے ساتھ متحد رکھتا ہے۔(۳۲)

پروفیسر حسن اختر بھی اپنی کتاب اطراف اقبال میں اقبال اور صوفی کے تصور عشق کے اختلاف پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"صوفیاء کا عشق نفی تمنا سے جنم لیتا ہے۔ مگر اقبال کا عشق تمنا کی بقا کا ضامن ہے۔ اسی تمنا کی بدولت وہ آگے بڑھتا رہتا ہے صوفیا کا عشق غاروں میں چھپ جاتا ہے اور اقبال کا عشق ستاروں پر کمند ڈالنے کے منصوبے بناتا ہے۔"(۳۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ تو اس ضمن میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ :

"اقبال اور صوفیوں کے مابین اتنا فاصلہ ہے جتنا مشرق و مغرب میں ہے۔"(۳۴)

جس کا بنیادی سبب علامہ اقبال کی اپنی ایک تحریر ہے جو انہوں نے خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں ارسال فرمائی۔ لکھتے ہیں :

"میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا کیونکہ فلسفۂ یورپ بہ حیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنی فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"(۳۵)

علامہ اقبال نے قرآن تعلیمات کی روشنی میں اپنا فلسفہ خودی پیش کیا اس سلسلے میں پروفیسر حسن اختر اپنی کتاب اطراف اقبال میں لکھتے ہیں :

"اقبال نے نفی وجود کی بجائے اثبات وجود کا نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے صوفیاء کے نظریات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لیا اور پھر اپنا فلسفہ خودی پیش کیا جو قرآنی مقاصد کو بروئے کار لاتا ہے۔"(۳۶)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں بھی :

"ان کا فلسفۂ خودی و بے خودی یا پیغام سراسر قرآن حکیم کے مطالب سے ماخوذ ہے۔"(۳۷)

جبکہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بقول :

"اقبال کا تصور عشق اپنے ہر پہلو میں فلسفۂ خودی کے ساتھ وابستہ ہے۔" (۳۸)

اس حوالے سے حیاتِ اقبال سے ایک واقعہ ملاحظہ ہو :

> "ایک دن ایک بزرگ فقیر اقبال کے پاس آئے۔ باتیں ہوئیں۔ اقبال نے فرمایا: سائیں جی میرے لئے دعا کیجئے۔ وہ کہنے لگے کیا آپ کو دولت مطلوب ہے ؟ فرمانے لگے نہیں۔ پھر فقیر نے پوچھا: کیا دنیا میں عزت و مرتبہ چاہتے ہو ؟ نہیں مجھے یہ بھی نہیں چاہئے۔ سائیں نے پوچھا: تو پھر آپ خدا سے ملنا چاہتے ہیں ؟ اس پر اقبال کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی۔ فرمایا: خدا سے ملنا ؟ میرا اس کا واسطہ صرف عبادت سے ہے۔ ملنا کیا معنی ؟ مجھے اگر معلوم ہو جائے کہ خدا مجھ سے ملنے آرہا ہے تو میں بیس کوس بھاگ جاؤں اس لئے کہ دریا قطرے سے ملے گا تو قطرہ غائب ہو جائے گا۔ میں قطرے کی حیثیت سے قائم رہنا چاہتا ہوں اور اپنے آپ کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ قطرہ رہ کر اپنے میں دریا کے خواص پیدا کرنا چاہتا ہوں اس پر سائیں جی بے خود ہو کر جھومنے لگے :واہ اقبال بابا!" تو خود فقیر ہے تجھے کسی فقیر کی دعا کی کیا ضرورت۔ (۳۹)

اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل بجا ہے کہ اقبال اور دیگر صوفی شعراء کے مقاصد نہ صرف مختلف ہیں بلکہ ایک دوسرے سے متخالف بھی ہیں۔ اقبال کے یہاں عشق کا مقصد خودی کا استحکام ہے اور صوفی کے یہاں اس کا مقصد خودی کا انہدام ہے۔ ایک عشق سے بقائے ذات کا اور دوسرا فنائے ذات کا کام لینا چاہتا ہے ایک کے لئے عشق خدا میں جذب ہو جانے کا نام ہے جب کہ دوسرے کے لئے خدا سے جدائی کا۔

یہی نہیں علامہ کی نظر میں عشق کی بہترین مثال رسول کریمؐ کی زندگی ہے جو خلوت اور جلوت کے صحیح امتزاج کی آئینہ دار ہے۔ اور ان کی تقلید ہی سے عشق کا جوہر نکھرتا ہے اور روحِ انسانی کو لازوال بنا دیتا ہے لیکن علامہ عشق کے سلسلے کو صرف انسان تک ہی محدود نہیں سمجھتے بلکہ اس کی روح کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں بھی جاری و ساری پاتے ہیں اور اسے کائنات میں تخلیق، نمو، ارتقا، حرکت اور نظم و ترتیب کا سرچشمہ بھی قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال کے یہاں عشق کے ان نئے مفاہیم کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اسرار خودی میں فرماتے ہیں کہ دل کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ لے جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں۔ اسی طرح عشق کے لئے عزت، نیک نامی اور ناموس کا سر و سامان ہو جا یعنی جو شخص اللہ کے رنگ میں رنگا جائے گا۔ اپنے آپ کو خدا کی رضا کے حوالے کر دے گا اللہ کے تمام حکموں پر عمل کرے گا اسی کے لئے زیبا ہو گا کہ عشق حق کا دعویٰ زبان پر لائے۔ وہ فرد یا مجموعہ افراد جسے عرفِ عام میں قوم کہتے ہیں۔ کیونکر خدا کی محبت کا مدعی ہو سکتا ہے۔ جب تک اس کا ہر

عمل خدا کی رضا کے تابع نہ ہو۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ
(ص ۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

اور مسلمان کی فطرت محبت ہی کے بل پر غلبہ پاتی ہے اور سب پر برتری حاصل کر لیتی ہے جو مسلمان عشق و محبت سے خالی ہو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مسلمان نہیں کافر ہے اگرچہ زبان سے اسلام کا مدعی ہو۔ مسلمان کی فطرت یہ ہے کہ وہ عشقِ الٰہی میں ڈوبا رہتا ہے اور رسول پاکؐ کے اتباع میں ہر فرد کو محبت، پیار اور ہمدردی سے راہِ حق کی طرف لاتا ہے۔ جبر، سختی اور مظاہرۂ قوت کے لئے اس کی تبلیغ میں کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جبر سے دوسرے کو مجبور کیا جا سکتا ہے، دبایا جا سکتا ہے لیکن اس کے دل میں وہ کلمۂ حق نہیں اتارا جا سکتا جو اعمال کی بنیاد و اساس اور تخلیق کا حقیقی مقصود ہے جو مسلمان محبت کے اس مسلک پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلتا ظاہر ہے کہ اسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا :

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است
(ص ۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق کی قوت جاذبہ سے ہی دنیاوی زندگی کا نظام قائم ہے اور اسی کی بدولت اس کے مختلف اجزا و عناصر میں ربط و ضبط قائم ہے :

عشق آئین حیاتِ عالم است
امتزاج سالماتِ عالم است
(ص ۱۲۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ مومن کی ہستی عشق پر موقوف ہے اور عشق کا وجود مومن پر موقوف ہے مراد یہ کہ مومن عشق کے بغیر کچھ نہیں اور عشق حق کے لئے اگر کوئی مقام ہو سکتا ہے تو وہ صرف مومن کا دل ہے۔ عشق انسانوں میں ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ جو کام ناممکنات میں ہوتے ہیں وہ بھی امکان کے دائرے میں آجاتے ہیں یعنی انہیں پورا کر لینا بھی ممکن ہو جاتا ہے :

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکنِ ما ممکن است
(ص ۱۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق نے ہر دل میں مختلف النوع کیفیات پیدا کیں۔ کبھی اس نے پتھر سے موافقت پیدا کی اور کبھی شیشے کے ساتھ ہم آہنگ ہوا۔ تیرے دل میں گھر کیا تو تجھے تجھ سے چھینا اور آنسو بہاتا چھوڑ گیا اور میرے دل میں گھر کیا تو مجھے خود سے آشنا کر گیا :

بہر دل عشق رنگِ تازہ بر کرد
گہے با سنگ گاہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد
مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

(ص ۲۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

گویا عشق، مجازی ہو یا حقیقی انسان سے ہو یا خدا سے لوگوں کو دیوانہ بنا کر گلیوں میں روتا، آنسو بہاتا، پتھروں سے سر ٹکراتا چھوڑ جاتا ہے لیکن میرے نزدیک خود شناسی کا ذریعہ ہے اور یہی خود شناسی انسان کو رفتہ رفتہ خدا شناس کر دیتی ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عشق باغوں میں بادِ بہار لاتا ہے، صحراؤں میں ستاروں جیسے غنچے کھلاتا ہے اور قعرِ دریا میں مچھلی کو راستہ دیکھنے والی نگاہ عطا کرتا ہے کیونکہ اس کے سورج کی شعاعیں خشکی کے ساتھ ساتھ سمندر کا سینہ بھی چیرتی ہوئی گزر جاتی ہیں :

بباغاں بادِ فروردیں دہد عشق
براغاں غنچہ چون پرویں دہد عشق
شعاعِ مہراو قلزم شگاف است
بماہی دیدۂ رہ بین دہد عشق

(ص ۱۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق اس نہج پر فرمائی ہے کہ یہاں ہر ذرّہ محوِ خود نمائی ہے اور ہر شے ظہور کی آرزومند ہے۔ ظہور کی اسی خواہش اور نمود کے اسی جذبے کو اقبال نے عشق سے تعبیر کیا ہے اور ان کے نزدیک یہ جذبہ اس کائنات میں ایک فعال عنصر کی حیثیت رکھتا ہے مثلاً اسی کی بدولت باغوں میں بہار آتی ہے یعنی جوانوں میں عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور صحراؤں میں پھول کھلتے ہیں یعنی عمر رسیدہ حضرات میں کچھ کر دکھانے کی خواہش از سرِ نو جنم لیتی ہے مزید بر آں عشق کا یہ جذبہ زمینی مخلوقات کے علاوہ سمندر کی تہ میں موجود حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کی بدولت وہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے لئے ہر لمحہ کوشاں رہتے ہیں۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عاشق وہ نہیں جو عالم ہجر میں گریہ وزاری میں مشغول رہے عاشق وہ ہے جو ہتھیلی

پر دونوں جہان لئے پھرے اور جو اس دنیائے محدود سے موافقت نہ کرے بلکہ اپنی دنیا خود تعمیر کرے۔

عاشق آن نیست کہ لب گرمِ فغانے دارد
عاشق آن است کہ بر کف دو جہانے دارد
عاشق آن است کہ تعمیر کند عالمِ خویش
در نسازد بہ جہانے کہ کرانے دارد
(ص ۴۸۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عشق کا کام جامِ کائنات نوش کرنا ہے لہٰذا اے مخاطب! تو ایسا جام تلاش نہ کر جو تجھے دنیا کے حالات وواقعات دکھائے بلکہ ایسے ہاتھ یعنی طاقت کی خواہش کر جس کی بدولت تو دنیا کو فتح کر سکے:

عشق بسر کشیدن است شیشۂ کائنات را
جامِ جہاں نما مجو دست جہان کشا طلب
(ص ۵۰۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ خدا کے مقرر کردہ مقام تک پہنچنے یعنی ذاتِ حق کو بے پردہ دیکھنے کا نام زندگی ہے اسی لئے مردِ مومن یعنی عاشقِ خدا معشوق کی صفات کی تجلیات پر ہی مطمئن نہیں ہوتا اس کے دیدار کا بھی آرزومند ہوتا ہے کیونکہ حضرت محمد مصطفیؐ دیدار ذات سے کمتر درجے پر راضی نہ ہوئے تھے اور مردِ مومن بھی چونکہ حضرت محمد مصطفیؐ کا اتباع کرتا ہے لہٰذا وہ بھی دیدار ذات کو اپنا مقصود بناتا ہے۔ معراج مصطفیؐ در حقیقت خدا کے دیدار کی خواہش اور اس امتحان کا نام ہے جو انہوں نے عشقِ الٰہی میں اپنی پختگی اور استواری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے خدا کے حضور دیا کیونکہ خدا کی طرف سے اس پختگی اور استواری کی تصدیق کے بغیر انسان کی زندگی ایک بے رنگ وبو پھول کی مانند ہے اور جو شخص خدا کے حضور پختگی اور استواری کا مظاہرہ کرے وہی در حقیقت کامل عیار ہے یعنی مستحکم خودی کا مالک ہے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عشق یعنی عاشق جب تک خلوت میں رہتا ہے حق تعالیٰ سے راز و نیاز میں مصروف رہتا ہے لیکن جب جلوت میں آتا ہے تو انسانوں کے قلوب اور اجسام دونوں پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔

عشق در خلوت کلیم الٰہی است
چون بجلوت می خرامد شاہی است
(ص ۶۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

گویا اس کی حکمرانی سیاسی اقتدار کی شکل میں بھی ہو سکتی ہے اور روحانی اقتدار کی شکل میں بھی اور ہمارے سرکارِ دوعالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت مبارکہ میں یہ دنوں شانیں موجود تھیں۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق و مستی کی ابتداء قاہری یعنی جلال سے ہوتی ہے اور انتہا دلبری یعنی جمال پر ہوتی ہے :

ابتدائے عشق و مستی قاہری است
انتہائے عشق و مستی دلبری است
(ص ۸۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ سالک کے اندر پہلے شانِ جلال کا ظہور ہوتا ہے اس کے بعد شانِ جمال ظاہر ہوتی ہے جب وہ لاالہ کہتا ہے تو وہ ساری کائنات کی نفی کر دیتا ہے یہی شان جلال ہے کہ اس کی نگاہ میں کسی شے کی ہستی ہی باقی نہیں رہتی۔ پھر وہ الا اللہ کہتا ہے یعنی وہ ذات حق کا اثبات کرتا ہے یہی شان جمال ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی بدولت موجود ہے بذات خود معدوم ہے اب ان دونوں شانوں کی جلوہ گری سرکارِ دوعالمؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں دیکھیں۔ آپؐ نے پہلے کفر کو مٹایا اور دینِ حق کو قائم کیا اس کے بعد آپؐ کا وجود اہل عالم کے حق میں رحمت بن گیا یعنی پہلے آپؐ نے مکہ فتح کیا اس کے بعد اہلِ مکہ کو لاتثریب علیکم الیوم کا مژدہ سنایا۔ دراصل دنیا میں سرکار دوعالم صلعم شانِ جلال اور شانِ جمال کا مظہر اتم ہیں۔ آپؐ کی اتباعِ کاملہ سے بندۂ مومن میں بھی یہ دونوں شانیں جلوہ گر ہو جاتی ہیں جب بندۂ مومن کفر کا مقابلہ کرتا ہے تو گویا شانِ جلال کا مظاہرہ کرتا ہے اور جب وہ اللہ کے بندوں پر مہربانی کرتا ہے تو شانِ جمال کا اظہار کرتا ہے اور مومن کی زندگی کا مقصد یہی ہے کہ وہ اللہ کے دشمنوں سے جنگ کرے باطل کو مٹائے یہ شانِ جلال ہے اور اللہ کے بندوں پر مہربانی کرے، انہیں راحت پہنچائے یہ شانِ جمال ہے۔

پس چہ باید کرد میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ اپنی مرضی اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے یعنی احکام شریعت پر خلوص کے ساتھ عمل کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ بندہ قضائے حق بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی مرضی اللہ کی مرضی ہو جاتی ہے بالفاظ دگر اللہ کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو مومن چاہتا ہے :

چون فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود
(ص ۸۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کامیابی کا راز دو باتوں میں پوشیدہ ہے کہ عشق کا مقام و مرتبہ واعظانہ زندگی گزارنے سے نہیں مجاہدانہ زندگی گزارنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ جس طرح عودِ خالص کا جوہر آگ میں پڑ کر ہی عیاں ہوتا ہے اسی طرح مومن کے ایمان کو میدانِ جہاد میں جا کر ہی کمال حاصل ہوتا ہے اسی لئے ابراہیم یعنی سچے عاشق نمرودوں یعنی دشمنانِ خدا سے خوفزدہ نہیں ہوتے :

نہاں اندر دو حرفے سرکار است

مقام عشق منبر نیست دار است
براہیماں ز نمروداں نترسند
کہ عودِ خام را آتش عیار است
(ص ۱۰۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عشق کا مقام و مرتبہ صداقت اور یقین کا مادہ پیدا کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور صدق یقین پر مقدم ہے یعنی ہر وہ شخص جو یقین کا طالب ہو، اس یقین کا کہ سرکارِ دو عالمؐ بلا شبہ اللہ کے رسولؐ ہیں اُسے پہلے صدیق اکبرؓ کا سا صدق پیدا کرنا چاہئے کیونکہ اگر وہ فیضانِ صدیقیؓ سے محروم رہا تو فیضانِ رسالتؐ سے بھی محروم رہے گا اور یقین کا مادہ روح الامین کی صحبت اختیار کرنے یعنی قرآن پاک میں تدبر کرنے سے حاصل ہوتا ہے پس اگر تیرے اندر صدق و یقین کا رنگ پیدا ہو جائے تو پھر بے کھٹکے تسخیر کائنات کے لئے نکل کھڑا ہو کوئی طاقت تیرے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گی:

مقامِ شوق بے صدق و یقیں نیست
یقیں بے صحبتِ روح الامین نیست
گر از صدق و یقیں داری نصیبے
قدم بیباک نہ کس در کمین نیست
(ص ۱۰۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ مقصد حیاتِ مسلم خلافت الٰہیہ ہے اور خلافتِ الٰہیہ موقوف ہے تسخیر کائنات پر۔ تسخیر کائنات موقوف ہے مقامِ عشق پر۔ مقام عشق موقوف ہے صدق و یقین پر اور حصول یقین موقوف ہے صحبت روح الامین یعنی تدبر فی القرآن پر۔

یہاں ایک اور حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ فارسی شاعری میں تصوف کے داخل ہونے سے عقل و عشق کا موازنہ اور عقل و خرد کے مقابلے میں عشق کی ناقابلِ تردید اور مکمل برتری بھی شاعری کا ایک مرغوب موضوع قرار پایا۔

علامہ اقبال کے ہاں بھی ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول:

> "عقل کو کم تر حیثیت تفویض کرنے کا رویہ بڑی حد تک فارسی کی صوفیانہ شاعری سے مستعار ہے۔" (۴۰)

بلکہ پروفیسر انور صادق کے بقول عشق کو اہمیت دینے اور عقل کے مقابلے میں وجدان کو حقیقت کی تفہیم میں سب سے اہم حربہ قرار دینے کی۔

> "اس روایت کو جس کا آغاز غزالی اور رومی نے کیا تھا اقبال نے بیسویں صدی میں اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔" (۴۱)

لیکن علامہ اقبال کی نظر میں عشق اور عقل دونوں زندگی کی بنیادی قدریں ہیں اور زندگی کے ارتقا کے لئے دونوں کا تعاون لازمی ہے عقل اور عشق ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ان کی اساس ایک ہے اور عقل منتہائے کمال پر پہنچ کر وجدان یا عشق میں بدل جاتی ہے۔اسی لئے وہ عقل و خرد اور عشق وجدان کے نتائج کے امتزاج سے حیات و کائنات کے بارے میں وسیع تر نظر کی تشکیل پر زور دیتے ہوئے اپنے خطبات میں لکھتے ہیں کہ :

"حقیقت مطلقہ کے تمام و کمال بقا کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن پاک نے قلب سے تعبیر کیا ہے۔" (۴۲)

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ استدلالی عقلیت کے سخت مخالف ہیں انہیں اضطراب اس بات پر ہے کہ استدلالی عقلیت مسلمان کی روحانی اقدار کو سلب نہ کر لے۔ اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق ہی وہ افلاطون حکیم ہے جو عقل کی تمام بیماریوں کا علاج کر سکتا ہے عشق کا نشتر چلے تو عقل کا سودائی مادہ فوراً نکل جاتا ہے۔

عشق افلاطونِ علتہاے عقل

بہ شود از نشترش سودائے عقل

(ص ۶۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ساری دنیا عشق کے روبرو سجدے کر رہی ہے اور وہی سب کی سجدہ گاہ ہے اگر عقل کو سومنات فرض کر لیا جائے تو اسے عشق ہی کا محمود مسخر کر سکتا ہے :

جملہ عالم ساجد و مسجود عشق

سومناتِ عقل را محمود عشق

(ص ۶۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عقل اپنے مقصد کے لئے قدم اٹھانے سے پہلے اسباب و وسائل پر غور کرتی ہے ان کی فراہمی کی فکر میں رہتی ہے نیز یہ سوچتی ہے کہ فلاں قدم اٹھانے کا نتیجہ کیا ہوگا اس کے برعکس عشق عمل کے میدان کا شہ سوار ہے وہ ہمیشہ آگے بڑھتا ہے، سرگرم کار ہوتا ہے۔نہ اس امر کی پرواہ کرتا ہے کہ اسباب اور ساتھیوں کی کیا حال ہے۔نہ اس جھنجھٹ میں پڑتا ہے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ صرف یہ جانتا ہے کہ فلاں کام ہونا چاہئے اور اس کے لئے میدان میں اتر آتا ہے۔

عشق اپنے بازو کی قوت سے شکار کرتا ہے اور ہیر پھیر سے کام نہیں لیتا۔ عقل فطرتاً مکار ہے اور وہ مکر و فریب کے جال پھیلاتی ہے۔

عقل کا سرمایہ خوف اور شک کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس عشق سے عزم اور یقین جدا ہو ہی نہیں سکتے گویا عقل جد ہر قدم اٹھاتی ہے ڈرتے ہوئے اٹھاتی ہے اور اسے یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ عشق ایسی ہر بات سے آزاد ہے وہ عزم و یقین لے کر اٹھتا ہے اور ہر اچھے مقصد کے لئے اس انداز سے کام شروع کر دیتا ہے کہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا۔

عقل جو تعمیر کرتی ہے اس کا نتیجہ ویرانی ہوتا ہے لیکن عشق اس غرض سے ویران کرتا ہے کہ اسے مستقل طور پر آباد کرے مثلاً عقل دولت جمع کرتی ہے لیکن اس میں سینکڑوں گھرانوں پر بربادی اور تباہی کی آفتیں نازل ہوتی ہیں اور انجامِ کار عقل کی جمع کی ہوئی دولت بھی اس کے کام نہیں آتی۔ اس کے برعکس عشق خدمتِ عوام کا جذبہ لے کر اٹھتا ہے وہ دولت مندوں سے دولت لیتا ہے اور اسے حق داروں میں تقسیم کرتا ہے اور بظاہر اس کا یہ فعل دولت مندوں کی ویرانی کا مظہر ہے لیکن حقیقتاً سینکڑوں ضرورت مند گھرانے اس کی برکت سے آباد ہو جاتے ہیں۔

عقل اس دنیا میں ہوا سے بھی زیادہ سستی ہے عشق بہت کمیاب ہے اور اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

عقل چون و چند کی بنیاد پر مستحکم ہوتی ہے جبکہ عشق چون و چند کا روادار ہو ہی نہیں سکتا مراد یہ کہ عقل بال کی کھال نکالنے میں لگی رہتی ہے اور اسی کو بڑا کارنامہ سمجھتی ہے عشق ہر قدم پر نفع و نقصان کے ناپ تول میں نہیں رہتا وہ ایک بڑا مقصد سامنے رکھ کر ہمت سے اٹھتا ہے اور جب تک اسے پورا نہیں کر لیتا دم نہیں لیتا۔

عقل کہتی ہے کہ اپنے آپ کو آگے بڑھا یعنی دولت، عزت، حکومت اور شہرت حاصل کر۔ عشق کہتا ہے کہ آگے بڑھنے کا کیا مطلب ہے ؟ اپنے آپکو آزمانا چاہئے کہ حق کے لئے قربانی کس قدر دی جاسکتی ہے اور قربانی کا درجہ کیا ہے۔

عقل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسب سے حاصل کی جاتی ہے اور مشق سے بڑھ سکتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسے غیر سے آشنائی پیدا کرنے میں تامل نہیں ہوتا بشر طیکہ کوئی فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔ اس کے برعکس عشق صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔ وہ جسے چاہے اس دولت سے نواز دے اور غیر سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا وہ ہر وقت اپنے ہی حساب اور جانچ پڑتال میں مصروف رہتا ہے۔

عقل انسان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ راحت و شادمانی حاصل کرو اور مزے کی زندگی گزارو اس کے برعکس عشق یہ کہتا ہے کہ خدا کے سچے بندے بن جاؤ اور ماسوا کی غلامی اور محکومی سے آزاد ہو جاؤ :

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدان عمل
عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آن کند تعمیر تا ویراں کند
این کند ویراں کہ آباداں کند
عقل چون باد است ارزاں در جہاں
عشق کمیاب و بہائے او گراں
عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریاں از لباس چون و چند
عقل می گوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن
عقل باغیر آشنا از اکتساب
عشق از فضل است و باخود در حساب
عقل گوید شاد شو آباد شو
عشق گوید بندۂ آزاد شو

(ص۱۰۹کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب عقل سے اپنا تعلق منقطع کر لے اور عشق کے سمندر کی موج تھام لے کیونکہ عقل کی چھوٹی سی ندی میں موتی نہیں مل سکتا مراد یہ کہ عقل کے سہارے کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ جبکہ عشق ہمیں کائنات کی تسخیر کا حوصلہ عطا کرتا ہے:

بگذر از عقل و در آویز بموجِ یم عشق
کہ در آں جوے تنک مایہ گہر پیدا نیست

(ص۳۴۰کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ مجھے عقل کی بدولت اپنی ہستی کا یقین حاصل نہ ہو سکا۔ کیونکہ ایک طرف وہ میری ہستی کا اثبات کرتی رہی تو دوسری طرف میرے وجود میں شبہات بھی وارد کرتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اپنے وجود کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا جبکہ عشق نے مجھے میرے ہونے کا یقین عطا کیا:

در بودو نبود من اندیشہ گمانہا داشت

از عشق ہویدا شُد این نکتہ کہ ہستم من

(ص ۳۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عقل اور عشق دونوں منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں اور دونوں قافلے کے رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عقل اس کام کے لئے تدابیر کا سہارا لیتی ہے جبکہ عشق کو اس قسم کا کوئی سہارا درکار نہیں ہوتا :

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں
عقل بحیلہ می بُرد، عشق برد کشاں کشاں

(ص ۴۱۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے عشق کے فیض سے اپنی عقل کو اُس مقام رفیع تک پہنچادیا ہے کہ اس کی پیروی میں میرے لئے دنیا کو روشن کرنے والے سورج کی آنکھ تک کا حصول ممکن ہو گیا ہے بالفاظ دگر میرے لیے ستاروں کی تسخیر آسان ہو گئی ہے :

زفیض عشق و مستی بُردہ ام اندیشہ را آنجا
کہ از دنبالہ چشمِ مہر عالمتاب می گیرم

(ص ۴۹۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ انسان اپنی عقل کی بدولت کائنات کو مسخر کر سکتا ہے لیکن عشق کی بدولت لامکان کو بھی اپنے تصرف میں لا سکتا ہے :

عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند

(ص ۶۰۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عشق سے عاری علم و حکمت غیر نفع بخش اور ضرر رساں ہوتی ہے اور عشق کی مدد کے بغیر عقلِ انسانی کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پاتی :

بے محبت علم و حکمت مردۂ
عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ

(ص ۶۶۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عقل اگر دل کی مطیع ہو جائے تو انسان کو اللہ تک پہنچا دیتی

ہے یعنی نیک بنا دیتی ہے لیکن اگر دل کی گرفت سے آزاد ہو جائے تو اسے شیطانیت پر مائل کر دیتی ہے۔

عقل اندر حکم دل یزدانی است

چون ز دل آزاد شد شیطانی است

(ص ۸۴۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ دُنیا والے عشق کی حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عشق اور عقل میں تضاد ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یعنی عشق وہ قبا ہے جو عقل کی قامت پر بالکل موزوں ہے:

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را

جنوں قباست کہ موزوں بقامت خرد است

(ص ۸۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ عشق اور عقل میں مطابقت پائی جاتی ہے عشق کا مطالبہ انسان سے یہ نہیں ہے کہ وہ عقل کو خیرباد کہہ دے بلکہ وہ اسے یہ تعلیم دیتا ہے کہ اپنی عقل کو میرے تابع فرمان بنا دو تا کہ تم گمراہی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اگر انسان میں محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو نہ وہ خودی کی طاقت سے آگاہ ہو سکتا نہ فطرت کی غلامی سے آزاد ہو سکتا۔ اور نہ عقل کی گرفت سے رہائی حاصل کر سکتا:

نہ نیروے خودی را آزمودے

نہ بند از دست و پائے او کشودے

خرد زنجیر بودے آدمی را

اگر در سینۂ او دل نبودے

(ص ۱۰۰۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ انسان حواسِ خمسہ سے مادی اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے بعد عقل ان مشاہدات کو اپنے وضع کردہ پیمانوں سے ناپنا چاہتی ہے لیکن چونکہ وہ ناقص ہے اور اس کے پیمانے بھی ناقص ہیں اس لئے تمام عمر پیمائش میں ہی بسر ہو جاتی ہے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یعنی صحیح اور یقینی علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دل کی صفت یہ ہے کہ وہ نہ حواس خمسہ کا محتاج ہے نہ آلات ووسائل یعنی استنباط واستخراج واستدلال کا دست نگر ہے بلکہ وہ ایک نگاہ سے ساری کائنات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے مراد یہ ہے کہ صاحبِ عقل تو اس کائنات کی وسعت میں گم ہو جاتا ہے لیکن صاحب دل کی کیفیت بالکل جداگانہ ہے یعنی ساری کائنات اس کے دل کی وسعت میں گم ہو جاتی ہے:

نگہ دید و خرد پیمانہ آورد

کہ بپیماید جہان چار سو را
مے آشامے کہ دل کردند نامش
بخویش اندر کشید این چار سوئے
(ص ۱۰۰۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

۳ ۔ ابلاغ و اظہار مفہوم کے اسالیب
یعنی تراکیب، تشبیہات، استعارات، تلمیحات
اور کنایے کا ماہرانہ استعمال

علامہ اقبال کے چند شعر ہیں :

نہ بینی خیر ازان مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست
(ص ۸۳۸ ۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را
(ص ۷۴۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

نہ شعر است این کہ بروے دل نہادم
گرہ از رشتۂ معنی کشادم
بامیدے کہ اکسیرے زند عشق
مسِ این مفلساں را تاب دادم
(ص ۹۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ندانم نکتہ ہائے علم و فن را
مقامے دیگرے دادم سخن را
میانِ کارواں سوزو سرورم
سبک پے کرد پیرانِ کہن را
(ص ۱۰۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس کے باوجود علامہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر تھے بلکہ فن کی خصوصی شعریت وجودت اور سحر واثر بھی ان کی نگاہ میں واضح تھا۔ فرماتے ہیں :

زشعرِ دلکش اقبال می تواں دریافت
کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی وزرید
(پیامِ مشرق)

فن اگر سوزے ندارد حکمت است

شعر می گردد چوسوز از دل گرفت

(پیامِ مشرق)

برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است

مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

(پیامِ مشرق)

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند

چہ آید زاں غزل خوانے کہ بافطرت ہم آہنگ است

(زبورِ عجم)

خوشا کسے کہ فرو رفت در ضمیر وجود

سخن مثالِ گہر برکشید و آسان گفت

(زبورِ عجم)

ان اشعار میں اقبال نے اپنی فارسی شاعری کی خصوصیات کے متعلق اہم تنقیدی نکتوں کی خود ہی وضاحت کر دی ہے اول یہ کہ انہوں نے شاعرانہ نزاکتوں کی پوری رعایت کی ہے دوم ان کا نغمہ فسردہ نہیں آتش ناک ہے اور دو بظاہر مختلف اوصاف کی یک جائی سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ فن کی لطافت فکر کی صلابت سے ہم آہنگ ہے۔ یعنی عجم کے حسنِ طبیعت میں عرب کا سوزِ دروں پوشیدہ ہے۔ بقول ڈاکٹر عبدالمغنی :

> " اقبال فکر اور فن کے اس حد تک جامع ہیں کہ ان کی فکر ہی شاعرانہ یا شعر مفکرانہ معلوم ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ شعر کی ساری لطافت فکر کی رفعت اور اسی طرح فکر کی ساری بلندی شعر کی رعنائی کا عکس ہے ان دونوں عناصر میں تمیز و تقسیم ناممکن ہے۔ بیک وقت بصیرت اور مسرت کا یہ دو آتشہ عظیم استعداد اور کثیر ریاض کا حامل ہے۔ معنیٔ رنگین اس خونِ جگر سے پیدا ہوا ہے جو انتہائی دماغ سوزی اور دل گدازی سے بروئے کار آیا ہے۔" (۴۳)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

> انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے وقت تک کے دریافت شدہ تمام علوم و فنون اور عصر حاضر کے تمام واقعات و حوادث کو اپنے دراک ذہن میں ہضم و جذب کیا بلکہ .... شاعری کے تمام محاورات و استعارات اور تلمیحات و کنایات پر مکمل عبور

حاصل کر کے ان کو اپنی طبع شاعرانہ کا جزو بنا دیا۔ اس حد تک کہ انہی کے بقول وہ عروض کے تمام اصطلاحی نکات سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود شعر گوئی کے لمحۂ تخلیق میں "فاعلاتن فاعلاتن فاعلات سے بالکل بے نیاز ہوتے تھے۔ اس کو کہتے ہیں ملکۂ شعری، یعنی فطرت موزوں کے ساتھ ریاضت فن کا ایسا کامل امتزاج جو عادت بن جائے۔"(۴۴)

علامہ کے کلام میں بلا شبہ ابلاغ و اظہار مفہوم کے وہ تمام اسالیب یعنی تراکیب، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور کنایہ وغیرہ موجود ہیں جو کسی بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں موجود ہوتے ہیں اور وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ دکھائی دیتے ہیں کہ یہ اسالیب صنعت گری کے کمال کو اس وقت پہنچتے ہیں جب توضیح مطلب کا فریضہ ادا کریں ورنہ خیرہ سری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اور صنعت گری کا یہ کمال ان کے یہاں ابلاغ و اظہار مفہوم کے تمام اسالیب میں دیکھنے کو ملتا ہے مثلاً ترکیب سازی سبکِ عراقی کے شعراء کی قوتِ تخیل، جمالیاتی شعور اور تخلیقی استعداد کی روشن دلیل رہی ہے جس سے انہوں نے اپنے کلام میں معنویت اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال کے گہرے جمالیاتی شعور اور خلاق ذہن نے بھی نہایت خوبصورت اور دلکش تراکیب وضع کیں لیکن ترکیب سازی ان کے ہاں محض ایک فنی تقاضا نہیں بلکہ ایک فکری ضرورت بھی رہی اس لئے انہوں نے سید سلیمان ندوی کو ایک خط مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء میں لکھا :

"............بعض تاثرات کے اظہار کے لئے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔ اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضرور ہے کہ اہلِ زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں............"(۴۵)

اور پروفیسر حمید احمد خان نے بھی اسی حوالے سے فرمایا کہ :

"اقبال نے .... خود ادعائیت کو شاعری کا محور بنایا۔ اقبال کو اس نئے مضمون کے بیان کے لئے بداہتہً ایک نئے اسلوب کی ضرورت تھی۔ یہ اسلوب اقبال کی نئی اصطلاحات و تراکیب میں ظاہر ہوا۔"(۴۶)

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں مدتوں سعی و کوشش میں مصروف رہا اور جدید علم و دانش سے آگاہ ہوا۔ استادانِ علم و فن نے میرا امتحان لیا اور مجھے اس باغ کی ہر چیز سے آشنا کر دیا لیکن اس آشنائی کے باوجود میں جدید علم و دانش کے بارے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ باغ نہیں عبرت کا لالہ زار ہے اور کاغذ کے ان پھولوں کی مانند ہے جنہیں خوشبو کا سراب کہنا چاہیئے۔ مراد یہ کہ جدید علم و فن کی ظاہری رنگت بڑی دلکش دکھائی دیتی ہے لیکن ان کے اندر عبرت کے سوا کچھ نہیں۔ کاغذی پھولوں کی طرح یہ خوشنما بہت ہیں لیکن خوشبو سے خالی ہیں :

مدتے محو تگ و دو بودہ ام
راز دانِ دانشِ نو بودہ ام
باغبانان امتحانم کردہ اند
محرمِ این گلستانم کردہ اند
گلستانے لالہ زار عبرتے
چون گلِ کاغذ سراب نکہتے
(ص ۶۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں لالہ زار عبرت اور سراب نکہت انتہائی دلکش اور نادر تراکیب ہیں۔

اسرار خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ جس طرح رسولؐ اللہ نے غارِ حرا میں گوشہ نشینی فرمائی تھی اُسی طرح تو بھی کچھ مدت کے لئے دل کے غارِ حرا میں بیٹھ جا یعنی دل کو ذکر و فکر کا شیدائی بنالے اور تمام ذاتی اغراض سے پاک ہو جا اور جب تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں پختہ اور استوار ہو جائے تو اپنی ذات کی طرف گامزن ہو اور ہوا و ہوس نے جو بُت تراش کر تیرے پہلو میں کھڑے کرر کھے ہیں ان سب کو ریزہ ریزہ کرڈال :

اندکے اندر حراے دل نشیں
ترک خود کن سوے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو سوے خود گامزن
لات و عزاے ہوس را سر شکن
(ص ۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں حراے دل ایک پُر معنی ترکیب ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میں نے یقین کے علم کا ایک حرف بھی نہ پڑھا اور فلسفے کی اس بستی میں پڑا رہا جس کا سرمایہ وہم و گمان کے سوا کچھ نہ تھا :

حرفے از علم الیقین ناخواندۂ
در گماں آبادِ حکمت ماندۂ
(ص ۱۶۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں گمان آباد حکمت ایک حسن آفرین ترکیب ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور چیز کا خوف عمل کی قوت ختم کر دیتا ہے اور زندگی

کے قافلے کو لوٹ لیتا ہے انتہائی مضبوط ارادے والے انسان پر بھی جب اس کی پر چھائیاں پڑ جائیں تو وہ سوچنے لگے گا کہ عملی قدم اٹھانے سے کیا کیا نتائج سامنے آئیں گے اس طرح اس کا عزم تذبذب میں پڑ جائے گا اور وہ اعلیٰ درجے کی ہمت کے مظاہرے سے قبل سوچ بچار کو اپنی عادت بنالے گا۔اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سوچ بچار یا عقلِ سلیم سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ سوچ بچار کی بھی ایک حد ہوتی ہے اس کو اس انتہا تک قطعاً نہیں لے جانا چاہئے جہاں عمل کی قوت مضمحل ہوتے ہوتے ختم ہو جائے۔بلاشبہ سوچ بچار کی زیادتی انسان کی عملی قوت کو شل کر کے رکھ دیتی ہے :

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است
عزمِ محکم ممکنات اندیش ازو
ہمتِ عالی تامل کیش ازو

(ص ۹۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں ممکنات اندیش اور تامل کیش انتہائی دلکش تراکیب ہیں۔

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس پروانے کی داستان مت سناؤ جو اپنے آپکو شمع کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے کیونکہ اس کے جل مرنے کی کہانی کانوں تک پہنچنے والی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ میں تو اس پروانے کو پروانہ یعنی حقیقی عاشق سمجھتا ہوں جو سخت کوش اور شعلہ نوش ہے یعنی مجاہد ہے اور محبوب کی صفات کو آہستہ آہستہ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے یہاں تک کہ اس کی شخصیت سے محبوب ہی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے :

بہل افسانۂ آن پا چراغے
حدیثِ سوزِ او آوازِ گوش است
من آن پروانہ را پروانہ دانم
کہ جانش سخت کوش و شعلہ نوش است

(ص ۲۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں شعلہ نوش کی ترکیب علامہ اقبال کے خلاق ذہن کی عکاس ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب !اگر تجھ میں حقیقت سے آگاہ ہونے کی تڑپ نہیں ہے تو تجھے میرے کلام سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ دوسرے شعراء تو محض پھولوں کا حال بیان کرتے ہیں لیکن میں نے اپنے کلام میں رگِ گل کے باطن تک کو آشکار کر دیا ہے اس لئے میری بہار یعنی میرا کلام طلسم رنگ وبو یعنی محض لفاظی نہیں ہے بلکہ حقیقت رس ہے لہذا حقیقت نما ہے :

زیاں بینی ز سیر بوستانم
اگر جانت شہید جستجو نیست
نمایم آنچہ ہست اندر رگِ گل
بہار من طلسم رنگ و بو نیست
(ص ۲۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں طلسم رنگ وبو ایک مصورانہ ترکیب ہے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا تو حاضر کو بھی آراستہ کرتا ہے اور مستقبل کی تحریریں بھی رقم کرتا ہے لہذا اصلی نقاش تو ہے ہم تو محض قلم زنی میں مصروف ہیں :

نقش پرداز توئی ما قلم افشانیم
حاضر آرائی و آیندہ نگاری از تست
(ص ۴۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں حاضر آرائی اور آیندہ نگاری انتہائی دلکش اور نادر تراکیب ہیں۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے ساقی ! مجھے شعلوں جیسی تاثیر رکھنے والی شراب پلا اور میرے بدن سے قیامت کے فتنے اٹھا :

ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز
(ص ۴۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں شعلۂ نمناک ایک حسن آفرین ترکیب ہے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومی نے فرمایا کہ چمکتی چاندی جیسا یہ بدن یعنی سروش ذہن خداوندی کی تخلیق تھا اور چونکہ نمود کا بھی آرزومند تھا لہذا انتہائی بے قراری سے شبستان وجود یعنی دنیا میں ظہور پذیر ہوا :

گفت این پیکر چو سیم تابناک
زاد در اندیشۂ یزدانِ پاک
باز بے تابانہ از ذوقِ نمود
در شبستانِ وجود آمد فرود
(ص ۶۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں شبستان وجود ایک خوبصورت ترکیب ہے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی آفرینش سے پہلے حیات یعنی انائے مطلق یا ذات حق ایک وحدت تھی لیکن اس میں ظہور کی آرزو موجزن تھی اس لئے وہ تعینات کے لباس میں ظاہر ہوئی یعنی زمان و مکان کی قید میں آگئی اور جب زندگی مقید ہوئی تو انائے مقید نے زمانِ حقیقی کی نوعیت کو فراموش کر کے اس کو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کر دیا۔ بالفاظ دگر زمانِ مسلسل کا تصور پیدا کر کے حیرت خانۂ ایام یعنی روز و شب کی بنیاد ڈالی اور جب حیات یعنی انائے مطلق یا ذات حق افراد کے لباس میں مقید ہو گئی تو ہر فرد میں یہ ذوق پیدا ہوا کہ وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھے کیونکہ کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ اس کی شخصیت کسی دوسرے کی شخصیت میں مدغم ہو جائے لہٰذا اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کی غرض سے ہر فرد نے من دیگرم تو دیگری کا نعرہ بلند کیا بالفاظ دگر من و تو کا امتیاز پیدا ہو گیا:

زندگی از لذتِ غیب و حضور
بست نقشِ این جہان نزدو دور
ہر کجا از ذوق و شوقِ خودگری
نعرۂ من دیگرم تو دیگری
(ص ۶۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں رنگِ حیرت خانۂ ایام اور ذوق و شوق خودگری مصورانہ تراکیب ہیں۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ! میرے حال زار پر محبت کی ایک نگاہ کیجئے۔ چونکہ میری نگاہ میں کائنات آپؐ ہی کے گرد گھومتی ہے یعنی آپؐ ہی کائنات کا مدعا ہیں لہٰذا میں آپؐ سے اپنا حال دل نہ کہوں تو کس سے کہوں۔ چونکہ میں باطل پرستوں کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوں اس لئے میں آپ سے ملتجی ہوں کہ آپ میرے چراغ میں پھر سے روغن ڈال دیجئے۔ یعنی مجھے صحت عطا کر دیجئے۔

گردِ تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہِ التفات
با پرستاران شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز
(ص ۸۴۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں حریم کائنات اور پرستارانِ شب انتہائی خوبصورت تراکیب ہیں۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی ذات پاک عشق کے قافلے کی منزل مقصود ہے کیونکہ آپؐ کو بنی آدم

سے وہی نسبت ہے جو دل کو جسدِ انسانی سے ہوتی ہے اور جس طرح دل کے بغیر جسم مردہ ہوتا ہے اسی طرح آپؐ کی محبت کے بغیر انسان مردہ ہے گویا آپؐ کی ذات مرکزِ حیات ہے :

کاروانِ شوق را او منزل است
ماہمہ یک مشتِ خاکیم او دل است
(ص ۸۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں کاروانِ شوق ایک دلکش ترکیب ہے۔

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے ابنِ مسعود! اگرچہ تو نجد اور حجاز کا حکمران ہے اور میں فقیر ہوں لیکن جہاں تک اسلام کی حقیقت سے آگاہی کا تعلق ہے میں امیر ہوں اور تو فقیر ہے کیونکہ وہ جہان جو توحید الٰہی کے عقیدے اور اس کے اقتضا پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے وہ جہاں، وہ عالم یاوہ رنگ میرے دل میں بخوبی جلوہ گر ہے۔

تو سلطانِ حجازی من فقیرم
ولے در کشورِ معنی امیرم
جہانے کو ز تخم لاالہ رُست
بیا بنگر بآغوش ضمیرم
(ص ۹۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں آغوشِ ضمیر ایک حسن آفرین ترکیب ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میں اس دنیا سے عنقریب رخصت ہونے والا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ مجھ جیسا قرآن حکیم کے حقائق و معارف سے آگاہ اور قوم کو شاعری کے ذریعے اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے والا انسان پھر کبھی پیدا ہوگا یا نہیں :

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟
(ص ۹۸۴ کلیات اقبال فارسی)

ان اشعار میں دانائے راز ایک نادر اور پُر معنی ترکیب ہے۔

☆☆☆

تراکیب کے ساتھ ساتھ تشبیہات واستعارات بھی ابلاغ واظہار مفہوم کے اسالیب ہیں جو بقول ڈاکٹر عبدالمغنی :

"ایمائیت و اشاریت کو بروئے کار لانے کے لئے روایتی...... فنی وسائل......
ہیں۔"(۴۷)

جبکہ مولانا عبدالسلام ندوی کنایہ اور تلمیح کو بھی اس کے فنی وسائل شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

"رمزیت یعنی ایک مضمون کو استعارہ کنایہ اور قصص و حکایات کے ذریعے بیان
کرنا۔"(۴۸)

علامہ اقبال کے ہاں رمزیت وایمائیت کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ وہ اسی کو کمالِ گویائی سمجھتے ہیں۔ پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی ست
حدیث خلوتیاں جزبہ رمز و ایمانیست
(ص ۳۳۰ کلیات اقبال فارسی)

یعنی عاشقوں کی گفتگو ہمیشہ رمز وایماء کے پردے میں ہوتی ہے کیونکہ اسی وصف کی بدولت گفتگو کو کمال حاصل ہوتا ہے۔

پیام مشرق میں ایک اور جگہ رمز وایماء میں بات کرنے کا ذکر یوں کرتے ہیں :

پردہ برگیرم و درپردہ سخن می گویم
تیغ خونریزم و خود را بہ نیامے دارم
(ص ۳۴۴ کلیات اقبال فارسی)

یعنی میں رمز وایماء کے پردے میں حقائق کو آشکار کرتا ہوں اور تلوار کی مانند ہوں لیکن نیام میں رہتے ہوئے قتل و غارت گری کرتا ہوں۔

علامہ اقبال کی ساری شاعری بلاشک وشبہ رمز وایماء کے پردے میں ہے اور انہوں نے رمزیت وایمائیت کے تمام فنی وسائل یعنی تشبیہ استعارہ کنایہ اور تلمیح کو انتہائی خوبی اور مہارت سے اپنے کلام میں استعمال کیا۔



تشبیہات واستعارات سے انہوں نے اپنے مخصوص پیغام کے ابلاغ میں مدد لی۔ شعر کی معنویت میں تاثیر اور شدت پیدا کی اور اپنے مفاہیم کو زیادہ صراحت اور دلآویزی کے ساتھ قاری کے ذہن پر نقش کیا اس لئے جہاں ایک طرف بقول عبدالشکور احسن تشبیہات واستعارات اقبال سے :

"شاعر کے تخیل کی وسعت اور بو قلمونی کا اندازہ ہوتا ہے اس کے شعورِ جمال کی روشن دلیل بھی ملتی ہے اور اس کے مصورانہ ذوق کا بھی اظہار ہوتا ہے۔" (۴۹)

وہاں دوسری طرف ان کے تشبیہات واستعارات روایتی شاعری کے تشبیہات واستعارات بھی محسوس نہیں ہوتے اور نہ ہی علامہ ان سے محض حسن آفرینی یا خیال افروزی کا کام لیتے ہیں۔ بلکہ بقول سید عابد علی عابد :

اقبال کے کلام میں اکثر وبیشتر تشبیہات واستعارات کے استعمال کا مقصد محض آرائش کلام نہیں بلکہ توضیح معنی ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ فطرتِ خارجی کے مناظر کی تصویریں کھینچتے ہیں تو تشبیہات واستعارات میں وہ نزاکت نہیں ہوتی جو ان کے کلام کا شیوہ خاص ہے۔ ہاں جب یہ دقیق تعقلات، باریک تصورات اور لطیف افکار و اسرار کی توضیح کرنا چاہتے ہیں تو ایسی ایسی خوبصورت تشبیہیں اور استعارے استعمال کرتے ہیں کہ ان دیکھی چیزیں دیکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ خارجی حقائق کی تصویر کشی ان کے ہاں ہمیشہ رسمی ہوتی ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ فطرت کے کسی منظر کی تصویر کھینچتے ہوئے وہ نہایت نادر اور لطیف تشبیہات استعمال کریں۔ لیکن اکثر وبیشتر ان کے ہاں تشبیہ واستعارے کی خوبی، لطافت اور نزاکت اُسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ ان پر اسرار کیفیات کا بیان کرتے ہیں جن کا تعلق ان کے وجود معنوی سے ہے۔ اپنے کوائف باطنی اور واردات قلبی کے بیان میں وہ حیرت انگیز قوتِ ابلاغ واظہار کا ثبوت مہیا کرتے ہیں۔" (۵۰)

علامہ اقبال کے یہاں تشبیہات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اسرارِ خودی میں ایک جگہ قطرۂ شبنم کے لئے اشکِ چشم بلبل کی تشبیہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پھول کی ایک شاخ پر شبنم کا قطرہ بلبل کے آنسو کی طرح دمک رہا تھا :

قطرۂ شبنم سر شاخِ گلے
تاخت مثل اشک ۔ چشم بُلبلے

(ص ۵۴، کلیاتِ اقبال فارسی)

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ اپنے ہمعصروں کی شاعری کو شبنم سے اور اپنی شاعری کو سمندر سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے دوستوں کی شاعری جو سمندر کی حیثیت رکھتی ہے شبنم کی طرح جوش وخروش سے عاری ہے جبکہ میری شاعری شبنم ہوتے ہوئے بھی سمندر کی طرح طوفان آغوش میں لئے ہوئے ہے :

قلزم یاراں جو شبنم بے خروش
شبنم من مثل یم طوفان بدوش
(ص ۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ مسلمان کے لئے نہال کی تشبیہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو درخت کی طرح باغ کی مٹی سے نکل کر سر بلند ہو دل ذات غائب سے پیوستہ رکھ اور جو حاضر و موجود ہے اس سے جنگ کر :

چون نہال از خاک این گلزار خیز
دل بغائب بندو باحاضر ستیز
(ص ۱۴۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں غائب سے اشارہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور حاضر سے کائنات کی طرف ہے کائنات سے لڑنے کا مقصد یہ ہے کہ اسے زیر نگین کیا جائے۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ مسلمان کو ندی سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو ندی کی طرح بارش سے پانی کا سرمایہ نہ لے جو بہ ہر حال بھیک ہے۔ کناروں سے بے نیاز ہو جا اور حد و نہایت کی طلب نہ کر :

ہمچو جو سرمایہ از باراں مخواہ
بیکراں شو در جہان پایاں مخواہ
(ص ۱۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ ندی اس وقت تک ندی ہے جب تک بارش اس کے لئے پانی بہم پہنچاتی ہے اگر بارش ختم ہو جائے تو ندی کی زندگی بھی ختم ہو جائے۔

دوسری طرف سمندر کو دیکھو کہ دور دور تک اس کے کنارے کا پتہ نہیں۔ بارش ہو یا نہ ہو۔ دریاؤں کا پانی اس میں گرے یا نہ گرے مگر اس کی موج زنی بدستور قائم رہتی ہے۔ پھر کیوں ندی ہونا گوارا کیا جائے سمندر کیوں نہ بنا جائے۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ اپنے آپ کو غنچے سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگرچہ کارکنان قضاو قدر، قانونِ قدرت کے مطابق بار بار میری روحانی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں لیکن چونکہ غنچے کی طرح عشق کا جذبہ میری شخصیت میں کار فرما ہے اس لئے اس عشق کی بدولت میں ان رکاوٹوں پر غالب آکر جلوہ گر آفتاب یعنی اپنی اصل سے ہم آغوش ہونے کے لئے اگتا ہوں یعنی جدو جہد میں مصروف رہتا ہوں :

چو غنچہ گرچہ بکارم گرہ۔ زنند ولے
ز شوقِ جلوہ گر آفتاب می رویم

(ص ۳۱۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

مراد یہ کہ جدوجہد کے بغیر کوئی سالک کامیاب نہیں ہو سکتا اور اگر راہ میں دشواری پیدا ہو جائے تو سالک کو ہمت سے کام لینا چاہیئے۔

پیام مشرق میں ایک اور جگہ دنیا کے لئے پھول کی تشبیہ لاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے خدا تو نے صرف ایک سی دنیا بنائی اور وہ بھی ایسی کہ اس میں ہر روز بلکہ ہر لمحہ لاکھوں عاشقوں کی تمناؤں کا خون ہوتا رہتا ہے۔ یعنی تیری یہ دنیا تلخیوں سے معمور ہے لیکن ہم تیرے عاجز بندے ہر روز ایک نئی دنیا پیدا کرتے رہتے ہیں جو ہمارے تصور کی کھیتی سے پھول کی طرح اُگتی ہے:

صد جہان می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل
یک جہان و آن ہم از خونِ تمنا ساختی

(ص ۳۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ اپنی پیشانی کے داغ کو ستارے سے تشبیہ دیتے ہیں جس سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں فرماتے ہیں کہ اے نادان تو تاریک راتوں کا یعنی حالات کی ستم ظریفی کا غم نہ کر کیونکہ میری پیشانی پر موجود داغ جو تیری ہی خوش بختی کی دعاؤں کے لئے خدا کے حضور سربسجود ہونے سے بنا، ستارے کی طرح چمک رہا ہے اور اس کی تابانی تیری شبِ غم کو صبح روشن میں تبدیل کر دے گی مراد یہ کہ میری دعائیں رنگ لائی ہیں اور مجھے مسلمانوں کے حالات بدلتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں:

مخور ناداں غم از تاریکئ شبہا کہ می آید
کہ چون انجم درخشد داغ سیمائے کہ من دارم

(ص ۴۵۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ دل کو بیابان اور پھر اسی میں یادِ محبوب کو مہتاب پریشاں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے محبوب اگر تو میرے باطن کو کھوجے تو بیابان میں منتشر چاند کی چاندنی کی طرح اسے اپنے ہی تصور کی آماجگاہ پائے گا:

اگر کاوی درونم را خیالِ خویش را یابی
پریشاں جلوہ چوں مہتاب اندر بیابانے

(ص ۴۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ گل و لالہ کے لئے موجِ نسیم کی تشبیہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! یہ لالہ اور گلاب کے پھول جنہیں تو ساکن سمجھ رہا ہے یہ بھی موجِ نسیم کی طرح متحرک ہیں کیونکہ یہ بتدریج اپنی تازگی کھو رہے

ہیں یا بالفاظ دگر مائل بہ فنا ہیں :

این گل و لالہ تو گوئی کہ مقیم اند ہمہ
راہ پیما صفت موجِ نسیم اند ہمہ
(ص ۶۷۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ انسانوں کو شرارے سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے خدا ہم جو چند مستعار سانسیں لئے اس دنیا میں آئے ہیں تیرے مقابلے میں ہمارے ہستی ایسی ہے جیسے فروغِ جاوداں یعنی ابدی روشنی کے مقابلے میں ایک شرارہ :

تو فروغِ جاوداں ما چون شرار
یک دو دم داریم و آن ہم مستعار
(ص ۵۹۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ منعم کو درویش سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ ثروتمند کس قدر مبارک ہے جو اپنی دولت کو اللہ کا عطیہ سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا امین تصور کرے اور اسے محتاجوں میں تقسیم کرتا رہے اور لاکھوں کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود درویشوں کی سی زندگی بسر کرے۔ وہ اس دورِ مادیت میں اللہ کے قانون کی اطاعت کرے اور ہر وقت اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرے :

اے خوش آن منعم کہ چون درویش زیست
در چنین عصرے خدا اندیش زیست
(ص ۸۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں ایک جگہ مسلمان مرد کی زنانہ روش کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے تلقین کرتے ہیں کہ تو عورتوں کی طرح بدن پر مت اِترا۔ بلکہ اپنی روح کی تربیت کا انتظام کر یعنی مردوں کی طرح جہاد کو شیوۂ زندگی بنا۔ بالفاظ دگر مصاف زندگی میں مشکلات کا مقابلہ کر :

فکرِ جاں کن چوں زناں بر تن متن
ہمچو مرداں گوے درمیدان فگن
(ص ۸۶۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ مسلمان کو پھول کی خوشبو سے تشبیہ دیتے ہیں جو اپنی اصل سے دور ہو چکی ہے فرماتے ہیں کہ نہ ہم میں عشقِ رسول کا رنگ موجود ہے اور نہ ہمیں شریعت اسلامیہ کا پاس ہے۔ ہم اپنی اصل یعنی اسلام سے اُسی طرح دور ہو

گئے ہیں جس طرح خوشبو پھول سے دور ہو جاتی ہے۔ ہمارے زوال کا اصلی سبب یہ ہے کہ ہمارے دل سے عشقِ رسولؐ کا جذبہ فنا ہو گیا۔ نتیجۃً کچھ عرصے کے بعد دین بھی ہماری زندگی سے خارج ہو گیا کیونکہ جو شے انسان کو اتباعِ دین پر مائل کر سکتی ہے وہ عشقِ رسولؐ کا جذبہ ہی تو ہے۔ پس جب ہم نے عاشقی ترک کر دی تو ایک سودے میں دو دو موتیں خرید لیں یعنی مقصدِ حیات سے کلی طور پر بیگانہ ہو گئے۔

من و تواز دل و دیں نا اُمیدیم
چو بُوے گل ز اصلِ خود رمیدیم
دل ما مُرد و دیں از مُردنش مرد
دو تا مرگے بیک سودا خریدیم
(ص ۱۰۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ انسان کو بلبل سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تو اس لئے بلبل کی طرح گریہ و زاری نہیں کرتا کہ تیرے جسم میں جان نہیں۔ مراد یہ کہ تو جذبۂ عشق سے محروم ہے اسی لئے تجھ میں اپنے معشوق کے حصول کے لئے اضطراب پیہم نہیں۔ اور اس دنیا میں جہاں گلچینی جائز ہے تو کانٹوں کے ڈر سے پھول توڑنے کی ہمت نہیں کرتا یعنی تو اس دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتا ہے لیکن تو مشکلات سے گھبراتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تو گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے:

چو بلبل نالۂ زارے نداری
کہ در تن جانِ بیدارے نداری
درین گلشن کہ گلچینی حلال است
تو زخمے از سرِ خارے نداری
(ص ۹۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

علامہ اقبال کے استعارات میں بھی ان کی فکری رعنائی اور اچھوتا پن جھلکتا دکھائی دیتا ہے اور وہ اپنے استعارات سے اپنے مخصوص فکر کو زیادہ مؤثر طریقے سے پیش کرنے میں مدد لیتے ہیں بقول ڈاکٹر عبدالمغنی:

"اقبال نے اپنے احساسات و تخیلات کے ابلاغ کے لئے ایک پورا نظامِ اشارات و استعارات تخلیق کیا ہے جو زندگی کے ٹھوس حقائق سے لبریز ہونے کے باوجود فن کی

ایمائیت کو اس کی لطیف ترین حدوں تک لے گیا ہے۔"(۵۱)

اسرارِ خودی میں ایک جگہ اپنے آپ کو نغمہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ایک ایسا نغمہ ہوں جو مضراب سے بالکل بے نیاز ہے میں اس شاعر کی آواز ہوں جس کا دور مستقبل میں شروع ہو گا:

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم

(ص ۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ مسلمان کے لئے قطرے کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تو قطرہ بھی ہو تو اپنے آپ کو اپنے پاؤں میں نہ گرا بلکہ اپنے اندر طوفان کا جوش پیدا کرنے کی کوشش کر اور سمندر سے لڑ جا:

قطرۂ خود را بپائے خود مریز
در تلاطم کوش و با قلزم ستیز

(ص ۶۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ مسلمان کو استعارۃً غنچہ اور شبنم قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تو غنچہ ہے تو اپنے آپ کو باغ سمجھ اور اگر شبنم ہے تو سورج کو قبضے میں لا:

غنچہ؟ از خود چمن تعمیر کُن
شبنمی؟ خورشید را تسخیر کُن

(ص ۱۴۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ اپنے آپ کو رنگ کا پردہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں رنگ کا پردہ ہوں خوشبو نہیں کہ بادِ نسیم کا ہر جھونکا مجھے شکار کر کے لے جائے مراد یہ کہ جب بادِ نسیم چلتی ہے تو خوشبو کو اُڑا کر لے جاتی ہے لیکن رنگ نہیں لے جا سکتی۔

پردۂ رنگم شمیمے نیستم
صیدِ ہر موجِ نسیمے نیستم

(ص ۸۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ شاعری کے لئے شمع اور دل کے لئے پروانے کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب دل میں عشق کا جذبہ برانگیختہ ہوتا ہے تو سخن میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب تک دل میں پروانے کا رنگ یعنی عشق جلوہ گر نہ ہو شاعری کی شمع کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا:

سوزِ سُخن ز نالۂ مستانۂ دل است
این شمع را فروغ ز پروانۂ دل است
(ص ۳۴۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ انسان کے لئے شبنم بے مایہ اور خارِ گل تازہ کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تجھے بے حیثیت شبنم تخلیق کیا گیا ہے تو تو اٹھ اور لالے کے دل کے داغ پر ٹپکنا سیکھ۔ مراد یہ کہ تو اپنی بے مائیگی کے باوجود اپنی بساط کے مطابق دوسرں کی خدمت کر سکتا ہے اور یہی سب سے بڑی نیکی ہے اسی طرح اگر تجھے تازہ کھلے ہوئے پھول کا کانٹا بنایا گیا ہے تو تو باغ کی عزت و آبرو کی پاسداری کر اور چبھنا سیکھ۔ یعنی پھول کی حفاظت کر کیونکہ اگر تو ایسا کرے گا تو فطرت کی نگاہ میں تیرا مرتبہ پھول سے کم نہیں ہوگا:

آفریدند اگر شبنم بے مایہ تُرا
خیز و بر داغِ دل لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گل تازہ رسے ساختہ اند
پاس ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
(ص ۳۲۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ زندگی کے حرکی تصور کے لئے ہرن کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ زندگی کی حرارت تمام عالم میں پائی جاتی ہے میں نے تل ودمن اور صحرا و بیابان ہر جگہ زندگی کے اس ہرن کو چوکڑیاں بھرتے دیکھا ہے:

بہ بلند و پست عالم تپشِ حیات پیدا
چہ دمن چہ تل چہ صحرا رم این غزالہ دیدم
(ص ۵۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ چہرے کے لئے پھول کی پتی، آنکھ کے لئے شبنم اور آنسوؤں کے لئے دُرِ شہوار کو استعارۃً استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! کیا تیرے پھول کی پتی پر شبنم سے موتی گرا ہے یعنی تیرے نرم و ملائم چہرے پر آنکھوں سے آنسو ٹپکا ہے اگر نہیں تو پھر تو اس کی حقیقت کیا جانے:

چہ خبر تراز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے
تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شا ہوار داری؟
(ص ۴۳۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ بُت پرستی کے لئے آزری کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مخاطب طریقِ

آزری سے بیگانگی اختیار کر۔ مُرادیہ کہ بُت پرستی نہ کر اور دنیا کو اپنا مقصود نہ بنا۔ ہاں اگر تجھ میں ہمت ہے تو اس دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال یعنی اس میں خدا کا قانون نافذ کر :

از طریقِ آزری بیگانہ باش
بر مُرادِ خود جہانِ نو تراش
(ص ۶۶۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فقر کے لئے قلندری اور ملکویت کے لئے سکندری کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مخاطب تو اپنے اندر شانِ قلندری یعنی فقر پیدا کر تاکہ سکندری یعنی ملوکیت کا خاتمہ کر سکے۔ یاد رکھ سکندری دراصل ساحری ہے اور ساحری کا ابطال کرنا تیرا فرضِ منصبی ہے کیونکہ تو حضرت موسیٰؑ (کلیم اللہ) کا جانشین ہے لہذا شانِ قلندری پیدا کر کے عصرِ حاضر کے سامریوں کا قلع قمع کر دے :

ضربِ قلندری بیار، سدِ سکندری شکن
رسمِ کلیم تازہ کُن، رونق ساحری شکن
(ص ۶۱۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک جگہ مسلمان مرد کو استعارۃً گوہر قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! جس طرح تیرے اسلاف خدا کی رضا میں فنا ہو گئے اور خدا کی رضا کیا تھی؟ اتباعِ رسولؐ جس کی بدولت انہوں نے سیپ سے موتی نکالا یعنی اپنی خودی کی مخفی صلاحیتوں کو آشکارا کیا اُسی طرح تو بھی حضورؐ انورؐ کی اتباع کاملہ کی بدولت اس مقام کو حاصل کر :

در رضاے حق فنا شو چون سلف
گوہرِ خود را برون آر از صدف
(ص ۸۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں ایک جگہ دل کے لئے لالۂ صحرا کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح لالۂ صحرا کو جنگل ہی کی آب و ہوا راس آتی ہے اُسی طرح میرے لالۂ صحرا یعنی عاشق دل کو خلوت ہی میں راحت نصیب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب میں چمن یعنی لوگوں کی صحبت میں بیٹھا تو میرا دل بادِ چمن یعنی ان کی باتوں سے افسردہ اور ملول ہو گیا :

دل را بہ چمن بُردم از بادِ چمن افسرد
میرد بہ خیابانہا این لالۂ صحرا مست
(ص ۸۷۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ زمانے کے ظلم و ستم کے لئے چنگیزی کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے

انسان زمانے کی مہربانی یا سرد مہری سے کوئی اثر قبول مت کر کیونکہ اس کا کوئی اعتبار نہیں اس نے بے شمار فتنے اٹھائے۔ ذلیل اور کمینہ خصلت لوگوں کی پرورش کی اور سینکڑوں قوموں کو اپنے ظلم و ستم سے اس صفحۂ ہستی سے بدبختوں کی قبر کی طرح مٹا ڈالا :

زمانہ فتنہ ہا آورد و بگذشت
خساں را در بغل پرورد و بگذشت
دو صد بغداد را چنگیزیٔ او
چو گور تیرہ بختاں کردو بگذشت
(ص ۹۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ مسلمان مرد کو استعارۃً شاہین قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چونکہ تو خلیفۃ اللہ ہے اس لئے ظلی طور پر تجھ میں کبریائی کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے لیکن تو کمینے اور پست فطرت انسانوں کی غلامی کرتے ہوئے اس بلند مقام سے نیچے گر گیا ہے جس کا حصول تیرے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ اے انسان! تو اپنی اصل اور تخلیق کے اعتبار سے بے شک شاہین یعنی خلیفہ اللہ ہے لیکن جب تک تو اپنی فطرت (یعنی اسلام) کے اقتضاء پر عمل نہیں کرے گا تو اپنے ضمیر کی اطاعت نہیں کرے گا اُس وقت تک تیری خودی مستحکم نہیں ہو گی اور مقامِ کبریائی کا حصول استحکام خودی پر موقوف ہے :

فتادی از مقامِ کبریائی
حضور دوں نہاداں چہرہ سائی
تو شاہینی و لیکن خویشتن را
نگیری تا بدامِ خود نیائی
(ص ۹۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

علامہ اقبال کی شاعری ایک پیغام اور ایک نصب العین پر مبنی تھی جسے پہنچانے اور عام کرنے کے لئے انہوں نے تاریخ عالم کے انہی واقعات و شخصیات کا ذکر کیا جن سے ان کے نصب العین کی تائید ہوئی۔

بقول مولانا عبدالسلام ندوی :

"ڈاکٹر صاحب کے کلام میں بھی بکثرت تلمیحات ہیں جو ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ مقاصد سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی ان سے عزم و استقلال، اطاعت، ایثار، قربانی، شہادت، جانبازی، انقلاب انگیزی اور جفاکشی کی تعلیم ہوتی ہے جو ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ اور شاعری کے اصلی مقصود ہیں۔" (۵۲)

اور چونکہ ان کے فلسفے اور شاعری کا اصلی مقصود اور نصب العین کم وبیش وہی ہے جو اسلام کا ہے لہذا انہوں نے اپنی شاعری میں انہی واقعات و شخصیات کو پیش کیا جو خود اسلامی تھیں۔بقول ڈاکٹر آفتاب احمد :

"اقبال کا نظامِ اقدار اسلام کے نظامِ اقدار سے اور اقبال کی تلمیحات مسلمانوں کی مذہبی، تاریخی اور فکری روایات سے ماخوذ ہیں۔"(۵۳)

لیکن بقول ڈاکٹر عبد المغنی :

"انہوں نے تلمیحات کو محض حوالوں کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ انہیں پورے طور پر استعارہ و کنایہ میں تبدیل کر دیا ہے۔"(۵۴)

مثلاً اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

خود فرود آ از شتر مثلِ عُمر
الحذر از منتِ غیر الحذر

(ص ۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی تو حضرت عمرؓ کی طرح خود اونٹ سے اُتر کر کوڑا اٹھا دوسرے کا احسان اٹھانے سے پرہیز لازم ہے یقیناً لازم ہے اس شعر میں تلمیح ہے حضرت عُمرؓ کے واقعے کی طرف کہ ایک مرتبہ وہ اونٹ پر سوار جا رہے تھے۔ کوڑا گر گیا۔ کسی سے نہ کہا کہ کوڑا اٹھا دے۔ اونٹ کو بٹھایا۔ خود اُتر کر کوڑا اٹھایا اور سوار ہو کر چلے گئے گویا سب کے سامنے یہ مثال پیش کی کہ ادنیٰ سے کام کے لئے بھی کسی کا احسان گوارا نہیں کرنا چاہئے۔ اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

خاک گشتن مذہب پروانگی است
خاک را اب شو کہ این مردانگی است

(ص ۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی جل کر خاک ہو جانا پروانے کا طریقہ ہے خاک کا باپ بن یعنی اس پر قابو پا۔ مردانگی کا شیوہ یہی ہے اس شعر میں ابو تراب یعنی مٹی کا باپ حضرت علی مرتضیٰؓ کی کنیت کی طرف تلمیح ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ مسجد میں تشریف لائے تو حضرت علیؓ فرش پر سوئے ہوئے تھے اور آپ کا جسم فرش کے گرد و غبار سے بھرا ہوا تھا۔ رسولؐ اللہ نے یہ کیفیت دیکھ کر فرمایا : "اے ابو تراب اُٹھ۔" عربی قاعدہ ہے کہ کسی شخص میں وقتی طور پر جو کیفیت نمایاں ہوتی ہے اُسے ابو کے ساتھ نسبت دے دیتے ہیں۔ مٹی سے بھرے ہوئے جسم کیلئے ابو تراب کا خطاب بہت ہی موزوں اور محبت و شفقت سے لبریز تھا۔

علامہ اقبال نے یہاں ابو تراب سے وہ شخصیت مراد لی ہے جس نے اپنے جسم پر قابو پا لیا اسے مسخر کر لیا اور حق کا تابع بنا

دیا اس طرح ہوا و ہوس کی پیروی کی گنجائش نہ رہی اور وجودِ انسان کا ملاحق کے لئے وقف ہو گیا۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداونداں رباید بندہ را
گویدش تو بندۂ دیگر نۂ
زین بتانِ بے زبان کمتر نۂ

(ص ۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی نبی کی تعلیم انسانوں کے پاؤں کو ان بیڑیوں سے آزاد کر دیتی ہے جو اس نے خود بخود پہن لی تھیں اور جو انسان مختلف دیوتاؤں اور معبودوں کی پرستش میں لگا ہوا تھا اسے تمام پرستشوں سے نجات دلا کر ایک چوکھٹ پر لے آتی ہے اُسے بتاتی ہے کہ تو خواہ مخواہ دوسروں کا غلام کیوں بنتا ہے ؟ کیا تو ان بتوں سے بھی کمتر ہے جو بول نہیں سکتے ؟

ان اشعار میں حضرت ابرہیمؑ کے اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم کی سورۂ انبیاء میں آیا ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ قوم کو بُت پرستی سے روکتے تھے۔ قوم کہتی تھی کہ ہمارے باپ دادا انہی بتوں کو پوجتے آئے ہیں اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک دن موقع پا کر بڑے بُت کو چھوڑ کر باقی تمام بتوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ بُت پرستوں نے یہ دیکھا تو مُجرم کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کے خلاف شہادت ملی تو ان سے پوچھا کہ آیا تم نے یہ سب کچھ کیا ہے ؟ فرمایا یہ سب کچھ تو اس بڑے بُت نے کیا ہے۔ تمہارے بُت بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو۔ انہوں نے سر نیچا کیا اور کہا اے ابراہیم ! تو جانتا ہے کہ یہ بات نہیں کر سکتے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا : ''پھر کیا تم ان کی پوجا کرتے ہو جو نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان ؟ تف ہے تم پر اور تمہارے معبودوں پر جنہیں خدا کے سوا تم پوجتے ہو۔'' اقبال فرماتے ہیں کہ نبی انسانوں سے یہی کہتا ہے ''کیا تم ان بے زبان بُتوں سے بھی فروتر ہو۔''

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

قائد اسلامیاں ہارون رشید
آنکہ نقفور آب تیغ او چشید

(ص ۱۵۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی مسلمانوں کے خلیفہ ہارون الرشید جس کی تلوار کی دھار کا مزہ نقفور نے بھی چکھا۔ یہاں اشارہ ہے ہارون الرشید اور رومی سلطنت کے بادشاہ نقفور کی باہمی آویزش کی طرف جو ابتدا میں ملکہ آئرین کے ماتحت وزیرِ مال تھا پھر درباریوں کو ساتھ ملا کر تخت پر بیٹھ گیا۔ ملکہ آئرین ہارون الرشید کو خراج ادا کرتی تھی۔ نقفور نے تخت نشین ہوتے ہی ہارون الرشید کو لکھا :

"اب عورت تاج و تخت کی مالک نہیں جو تمہیں خراج ادا کرتی تھی۔ میں شہنشاہ ہوں اور تم مجھے خراج ادا کرو۔"

اس گستاخانہ خط کے جواب میں ہارون الرشید نے وہ نادر خط لکھا تھا جس کا ابتدائی جملہ تھا: "خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے رومی کُتے کے نام" پھر فوج لے کر بجلی کی طرح نقفور پر جا گرا اور جب تک اُس نے جرموں پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے پورا خراج ادا نہ کر دیا اُسے نہ چھوڑا ہارون الرشید نے نقفور کو بارہا شکستیں دیں۔ آخر یہ وحشی یلغاروں کے ہاتھوں مارا گیا۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد
نگاہِ شوق در امید و بیم است
نمیگردد کہن افسانۂ طور
کہ در ہر دل تمنائے کلیم است
(ص ۲۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عقل نے کہا کہ خدا کو آنکھوں کی مدد سے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن دل اس کے دیدار سے مایوس نہیں ہے لہذا طور کا قصہ کبھی پرانا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر دل میں حضرت موسیٰؑ کی سی آرزو موجود ہے۔ علامہ اقبال نے یہاں حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ اور طور کے واقعے کی تلمیح بیان کی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ اہلِ خانہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ راستے میں آگ کی ضرورت پڑی۔ ایک طرف آگ نظر آئی تو آپ اُس طرف چل پڑے۔ یہ کوہِ طور تھا۔ وہاں پہنچے تو اللہ آپ سے مخاطب ہوا۔ آپ نے اللہ سے درخواست کی کہ "رب ارنی" اے میرے رب مجھے دیدار کروا۔ اللہ نے فرمایا: "لن ترانی" تو ہرگز نہ دیکھ سکے گا اور وہی ہوا یعنی موسیٰؑ خدا کے جلوے کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

شبے بہ میکدہ خوش گفت پیرِ زندہ دلے
بہ ہر زمانہ خلیل است و آتشِ نمرود
(ص ۳۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ایک رات میکدہ یعنی خانقاہ میں مُرشدِ کامل نے یہ نکتہ بیان کیا کہ تم یہ مت سمجھو کہ دنیا میں صرف ایک ہی خلیلؑ اور ایک ہی نمرود گزرا ہے بلکہ ہر زمانے میں ان کے جانشین پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ علامہ اقبال نے یہاں حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے واقعے کو تلمیح کے طور پر بیان کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خدا پرست تھے اور نمرود دشمن دین تھا اور اسی دشمنی کی بنا پر اُس نے حضرت ابراہیمؑ کو ان کی خدا پرستی کے باعث آگ کے الاؤ میں پھینکوا دیا لیکن خدا سے سچے

عشق کی بنا پر وہی آگ حضرت ابراہیمؑ کے لئے گلزار بن گئی۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

کسے این معنیٔ نازک نداند جز ایاز اینجا
کہ مہرِ غزنوی افزوں کند دردِ ایازی را
(ص ۴۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ایاز کے سوا کوئی اس نازک حقیقت کو نہیں جانتا کہ غزنوی کی محبت معشوقیت کے درد کو بڑھاتی ہے۔ مراد یہ کہ صرف ایاز ہی اس باریک نکتے کو سمجھ سکتا ہے کہ محمود کی محبت جتنی بڑھے گی ایاز کی معشوقیت کی ذمہ داری اتنی ہی بڑھتی جائے گی کیونکہ عاشق کی محبت مشعوق کو وفا کی راہ پر گامزن رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس شعر میں محمود وایاز کے قصہٴ عشق وعاشقی کو تلمیحاًبیان کیا ہے۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسین باز دہ کوفہ و شامِ خویش را
(ص ۴۰۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے اُمتِ مسلمہ تیرے عراق کی ریت بھی منتظر ہے اور تیرے حجاز کی کھیتی بھی پیاسی ہے لہذا تو اپنے کوفہ وشام کو اپنے ہی کسی حسین کے خون سے بارِ دگر رنگین کر اور اسلام کو سربلندی عطا کر۔ اس شعر میں حضرت امام حسینؑ کے واقعہٴ شہادت کو تلمیحاًبیان کیا گیا ہے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

نیست عالم جز بتانِ چشم و گوش
اینکہ ہر فردائے او میرد چو دوش
در بیابانِ طلب دیوانہ شو
یعنی ابراہیمؑ این بُت خانے شو
(ص ۶۱۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی یہ عالم دراصل زن، زر اور زمین جیسے اُن بتوں کا مجموعہ ہے جن کو انسان کے حواسِ خمسہ نے اس امید پر تراشا ہے کہ شاید ان کا وجود دائمی ہو اور اسی وجہ سے وہ شب وروز ان کی پوجا میں بھی مصروف ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہاں کسی شے کو گزرے ہوئے اس کل کی طرح ثبات نہیں ہے جو فنا ہو گیا اور آنے والا کل بھی یقیناً اسی کی طرح فنا ہو جائے گا لہذا اے مخاطب تو

صرف خدائے واحد کی پرستش کر تاکہ اس سے حاصل ہونے والی جرأت کی بدولت حضرت ابراہیمؑ کی طرح اپنے دور کی مادیت پرستی کا خاتمہ کر سکے۔ کیونکہ اگر کسی ہستی کو ثبات ہے تو وہ خدا کی ذات ہے اور اگر تو بھی دوام کا خواہاں ہے تو تجھے بھی اسی ذاتِ پاک سے لو لگانی ہو گی جو لافانی ہے نہ کہ مادی اشیاء سے جو فانی ہیں۔ ان اشعار میں حضرت ابراہیمؑ کے بُت شکنی کے واقعے کو تلمیحاً بیان کیا گیا ہے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

تیشہ اگر بسنگ زد این چہ مقامِ گفتگوست
عشق بدوش می کشد این ہمہ کوہسار را

(ص ۶۳۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی فرہاد نے اگر شیریں کی محبت میں پہاڑ کاٹ دیا تو یہ کوئی ایسی قابل ذکر کہانی نہیں ہے کیونکہ عشق میں تو اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ تمام پہاڑوں کو اپنے کندھوں پر اٹھالیتا ہے یعنی ساری کائنات کو تسخیر کر لیتا ہے۔ اس شعر میں فرھاد کے شیریں کے عشق میں پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکالنے کے واقعے کو تلمیحاً بیان کیا گیا ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

پیشِ فرعوناں بگو حرفِ کلیم
تاکند ضربِ تو دریا را دو نیم

(ص ۸۳۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب ! تو عصرِ حاضر کے فرعونوں یعنی حکمرانوں کے سامنے کلیمانہ گفتگو کر یعنی قانونِ الٰہی کا تذکرہ کر تاکہ تیری حق بات کی ضرب سے ان کی فرعونیت کا دریا دو نیم ہو جائے یعنی ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک ہو جائے۔ کیونکہ وہ انسانوں کو خدا پرستی کی بجائے انسان پرستی پر مجبور کرتے ہیں۔ انہیں حریت سے محروم کر دیتے ہیں اور ان کی روحوں کو مُردہ کر دیتے ہیں۔ اس شعر میں حضرت موسیٰؑ کے فرعونِ عصر کے سامنے کلمۂ حق کے ادعا کی طرف اشارہ ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

در محبت پختہ کے گردو خلیلؑ
تانگردد لاسوے الا دلیل

(ص ۸۱۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی جب تک لا کو الا کی رہنمائی حاصل نہیں ہوئی اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ بھی محبت الٰہی میں کہاں پختگی حاصل کر پائے اس شعر میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے محبت الٰہی میں پختگی کے لئے پہلے معبودانِ باطلہ کی نفی کی اور

اس کے بعد معبودِ بر حق کا اثبات کیا۔

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

زشامِ ما برون آور سحر را
بہ قرآن باز خواں اہلِ نظر را
تو میدانی کہ سوزِ قرأتِ تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

(ص ۹۷۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان خاتون تو ہماری تاریکیوں کو اجالوں میں تبدیل کر دے اور صاحبان بصیرت کو دوبارہ قرآن خوانی کا درس دے کیا تو اس تاریخی واقعے سے آگاہ نہیں ہے کہ تیری بہن کی قرأت کے سوز نے خطاب کے بیٹے کو فاروقِ اعظمؓ بنادیا۔ یہاں حضرت عمرؓ کے ایک مشہور تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ یہ فیصلہ کر کے شمشیر بکف اپنے گھر سے نکلے کہ آج بانیٔ اسلام کا (نعوذباللہ) خاتمہ کر دوں گا تا کہ یہ فتنۂ عظیم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ راہ میں ایک دوست ملا۔ اُس نے کہا پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہارے بہن بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر پہنچے دونوں میاں بیوی قرآن مجید کی سورۃ طٰہٰ کی ابتدائی آیات کی تلاوت کر رہے تھے۔ عمرؓ کو دیکھ کر سہم گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ تم لوگ مسلمان ہو گئے ہو۔ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اس پر عمرؓ نے اپنی بہن کے مبارک رُخسار پر ایسے زور سے تھپڑ مارا کہ کان سے خون بہنے لگا۔ خون دیکھ کر ان کا غصہ فرو ہو گیا اور بولے کہ اچھا جو تم پڑھ رہی تھیں وہ مجھے بھی سناؤ۔ جب ان کی بہن نے وہ آیات پڑھیں تو یک لخت حضرت عمرؓ کی تقدیر بدل گئی۔ یعنی وہ مسلمان ہو گئے۔

☆☆☆

علامہ اقبال کی بیشتر شاعری کنایے کے پردے میں ہے لیکن انہوں نے اس کے لئے زبورِ عجم کے ایک شعر میں بڑی خوبصورت توجیہہ پیش کی۔ فرماتے ہیں :

وقت برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسانِ خام را

(ص ۴۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب تو ہی بتا کہ میں اس ناتراشیدہ قوم کا کیا کروں کہ اگرچہ اُس پر معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی اعتبار سے بڑا کڑا وقت ہے اور ایسے میں ہر بات واشگاف الفاظ میں ہی بیان کرنی چاہیئے یعنی واضح الفاظ میں اس کی رہنمائی کرنی چاہئے اور ایسے کرنے والے بھی بہتیرے ہیں لیکن ان کی باتیں اس قوم کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لئے میں نے کنایے کا سہارا لیا ہے کہ

شاید کنایۃً کہی گئی بات ان کی سمجھ میں آجائے۔ علامہ اقبال کے یہاں کنایے کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ قطرے کے لئے یہی بہتر ہے کہ میرے سیلاب سے دور رہے اور سمندر کے لئے یہی زیبا ہے کہ اس کے طوفان سے اپنے آپ پر دیوانگی کی کیفیت طاری کرے :

قطرہ از سیلاب من بیگانہ بہ
قلزم از آشوبِ او دیوانہ بہ
(ص ۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں قطرہ کنایہ ہے کم ہمت اور فرومایہ افراد سے۔ سیلاب کنایہ ہے شاعر کے پر ہجوم افکار سے۔ سمندر کنایہ ہے باہمت اور جوش عمل کے پیکر لوگوں سے اور طوفان کنایہ ہے شاعر کے افکار کی شگفتگی اور تڑپ سے۔

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ جس کلی میں نشو ونما پا کر باغ بن جانے کی اہلیت موجود نہیں وہ میرے ابرِ بہار سے فیض پانے کے لائق نہیں :

غنچہ کز بالیدگی گلشن نشد
در خورِ ابرِ بہارِ من نشد
(ص ۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں کلی کنایہ ہے انسان سے، باغ کنایہ ہے صلاحیتوں کے نکھار سے اور ابرِ بہار کنایہ ہے شاعر کی فکر روشن سے۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ تو تاریخ کو یاد اور محفوظ رکھ اور مستحکم واستوار ہو جا۔ اور جو سانس لئے جا چکے ہیں ان سے فیضان حاصل کر کے نئی زندگی پیدا کر :

ضبط کُن تاریخ را پائندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو
(ص ۱۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں نفسہائے رمیدہ یعنی گزرے ہوئے سانس کنایہ ہے گزرے ہوئے زمانے یعنی عہد ماضی سے۔ قومیں ہمیشہ اپنے ماضی کی یاد سے کامیابی حاصل کرتی ہیں اور اسی طرح مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا! تو وہ پاک ذات ہے جس نے بصیری کو ردائے مبارک سے سرفرازی بخشی اور مجھے سلمٰی کا ساز عطا کیا :

اے بصیری را ردا بخشندۂ
بربطِ سلمٰی مرا بخشندۂ

(ص ۷۶ ۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں بربط سلمیٰ مخشنا کنایہ ہے اس بات سے کہ شاعر کو اسلامی ترانے ملت کو سنانے کا کام سونپا گیا۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایسی شراب یعنی فکر نہیں جو تجھے دیوانہ یا از خود رفتہ بنادے لہذا اے مخاطب ! تو میرے بازار یعنی کلام میں کوئی اور چیز تلاش نہ کر کیونکہ میرے پاس پھول کی طرح چاک سینے یعنی پیغامِ عشق کے سوا کچھ نہیں :

ترا از خویشتن بیگانہ سازد
من آن آ بِ طربناکے ندارم
ببازارم مجو دیگر متاعے
چو گل جز سینۂ چاکے ندارم

(ص ۲۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں آب طربناک کنایہ ہے شراب سے اور شراب کنایہ ہے فکر سے۔ بازار کنایہ ہے کلام سے اور سینۂ چاک کنایہ ہے عشق سے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب ! تو اس مٹھی بھر مٹی یعنی انسان سے ناامید نہ ہو جو بکھرے ہوئے جلووں کا مالک ہے اور فانی ہے کیونکہ جب فطرت کسی پیکر کو تراشتی ہے تو اسے بتدریج کمال کی طرف لے جاتی ہے :

مشو نو مید ازیں مشتِ غبارے
پریشان جلوۂ ناپایدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را
تمامش می کند در روزگارے

(ص ۲۴۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں مُشت غبار کنایہ ہے انسان سے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کہاں شاعری اور کہاں میں۔ مُراد یہ کہ مجھ جیسے شخص سے شاعری کہاں ممکن ہے اگر میں چند مصرعے سیدھے کر لیتا ہوں تو یہ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لئے محض ایک بہانہ ہے ورنہ اپنے افکار کے اظہار سے میرا مقصد شترِ بے مہار کو یعنی مسلمان قوم کو جو سچے رہبر سے محروم ہے قطار کی طرف لے جانا یعنی اپنی اصل منزل تک پہنچانا ہے :

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخُن بہانہ ایست

سوے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

(ص ۴۴۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں قطار کنایہ ہے منزل سے اور ناقہ کنایہ ہے مسلمان قوم سے۔

زبور عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے سمندر میں تیری تہہ میں بہت پر سکون تھا لیکن تو نے خود نمائی کے جوش میں اپنے اس چمکدار موتی کو کنارے کی طرف پھینک دیا مراد یہ کہ اے خدا! تو نے جب اپنے آپ کو دیکھنا چاہا تو مجھے تخلیق کیا اور خلیفہ بنا کر زمین پر بھیج دیا۔

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی

بکنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را

(ص ۴۴۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں دُر آبدار کنایہ ہے انسان سے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہر قوم اپنی ترقی کے لئے متعین کئے گئے راستوں پر تیزی سے گامزن ہے جبکہ ہماری اونٹنی یعنی ملت بے مہار ہے اور لاحاصل تگ ودو میں مصروف ہے یعنی ہماری قوم کو نہ تو اب تک کوئی موزوں لیڈر میسر آیا ہے اور نہ اس نے اپنے لئے کسی مناسب منزل کا تعین کیا ہے :

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو

ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

(ص ۷۸۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں ناقہ کنایہ ہے ملتِ مسلمہ سے اور بے زمام کنایہ ہے قیادت کے فقدان سے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ہمارے معماروں یعنی خداوندانِ مکتب کی حالت یہ ہے کہ وہ شاہین کے بچوں یعنی مومنوں کی اولاد کو پست طرز زندگی سکھا کران کے کردار کی بنیاد ہی ٹیڑھی اُٹھا رہے ہیں :

خشت را معمارِ ما کج می نہد

خوے بط با بچۂ شاہین دہد

(ص ۷۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں معمار کنایہ ہے معلم سے۔ بچۂ شاہین کنایہ ہے بہادر مسلمان نوجوان سے۔ اور خوے بط کنایہ ہے زندگی کے گھٹیا طور طریقوں سے۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ قافلہ گزر گیا اور میں صحرا میں ادھ جلی لکڑی کی مانند ابھی

تک سلگ رہاہوں یعنی مسلمانانِ ہند کی عظمت کا مدت ہوئی خاتمہ ہو گیالیکن قوم کی تباہی پر میں ابھی تک ماتم کناں ہوں :

دربیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز
کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز
(ص ۸۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں کارواں کنایہ ہے بر صغیر کے عظیم مسلمان حکمرانوں کے اس گروہ سے جن کے پر شکوہ دورِ اقتدار کی کوئی مثال نہیں ملتی اور بیابان کنایہ ہے اس اجڑے ہوئے بر صغیر سے جہاں مسلمانوں کی عظمتِ گزشتہ کے محض آثار باقی تھے اور جس کی تباہی پر اقبال جیسے چند صاحبِ دل حضرات کے سوا کوئی ماتم کرنے والا بھی نہ تھا۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! حضور انورؐ کی ذاتِ مبارک کمالات بشری کے اعتبار سے بمنزلہ بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ یعنی آپ کی ذات اقدس جامع کمالات لامتناہی ہے۔ تیرا فرض یہ ہے کہ اس سمندر یعنی ذاتِ محمدیؐ کو اپنے اندر جذب کر لے۔ یعنی فنافی الرسول ہو کر اپنے اندر حضور اقدسؐ کے کمالات ظلی طور پر پیدا کر لے۔ تو نے مدتوں زبان سے محبت کا دعویٰ کیا ہے مگر اس راہ میں جو مصائب پیش آتے ہیں اُن سے تو ہنوز بیگانہ ہے۔ اس لئے اب اپنے عمل سے اپنے دعوے کا ثبوت دے یعنی حضورؐ کی ذات میں فنا ہو جا تاکہ از سرِ نو زندہ ہو جائے یعنی جب تک تو اپنی مرضی کو حضورؐ کی مرضی میں فنا نہیں کر دے گا اس وقت تک تجھے حیاتِ ابدی نصیب نہیں ہو سکتی :

مصطفیؐ بحر است و موجِ او بلند
خیز و این دریا بجوے خویش بند
مدتے بر ساحلش پیچیدۂ
لطمہ ہائے موجِ او نادیدۂ
یک زماں خود را بدریا درفگن
تا روانِ رفتہ باز آید بتن
(ص ۸۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں بحر کنایہ ہے ذاتِ رسالتمآب سے۔ موج کنایہ ہے آپؐ کے کمالات عالیہ سے۔ جوئے خویش کنایہ ہے ذاتِ سالک سے۔ دریا راجوے خویش بستن کنایہ ہے مقام فنافی الرسولؐ سے۔ ساحل کنایہ ہے اقرار باللسان سے یعنی زبان سے یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں یا محبِ رسولؐ ہوں۔ لطمۂ موج کنایہ ہے اُن مجاہدات یا صعوبتوں سے جو عاشق کو اس راہ میں پیش آتی ہیں اور خود در ابدریا درفگندن کنایہ ہے راہِ سلوک طے کرنے سے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے ساقی تو مجھے شرابِ معرفت پلادے اور مجھے دونوں جہانوں سے بے نیاز

کر دے کیونکہ مصلحتِ خداوندی یہ تھی کہ اسلام کی حقیقت دینِ اسلام سے ناواقفیت کے باعث مُلّا کی بجائے مجھ جیسے شرابی پر فاش کر دی گئی۔

بیا ساقی بگرداں ساتگین را
بیفشاں بر دوگیتی آستین را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند
کہ ملّا کم شناسد رمزِ دین را
(ص ۹۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں علامہ اقبال نے اپنے لئے رند کا کنایہ استعمال کیا ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا قرآنِ مجید کی روشنی کے باوجود اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے اور جس بات کو دنیا والے صحیح سمجھتے ہیں وہ دراصل بالکل غلط ہے۔ اے خدا میں نہیں جانتا کہ تو کب تک بنی آدم کے وجود سے جو زعم باطل میں اپنے آپ کو راہِ راست پر تصور کر رہی ہے اس ویرانے کے حسن و جمال یعنی تباہی و بربادی میں کوشاں رہے گا:

جہانے تیرہ تر با آفتابے
صوابِ او سراپا ناصوابے
ندانم تا کجا ویرانۂ را
دہی از خونِ آدم رنگ و تابے
(ص ۸۹۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں ویرانہ کنایہ ہے دنیا سے جو بنی آدم کے ظالمانہ طرزِ عمل کی بدولت اجڑے دیار میں تبدیل ہو چکی ہے اور آفتاب کنایہ ہے کلامِ پاک سے جو انسانوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے اور دنیا کو منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

۴۔ صنایع بدایع لفظی و معنوی

ابلاغ و اظہار مفہوم کے اسالیب کے علاوہ کلام کی زینت و آرائش کے بھی مختلف اسالیب ہیں جن کو صنائع بدائع لفظی و معنوی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ انہوں نے صنائع بدائع لفظی و معنوی کو اپنے کلام میں بہت چابکدستی اور ہنرمندی سے استعمال کیا ہے تو سننے والے کو تعجب تو ضرور ہوگا لیکن یہ دعویٰ بے جانہ ہوگا کیونکہ سید عابد علی عابد کے بقول :

"...... لفظی شعبدہ گری بنفسہ کوئی بُری چیز نہیں ہنرمندی اور چابکدستی سے برتی جائے تو محاسنِ سخن میں شمار ہوتی ہے لیکن خواہ مخواہ از راہ تکلف استعمال کی جائے تو ذوق سلیم پر بار ہوتی ہے۔"(۵۵)

علامہ اقبال یقیناً اس حقیقت سے آگاہ تھے اسی لئے انہوں نے تقریباً تمام صنائع لفظی و معنوی کو اپنے کلام میں استعمال کیا لیکن اس طرح کہ اس بات کا شائبہ تک نہیں ہوتا کہ ان میں کسی ارادی کوشش کو دخل ہوگا۔

نذیر احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"اس ہیچ میرز نے جب اقبال کے کلام کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں صنائع بدائع کا کتنا ذخیرہ موجود ہے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جن صنائع لفظی و معنی کا ذکر بلاغت کی کتابوں میں کیا گیا ہے وہ تمام کی تمام اقبال کے کلام میں موجود ہیں اور بعض اشعار میں بڑی بے تکلفی سے اُن کا استعمال ہوا ہے۔ یہ بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر نے ان صنائع کو قصداً استعمال کیا ہے۔"(۵۶)

علامہ اقبال کے یہاں لفظی صنائع کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ صعتِ تنسیق الصفات کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ایک موصوف کے کئی اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک بکری بڑی دانا اور سمجھ بوجھ والی تھیں وہ عمر رسیدہ تھی اور زمانے کا سرد و گرم دیکھ چکی تھی :

گوسفندے زیرکے فہمیدۂ
کہنہ سالے، گرگ باراں دیدۂ
(ص ۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ صعتِ سیاق الاعداد کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں اعداد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں ذرہ ہوں لیکن زمانے کو روشن کرنے والا سورج میری ملکیت ہے اور سینکڑوں صبحیں میرے گریبان سے پھوٹ سکتی ہیں :

ذرہ ام مہرِ منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است
(ص ٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ صنعت ترافق کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر اس طرح کہے گئے ہیں کہ ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں سے جسے چاہیں اول کرلیں اور جسے چاہیں دوم کرلیں لیکن معنوں میں یا سلاست اور روانی میں فرق نہیں آئے گا۔ فرماتے ہیں کہ ہمارا وجود اس دنیا میں رسالتؐ سے ہے۔ رسالتؐ ہی سے ہمیں دین ملا۔ رسالتؐ ہی سے شریعت ملی :

از رسالتؐ درجہاں تکوینِ ما
از رسالتؐ دینِ ما آئینِ ما
(ص ١٠١ کلیاتِ اقبال فارسی)

رسولؐ کی ذات بابرکات انسان کے لئے قلب و جگر کی قوت بن جاتی ہے اور حضورؐ اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب نظر آتے ہیں :

قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ
از خدا محبوب تر گردد نبیؐ
(ص ١٠١ کلیاتِ اقبال فارسی)

قوم کو رسولؐ اللہ سے ہی قوت ملتی ہے اور ملت کی وحدت کا راز اُسی ذاتِ پاک کی بدولت محفوظ ہے :

قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو
(ص ١٠٢ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ صعتِ ملمع کا استعمال کیا گیا ہے یعنی اشعار میں ایک سے زیادہ زبانوں یعنی عربی اور فارسی کے الفاظ جمع کئے گئے ہیں فرماتے ہیں کہ وہ ذاتِ پاک جس کی شان یہ ہے کہ جسے چاہتی ہے کامیابی کی راہ پر لگادیتی ہے اس نے ہمارے اردگرد رسالتؐ کا حلقہ کھینچ دیا یعنی ہم سب کو رسالتؐ کے ذریعے سے باہم جوڑ دیا۔

آنکہ شانِ اوست یہدی من یرید
از رسالتؐ حلقہ گردِ ما کشید
(ص ١٠١ کلیاتِ اقبال فارسی)

قاضی نے کہا یہ معاملہ تو قصاص کا ہے اور ارشادِ قرآنی کے مطابق قصاص ہی میں زندگی ہے اسی قانون کے ذریعے سے

زندگی استوار ہوتی ہے۔

گفت قاضی فی القصاص آمد حیٰوۃ
زندگی گیرد باین قانون ثبات
(ص ۱۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ملت مسلمہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اسکا وجود اس وقت سے چلا آتا ہے جب ابتدائے آفرینش میں کائنات کی روحوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد باندھا تھا۔ یہاں اشارہ ہے اس عہد کی طرف کہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: ''الست بربکم'' (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سب نے ایک آواز ہو کر کہا: ''بلیٰ'' (بے شک تو ہی ہمارا رب ہے)

اُمتِ مسلم ز آیات خداست
اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست
(ص ۱۱۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ صنعتِ ایداع یا صنعت رفو کا استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی فخر الدین عراقی کی ایک مشہور غزل کے درج ذیل مطلع کے دوسرے مصرع کے ایک حصے کی تضمین کی گئی ہے:

نخستین بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مستِ ساقی وام کردند (۵۷)

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ وہ خالص شراب جو میں نے اپنے جام میں ڈالی ہے اس کی تاثیر یہ ہے کہ وہ ایک پرانے شرابی کو بھی ہوش میں لے آتی ہے کیونکہ یہ شراب میں نے انگوروں سے کشید نہیں کی بلکہ پرانے زمانے کے مغاں کی طرح ساقی کی نگاہ سے مستعار لی ہے:

بخود باز آورد رندِ کہن را
مئے برنا کہ من در جام کردم
من این مے چون مغان دورِ پیشین
زچشمِ مستِ ساقی وام کردم
(ص ۲۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ صنعت شبہ اشتقاق کا استعمال کیا گیا ہے یعنی پر اور پرواز کے الفاظ لائے گئے ہیں جو بظاہر ایک ہی مادہ سے مشتق معلوم ہوتے ہیں لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے فرماتے ہیں کہ اے عشق! خدا نے تجھے سراپا لذت پرواز بنایا ہے۔ ہم گرفتارِ ہوا و ہوس ہیں اس لئے اُڑان ہمیں گراں گزرتی ہے لیکن تو ذوقِ پرواز کے سبب پر کشا ہے۔ مُراد یہ کہ

عاشق عشق کی بدولت ہر وقت روحانی عروج حاصل کرنے کا خواہاں رہتا ہے جبکہ ابو الہوس ہمیشہ مادیات میں گرفتار رہتا ہے اسی لئے اس کے دل میں روحانی عروج کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا :

ترا اے تازہ پرواز آفریدند
سراپا لذتِ بال آزمائی
ہوس مارا گراں پرواز دارد
تو از ذوق پریدن پر کشائی

(ص ۲۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک جگہ صنعت ترصیع کا استعمال کیا گیا ہے یعنی اشعار کے دونوں مصرعوں کے بیشتر الفاظ ہم قافیہ لائے گئے ہیں فرماتے ہیں کہ یہ بھی دنیا ہے جہاں ہمیں مختصر سی زندگی عطا کر کے بھیجا گیا ہے اور وہ بھی دنیا ہے جہاں ہمیں موت کے بعد بھیجا جائے گا۔ اس دنیا کا بھی کوئی کنارہ نہیں اور اس دنیا کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں۔ یہ دنیا بھی فانی ہے۔ وہ دنیا بھی فانی ہے۔ اگر باقی ہے تو صرف انسان کیونکہ وہ خدا کی مخلوق ہے۔ خدا نے جب اپنے آپ کو دیکھنا چاہا تو انسان کو تخلیق کیا گویا وہ خدا ہی کا ایک حصہ ہے اس حوالے سے دیکھا جائے تو صرف خدا ہی کی ذات باقی ہے دوسری ہر چیز فانی ہے :

این ہم جہانے ، آن ہم جہانے
این بیکرانے آن بیکرانے
این یک دو آنے آن یک دو آنے
من جاودانے، من جاودانے

(ص ۵۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ صنعت فوقانیہ یا فوق النقاط کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جن کے سب حروف کے نقاط حروف کے اوپر ہیں۔ فرماتے ہیں کہ موسمِ سرما اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے اور موسم بہار کی آمد سے درختوں کی شاخوں میں پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی ہے :

زمستاں را سر آمد روزگاراں
نواہا زندہ شد در شاخساراں

(ص ۴۳۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ صنعت قطار البعیر کا استعمال کیا گیا ہے یعنی دوسرے مصرع کا لفظ آخر تیسرے مصرع کے اوّل میں لایا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اگر زندگی میں کسی قسم کا اضطراب موجود نہ ہو تو ایسا جینا موت کے مترادف ہے لہذا عاشق کے

لئے لازم ہے کہ ہمیشہ حالتِ اضطراب میں زندگی بسر کرے۔ یہی طرز زندگی خودی کی تقدیر ہے اور اسی تقدیر میں خودی کی تعمیر ہے:

بے خلش ہا زیستن نا زیستن
باید آتش در تہ پا زیستن
زیستن این گونہ تقدیر خودی است
از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است

(ص ۷۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی خودی کی تخلیق اس نہج پر کی گئی ہے کہ وہ فراق کی حالت میں رہے کیونکہ اگر فراق نہ ہو تو خودی میں خدا سے ملنے کی خواہش پیدا نہیں ہو سکتی اور اگر یہ خواہش نہ ہو تو خودی ترقی کے لئے یعنی صفات ایزدی کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کر سکتی اور اگر یہ جدوجہد ختم ہو جائے تو گویا عشق ختم ہو جائے گا پس خودی کے لئے فراق کی حالت میں رہنا بے حد ضروری ہے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ صنعتِ تکرار کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ایک لفظ کے مسلسل استعمال سے مضمون کو مسلسل بنایا گیا ہے فرماتے ہیں کہ غدار کی حالت یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر شے سے دستگیری کا خواہاں ہوتا ہے خواہ وہ طوفانی ہوا ہو، انسانیت کے ناحق بہتے خون کا دریا ہو، زمین ہو، نیلا آسمان ہو، چاند سورج ستارے ہوں، قلم ہو، کتابِ مقدس ہو، مغربی حسین ہوں یا وہاں کے حکمران ہوں جو بنا جنگ و جدل ہی دنیا کو ہتھیائے بیٹھے ہیں لیکن چونکہ وہ اس دنیا کے آغاز و انجام پر ایمان نہیں رکھتا دوسرے لفظوں میں اس دنیا کے آغاز و انجام پر اختیار رکھنے والی ہستی یعنی خدائے واحد پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر دنیا کی کوئی بھی ذی روح یا غیر ذی روح ہستی مشکل وقت میں اس کی دستگیری پر آمادہ نہیں ہوتی خواہ وقتی طور پر اس نے اسے اپنا مرشد و مولا ہی کیوں نہ گردانا ہو:

اے ہوائے تند اے دریائے خون
اے زمیں اے آسمانِ نیلگوں
اے نجوم اے ماہتاب اے آفتاب
اے قلم اے لوحِ محفوظ کتاب
اے بتان ابیض اے لردانِ غرب
اے جہانے در بغل بے حرب و ضرب
این جہان بے ابتدا بے انتہاست

بندۂ عذار را مولا کجاست

(ص ۳۴۷۔۳۵۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ صعتِ ذو قافیتین کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ایک شعر میں دو قافیے لائے گئے ہیں فرماتے ہیں کہ حکمتِ دین فقر کی شانِ دلنوازی کا دوسرا نام ہے یعنی فقر سے انسان میں پاکیزہ ترین اخلاقی اور روحانی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت انسان اپنا نصب العین حاصل کر سکتا ہے اور وہ نصب العین یہ ہے کہ انسان میں خدا کی صفات کا عکس پیدا ہو جائے۔ اور قوتِ دین فقر کی شانِ بے نیازی کا دوسرا نام ہے یعنی فقر کی بدولت انسان میں شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے اور بے نیازی کیا ہے انسان کا بندوں سے بے نیاز ہو جانا اور جب وہ بندوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ بالفاظ دگر فقر کی بے نیازی سے دین میں قوت پیدا ہوتی ہے اور اس قوت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان کسی بادشاہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا :

حکمتِ دین دلنوازی ہائے فقر

قوتِ دین بے نیازی ہائے فقر

(ص ۷۸۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ صعتِ رد العجز علی الصدر کا استعمال کیا گیا ہے یعنی "کس" کا لفظ پہلے مصرعے کے آخر میں بھی لایا گیا ہے اور ابتدا میں بھی فرماتے ہیں کہ روشن شریعت کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا نظامِ حکومت قائم کرو جس میں کوئی انسان اپنی ضروریات کے لئے کسی دوسرح کا محتاج نہ ہو :

کس نہ گردد در جہان محتاجِ کس

نکتۂ شرع مبین این است و بس

(ص ۸۲۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک جگہ صعتِ قلب کا استعمال کیا گیا ہے یعنی من اور نم کے دو الفاظ اس طرح لائے گئے ہیں کہ ایک کی ترتیب حروف الٹنے سے دوسرا حرف حاصل ہوا ہے فرماتے ہیں کہ اے میرا آقاؐ! میں آپ سے ملتجی ہوں کہ آپ میری مٹی سے باغ اُگائیے یعنی میری زندگی کو اس قدر بابرکت اور بار آور بنا دیجئے کہ میرے پیغام سے مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑ جائے اور میرے آنسو لالے کے پھول میں اتار دیجئے یعنی میرے جذبۂ عشق میں ایسی تاثیر پیدا کر دیجئے کہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہی جذبہ کار فرما ہو جائے میری آرزو تو یہ ہے کہ میں بھی حضرت علیؓ کی طرح جہاد بالسیف کروں لیکن اگر میں اس بلند مقام کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم میرے اندر ان کا سا جذبہ عشق ہی پیدا کر دیجئے۔

گلستانے ز خاکِ من برانگیز

نمِ چشمم خونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علی را
نگا ہے دہ چو شمشیرِ علی تیز
(ص ۹۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ صنعتِ تجنیس محرف کا استعمال کیا گیا ہے یعنی مَرد اور مُرد دو الفاظ لائے گئے ہیں جو نوع عدد اور ترتیب حرف کے اعتبار سے تو ایک جیسے ہیں لیکن اعراب کے لحاظ سے مختلف ہیں فرماتے ہیں کہ اے انسان! یہ مت سوچ کہ مردِ کامل پر، جو امتحان میں کامیاب ہو چکا ہے موت یعنی فنائے کلی وارد ہو سکتی ہے۔ بے شک قانونِ فطرت کے مطابق وہ ایک دفعہ ضرور مرے گا لیکن یہ موت پیغامِ فنا نہیں ہے پس اے انسان صرف یہی ایک موت تیرے شایانِ شان ہے ورنہ مرنے کی سینکڑوں صورتیں ہیں جسے چاہے اختیار کرلے مر جائے گا لیکن اگر اپنی خودی کو مستحکم کرلے گا تو تجھے کسی قسم کی موت فنا نہیں کر پائے گی:

مپنداری کہ مَردِ امتحان مُرد
نمیرد گرچہ زیرِ آسمان مُرد
ترا شایان چنین مرگ است ورنہ
زہر مرگے کہ خواہی می توان مُرد
(ص ۹۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال کے یہاں معنوی صنعت گری کی مثالیں بھی جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں مثلاً اسرارِ خودی میں ایک جگہ صنعتِ تضاد کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں پست اور بلند کے دو الفاظ لائے گئے ہیں جن کے معنی آپس میں فی الجملہ ضد ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اگر ہمت پختہ اور استوار ہو تو راستے میں جو پتھر رکاوٹ بن جاتا ہے وہ بھی پانی بن کر بہہ نکلتا ہے اس کی مثال پہاڑوں سے اترنے والے سیلاب کی سی ہے جسے راستے کی پستی یا بلندی روک نہیں سکتی اور اس کا جوش اور زور ہر رکاوٹ کو پامال کرتا ہوا نکل جاتا ہے:

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی است
سیل را پست و بلند جادہ چیست
(ص کلیاتِ اقبال فارسی)

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ صنعتِ تصلیف کا استعمال کیا گیا ہے یعنی اپنے کلام پر فخر کیا گیا ہے فرماتے ہیں کہ میں ایک ایسا نغمہ ہوں جو مضراب سے بالکل بے نیاز ہے اور میں اس شاعر کی آواز ہوں جس کا دور مستقبل میں شروع ہوگا۔ میرا زمانہ

رازوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لہذا میرا یوسف اس بازار میں صحیح قیمت نہیں پا سکتا۔ میں اپنے پرانے دوستوں کی رفاقت سے ناامید ہوں۔ میرے طور پر آگ روشن ہے شاید اس کے لئے بھی کوئی کلیم آ پہنچے۔ میں جو راز آشکار کر رہا ہوں وہ کسی نے نہیں کئے۔ میری فکر کی طرح کسی نے موتی نہیں پروئے۔

نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم
من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہرِ این بازار نیست
ناامید ستم ز یارانِ قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت
ہمچو فکرِ من دُرِ معنی نہ سُفت

(ص ۶، ۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ صعتِ عکس کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر کے بعض اجزاء کو مقدم اور مؤخر کر کے پھر مؤخر کو مقدم اور مقدم کو مؤخر لایا گیا ہے فرماتے ہیں کہ فرد ملت کی بدولت عزت حاصل کرتا ہے اور ملت افراد کے مل جانے سے ترکیب پاتی ہے :

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

(ص ۸۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر کے پہلے مصرعے میں فرد اور ملت کو مقدم اور مؤخر کر کے دوسرے مصرعے میں مؤخر کو مقدم یعنی ملت کو فرد کی جگہ اور مقدم کو مؤخر یعنی فرد کو ملت کی جگہ لایا گیا ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ صعتِ مراعاۃالنظیر کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جن کو آپس میں تضاد کے علاوہ کوئی اور نسبت ہے۔ فرماتے ہیں کہ خوشامد، مکر و حیلہ، کینہ، جھوٹ یہ سب خوف ہی سے فروغ پاتے ہیں :

لابہ و مکاری و کین و دروغ
این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

(ص ۹٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر کے پہلے مصرع میں لابہ، مکاری، کین اور دروغ جیسے الفاظ لائے گئے ہیں جو بُرائی کے ترجمان ہونے کے باوصف آپس میں خاص مناسبت رکھتے ہیں۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ صعتِ مشاکلہ کا استعمال کیا گیا ہے یعنی دو چیزوں کا ذکر کر کے ان دونوں چیزوں کو ایک جگہ مذکور ہونے کی مناسبت سے ایک ہی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے فرماتے ہیں کہ اے واعظ اگر برہمن ہم سے یہ کہتا ہے کہ بتوں کو سجدہ کرو تو اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے؟ خدا نے بھی تو مٹی کی ایک مورت بنا کر فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اُسے سجدہ کرو:

مرنج از برہمن اے واعظ شہر
گراز ما سجدۂ پیشِ بتاں خواست
خدائے ما کہ خود صورتگری کرد
بُتے را سجدۂ از قدسیاں خواست

(ص ۲۳۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں مٹی کے بتوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا برہمن مسلمان سے اسرار کرتا ہے لیکن چوتھے مصرع میں سجدے کی مناسبت سے انسان کو بھی آب و گل سے تخلیق پانے کے باعث بُت کے نام سے منسوب کیا ہے جس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا خدا نے فرشتوں کو حکم دیا تھا۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ صعتِ حُسن تعلیل کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے لئے سبب یا علت ٹھہرایا گیا ہے جو دراصل اُس کی علت نہیں۔ فرماتے ہیں کہ قلم چونکہ تہی مغز یعنی اندر سے خالی ہوتا ہے اس لئے جب کاتب کی انگلیوں کی گرفت میں آتا ہے تو نالہ یعنی آواز پیدا کرتا ہے لیکن پنسل چونکہ پُر مغز یعنی اندر سے بھری ہوئی ہوتی ہے اس لئے لکھنے کی مشقت خاموشی سے برداشت کرتی ہے:

کلک را نالہ از تہی مغزی است
قلمِ سرمہ را صریرے نیست

(ص ۳۸۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں تہی مغز کی ترکیب سے معنوی خوبی پیدا کی گئی ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ اول اندر سے خالی ہونا اور دوم بیوقوف ہونا۔ اور صریر خامہ اس آواز کو کہتے ہیں جو قلمِ واسطی سے لکھتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے (۵۸)

علامہ اقبال نے اسی صریرِ خامہ کو نالہ سے تعبیر کر کے شعر میں لطف پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تکلیف کے وقت عقلمند آدمی خاموش رہتا ہے لیکن تہی مغز یعنی بے وقوف نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ صنعت متحمل الضدین کا استعمال کیا گیا ہے یعنی کلام میں ایسے الفاظ لائے گئے ہیں جن کے معنی میں دو وجہ مختلف کا احتمال ہے اور وہ دونوں جہتیں باہم تضاد کا علاقہ رکھتی ہیں اور کسی کو ترجیح نہیں یعنی کلام کے دونوں معنی لے جا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اے مُلّا! تم اپنے خطبے میں روزِ سزا و جزا اور انسانوں کے نامہ ہائے اعمال کے بارے میں تو لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہو لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تمہیں مسلمانانِ عالم پر نازل ہونے والی حالیہ قیامت دکھائی نہیں دیتی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تم موجودہ قیامت کی بات کرتے اس قیامت کی بات نہ کرتے جس کا سامنا ہمیں موت کے بعد کرنا ہوگا :

سخن زنامہ و میزان دراز تر گفتی

بحیرتم کہ نہ بینی قیامتِ موجود

(ص ۵۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر کے دوسرے مصرعے کے ایک معنی تو منفی ہیں لیکن اگر اسے استفہام سے پڑھا جائے تو اس کے دوسرے معنی یوں بھی لئے جا سکتے ہیں کہ کیا تمہیں مسلمانانِ عالم پر نازل ہونے والی حالیہ قیامت دکھائی نہیں دیتی ؟

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ صنعتِ سوال و جواب کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں سوال و جواب لائے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ کارکنانِ قضا و قدر نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تو نظامِ ملوکیت میں اسلامی زندگی بسر کر سکتا ہے میں نے کہا نہیں تو انہوں نے کہا اگر ایسا ہے تو اس نظام کو مٹا دے اور اسلامی نظام قائم کر دے :

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد

گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

(ص ۷۶۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ صنعت مذہب کلامی کا استعمال کیا گیا ہے یعنی مضمون کی وضاحت کے لئے دلیل لائی گئی ہے فرماتے ہیں کہ عارف ہندی کہتا ہے کہ اگر آپ خدا سے ملنے کے خواہاں ہیں تو یہ دنیا آپ کے اور اس ذات حق کے درمیان پردے کی طرح حائل نہیں ہوتی بلکہ آپ جب چاہیں اس سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کے اور ذات حق کے درمیان کوئی مغائرت ہے بلکہ جسے آپ پردہ سمجھتے ہیں وہ محض فریب نظر ہے تعینات نے من و تو کا امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ تعینات کے پردے کو ہٹا دیجئے جس سے آپ ملنا چاہتے ہیں وہ آپ کو آپ ہی کے اندر دکھائی دے گا۔ دوسرے مصرعے میں عارف ہندی اسی نکتے کو ایک مثال سے واضح کرتا ہے کہ جب آپ دریا میں غوطہ لگانے کے لئے کنارے پر کھڑے ہوتے ہیں تو آپ کو پانی میں اپنا عکس دکھائی دیتا ہے لیکن یہ عکس آپ کے اور دریا کے درمیان حائل نہیں ہوتا بلکہ جونہی آپ غوطہ

لگاتے ہیں۔ عکس فوراً غائب ہو جاتا ہے اس لئے کہ وہ مشہود تو ہوتا ہے موجود نہیں ہوتا اور وہ اس وقت تک مشہود ہوتا ہے جب تک آپ اور دریا ایک دوسرے سے جدا رہتے ہیں ادھر دوئی مٹی اُدھر وہ نقش غائب ہو گیا پس ثابت ہوا کہ آپ کے اور ذاتِ حق کے درمیان یہ دنیا پردے کی طرح حائل نہیں ہوتی :

ذاتِ حق را نیست این عالم حجاب
غوطہ را حائل نگردد آفتاب
(ص ۶۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ صنعت لف ونشر کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں پہلے چند چیزوں کا ذکر ایک خاص ترتیب سے کیا گیا ہے اُس کے بعد ان چیزوں کے مناسبات بیان کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ درویشانہ رُعب اور دبدبہ سراسر جذبۂ کلیم ہے اور سکندرانہ شان و شکوہ سراسر سحر سامری ہے مراد یہ کہ درویشی میں شانِ نبوت پائی جاتی ہے جبکہ سکندری سراسر ملوکیت ہے۔ درویش نگاہ کی بدولت انسانوں کے قلوب پر حکمرانی کرتا ہے جبکہ بادشاہ سپاہ کے ذریعے انسانوں کو اپنا غلام بناتا ہے۔ قلندر کی پوری زندگی صلح اور آشتی کی تصویر ہوتی ہے جبکہ بادشاہوں کی ساری زندگی جنگ و جدل میں بسر ہوتی ہے۔ قلندر اور بادشاہ دونوں دنیا فتح کرتے ہیں اور دونوں اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کا نام زندہ رہے لیکن اوّل الذّکر اس مقصد کے حصول کے لئے دلبری کا جبکہ آخر الذکر قاہری کا طریقہ اختیار کرتا ہے :

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری
آن ہمہ جذبۂ کلیم، این ہمہ سحر سامری
آن بہ نگاہ می کشد این بہ سپاہ می کُشد
آن ہمہ صلح و آشتی این ہمہ جنگ و داوری
ہر دو جہان کشاستند ہر دو دوام خواستند
این بہ دلیل قاہری آن بہ دلیل دلبری
(۶۱۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ صعتِ تقسیم کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں چند چیزوں کا ذکر کر کے ہر ایک کو ان کے منسوبات پر بقید تعینات کے تقسیم کیا گیا ہے فرماتے ہیں کہ آزاد قوموں کی عید ملک اور مذہب کے شان و شکوہ کے اظہار کا نام ہے جبکہ محکوموں کی عید مسجدوں میں مومنین کے اجتماع کا نام ہے۔ مُراد یہ کہ آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کی حامل قومیں اپنے دیگر تہواروں کی طرح مذہبی تہواروں مثلاً عیدوں وغیرہ کے جشن انتہائی جوش و خروش سے مناتی ہیں جو ملک اور دین کی شان و شوکت کو ظاہر کرتا ہے جبکہ محکوم قومیں اپنے دینی تہواروں میں مساجد میں اکٹھی ہو کر باجماعت نماز تو

ادا کرتی ہیں لیکن اُن کو اس جوش و خروش سے منانے سے قاصر ہوتی ہیں جو آزاد قوموں کا نصیب ہوتا ہے :

عید آزاداں شکوہِ ملک و دین
عید محکوماں ہجومِ مومنین

(ص ۸۳۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ صنعت ترجمۃ اللفظ کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر کے پہلے مصرع میں جہان لفظ اور دوسرے مصرع میں دیرِ کہن کی ترکیب لائی گئی ہے جو پہلے لفظ کا ترجمہ ہے لیکن دونوں کا آپس میں مربوط ہونا مشروط نہیں۔ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان تو ترکِ دنیا کا خیال اپنے دل سے نکال دے کیونکہ تو اسلام کا پیرو ہے اور اسلام ترکِ جہان کی بجائے تسخیرِ جہان کا حکم دیتا ہے بلکہ اسلام کی رو سے ترکِ جہان کا مفہوم ہی تسخیرِ جہان ہے :

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو
ترکِ این دیرِ کہن تسخیرِ او

(ص ۸۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

دنیا کے اکثر مذاہب مثلاً جین دھرم، بودھ دھرم، ہندو دھرم اور مسیحیت وغیرہ کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ ناپاک ہے کیونکہ اس کی ذات میں بدی کا عنصر ہے اس لئے دنیا بھی جو سراسر مادہ ہے ناپاک ہے لہذا اس کو ترک کرنا لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر روحانی ترقی ناممکن ہے۔ پس ترک دنیا کا مطلب ہے دنیا اور اس کے علائق سے یکسر قطع تعلقی۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ یا دنیا ناپاک نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق میں مصلحت الٰہی یہ ہے کہ انسان جو خلیفۃ اللہ ہے اسے مسخر کرے تاکہ اس میں حکومت الٰہیہ قائم کر کے خود اپنی تخلیق کے مقصد کو پورا کر سکے۔ جس وقت انسان دنیا میں قانون الٰہی نافذ کرے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اس کی تمام لذتوں کو اللہ کی خوشنودی کے لئے ترک کر دے گا مثلاً اس کے قبضے میں کروڑوں روپے ہوں گے لیکن وہ بیت المال میں سے صرف اتنی ہی رقم لے گا جو اس کی جائز ضرورتوں کے لئے کافی ہو گی۔ بالفاظ دگر وہ دنیا کا مالک ہوتے ہوئے بھی اللہ کے لئے دنیا کو ترک کر دے گا۔ پس ترکِ دنیا اسلام میں بھی ہے لیکن اس کا مفہوم ہے تسخیر دُنیا۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ صعتِ حشو کا استعمال کیا گیا ہے یعنی شعر میں چند الفاظ ایسے لائے گئے ہیں جن کے بغیر بھی شعر فائدہ تام دے رہا تھا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک منجھے ہوئے صاحب عقل اور روشن ضمیر بزرگ سے یہ نکتہ سیکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان مفلسی کے باوجود اپنی خودی کی حفاظت کر سکے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے، کسی سے توقع نہ رکھے تو وہ دنیا کے ساتھ ساتھ عقبیٰ پر بھی حکمرانی کر سکتا ہے :

شنیدم نکتۂ از مردِ پیرے
کہن فرزانۂ روشن ضمیرے

اگر خود را بنا داری نگہ داشت
دو گیتی را بگیرد آن فقیرے
(ص ۱۰۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایسے زائد الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کے بغیر بھی یہ شعر مکمل تھا لیکن انہوں نے ان الفاظ کا استعمال کر کے اس میں مزید خوبی اور حسن پیدا کر لیا ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ صعتِ مبالغہ کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ایک امر کو اس حد تک بیان کیا گیا ہے کہ اس حد تک اس کا پہنچنا محال یا بعید از قیاس ہے۔ لیکن اس انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ بعید از قیاس مرتبہ بھی قرینِ قیاس محسوس ہونے لگتا ہے فرماتے ہیں کہ جو مسلمان دینِ اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہے وہ کبھی غیر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا اور اس حق پرستی کی بدولت اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر آسمان اس کے منشاء کے مطابق گردش نہیں کرتا تو وہ زمین کو اپنی مرضی کے تابع کر لیتا ہے:

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را
نساید پیشِ غیر اللہ جبین را
اگر گردوں بکام او نگردد
بکامِ خویش گرداند زمین را
(ص ۱۰۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے یہاں ایک ایسے مسلمان کی قوت ایمانی کا ذکر کیا ہے جس کے حسبِ منشا اگر آسمان چکر نہ کاٹے تو وہ زمین کو اپنی منشا کے مطابق چلا لیتا ہے۔ اگرچہ زمین کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا بعید از قیاس ہے لیکن علامہ نے اسے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ بعید از قیاس مرتبہ بھی قرینِ قیاس محسوس ہونے لگتا ہے۔

علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں ان لفظی و معنوی صنعتوں کے تجزیے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ سید عابد علی عابد صحیح ہی لکھتے ہیں کہ:

> "شعری صنعت گری کی آخری منزل یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اُس وقت تک محسناتِ شعر کی موجودگی کا شعور نہیں ہوتا جب تک کوئی تجزیہ کر کے نہ بتائے البتہ ذوقِ سلیم الفاظ و کلمات کی ترتیب و نشست میں ایک آہنگ خاص ضرور دیکھتا ہے جو معانی سے مطابقتِ تام رکھتا ہے۔" (۵۹)

بلاشبہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری میں موجود صنایع بدایع لفظی و معنوی پڑھنے والے کو محسوس تک نہیں ہوتے جب

تک کوئی تجزیہ کر کے ان کی موجودگی کا احساس نہ دلائے اور علامہ اقبال کے یہاں یہ صنعت گری کی آخری منزل بھی ہے اور ان کے بڑا شاعر ہونے کی دلیل بھی کیونکہ یہ صنعتیں کسی شعوری کوشش کے تحت کلام اقبال کا حصہ نہیں بنتیں بلکہ از خود ان کے کلام سے پھوٹتی چلی جاتی ہیں اور اہلِ فن کو نت نئی موشگافیوں کی راہیں دکھاتی ہیں۔



۵۔ عربی زبان کا بکثرت استعمال

علامہ اقبال کے یہاں عربی الفاظ وتراکیب اور قرآنی آیات واحادیث جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔
عربی الفاظ وتراکیب کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔
اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

نائب حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است
(ص ۴۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں "ظلِ اسمِ اعظم" عربی ترکیب استعمال کی گئی ہے فرماتے ہیں کہ خدا کے خلیفہ اور نائب کو دنیا کے تعلق میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو جسم کے تعلق میں جان کی ہے۔ جس طرح بدن کی تمام خوبیاں جان کی وجہ سے ہیں اسی طرح اس جہان کو نائبِ حق خوبیوں کی بدولت بہشت زار بنا دیتا ہے اس کا وجود اسمِ اعظم کا سایہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے کام اسی کی توجہ سے انجام پاتے ہیں اور وہ تمام مشکلات کو ختم کرتا ہے۔
اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند
خیبر تن پروری را بشکند
(ص ۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں "جوع و عطش" عربی ترکیب استعمال کی گئی ہے فرماتے ہیں کہ روزے میں انسان کو ایک خاص وقت کے لئے کھانے پینے سے رک جانا پڑتا ہے گویا روزہ بھوک اور پیاس پر شبخوں مارتا ہے۔ انسان کے وجود میں تن پروری کو وہی حیثیت حاصل ہے جو خیبر میں یہود کے قلعوں کو حاصل تھی۔ روزہ اس خیبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے یعنی تن پروری کا خاتمہ کر دیتا ہے۔
رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است
(ص ۱۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں "لاینفک" عربی ترکیب استعمال کی گئی ہے فرماتے ہیں کہ عقل کا سرمایہ خوف اور شک کے سوا کچھ نہیں اس کے برعکس عشق سے عزم اور یقین لاینفک ہیں یعنی جدا نہیں ہو سکتے گویا عقل جس طرف قدم اٹھاتی ہے ڈرتے ہوئے اٹھاتی ہے اور اسے یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ عشق ایسی ہر بات سے آزاد ہے وہ عزم و یقین لے کر اٹھتا

ہے اور ہر اچھے مقصد کے لئے اس انداز سے کام شروع کر دیتا ہے کہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

پیشِ پیغمبر چو کعب پاک زاد
ہدیۂ آورد از بانت سُعاد
در ثنایش گوہر شب تاب سفت
سیفِ مسلول از سیوف الہند گفت

(ص ۱۱۲، ۱۱۳ کلیات اقبال فارسی)

اس شعر میں ''سیف مسلول'' اور ''سیوف الہند'' عربی تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حضرت کعبؓ نے جو پاک سرشت تھے قصیدہ بانت سعاد بہ طور ہدیہ پیش کیا۔ اس قصیدے میں رسولؐ اللہ کی مدح و نعت میں بیش قیمت موتی پروئے گئے اور کہا گیا کہ حضورؐ سیف مسلول از سیوف الہند یعنی ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک سُتی ہوئی تلوار ہیں۔

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

البطحی در دشتِ خویش از راہ رفت
از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت

(ص ۸۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں ''البطحی'' اور ''الا اللہ'' عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں فرماتے ہیں کہ البطحی یعنی وادیٔ بطحا کے باشندے جن کے گھر میں اسلام پیدا ہوا اسلام کے اصولوں سے بیگانہ ہو گئے اسی لئے ان کے سینوں سے اللہ کی محبت جاتی رہی۔

پیام مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

اے بسا آدم کہ ابلیسی کند
اے بسا شیطان کہ ادریسی کند
پاکباز و کعبتیں او دغل
ریمن و غدر و نفاق اندر بغل

(ص ۱۸۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں ''کعبتین دغل'' عربی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا میں بہت سے انسان ابلیس صفت پائے جاتے ہیں اور بہت سے شیاطین ایسے ہیں جو ادریس یعنی نیک نظر آتے ہیں یہ لوگ بظاہر بڑے پاکباز ہوتے ہیں لیکن بباطن

بڑے دغاباز ہوتے ہیں اور ان کے دل دغا، فریب، مکاری اور نفاق سے لبریز ہوتے ہیں۔ یہاں کعبتین تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی دو کعب یا قمار کے شش پہلو پاسے۔ کعبتین دغل ان پاسوں کو کہتے ہیں جن کے اندر ایک کی طرف اندرونی جانب سیسہ چپکا دیتے ہیں تاکہ جب ان کو پھینکا جائے تو چھکا اوپر کی طرف رہے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

جہاں یکسر مقام آفلین است
درین غربت سرا عرفان ہمین است
(ص ۵۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں ''مقام آفلین'' عربی ترکیب استعمال کی گئی ہے فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں آگہی کی بات فقط یہی ہے کہ اس کا وجود عارضی ہے اور یہ ہماری مستقل قیام گاہ نہیں ہے لہذا ہمیں اس دنیا سے صرف نظر کرتے ہوئے اس دنیا کے بارے میں سوچنا ہوگا جو ہمارا مستقل ٹھکانہ ہے ہمیں اس دنیا کی عیش و عشرت کی فکر ترک کر کے اُس ابدی عیش کے لئے زادِ راہ اکٹھا کرنا ہوگا۔ جو ہمیں دنیائے آخرت میں ہی میسر آئے گا۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

از غلامی ضعف پیری در شباب
از غلامی شیر غاب افگندہ ناب
(ص ۵۷۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں ''غاب اور ناب'' عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں فرماتے ہیں کہ غلامی ایک ایسا سور ہے جو انسان کو جوانی میں ہی بڑھاپے کا شکار کر دیتا ہے اور جنگل کے شیر کو دندانِ نیش یعنی نوکیلے دانتوں سے محروم کر دیتا ہے مراد یہ کہ مرد مومن کی تمام صفات عالیہ زائل کر دیتا ہے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سودو بہبود ہمہ
عادل اندر صلح وہم اندر مصاف
وصل و فصلش لایراعی لایخاف

(ص ۶۵۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں "لا یراعی لا یخاف" عربی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ عقلِ خودبیں دوسروں کی بھلائی سے غافل ہوتی ہے وہ اپنا نفع تو دیکھتی ہے لیکن دوسروں کے نفع سے کوئی سروکار نہیں رکھتی جبکہ وحیٔ حق سب کے نفع کو دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں سب کا نفع اور بھلائی ہوتی ہے۔

خدا کا قانون ہر شخص کے ساتھ صلح و جنگ ہر دو حال میں عدل کا برتاؤ کرتا ہے اگر وہ دو آدمیوں کو ملاتا ہے یا ان کو جدا کرتا ہے تو اس معاملے میں بھی وہ نہ کسی کے ساتھ رعایت کرتا ہے اور نہ کسی سے ڈرتا ہے۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

قوتِ سلطان و میراز لاالہ
ہیبت مردِ فقیر از لاالہ
تا دو تیغ لا و الا داشتیم
ماسوا اللہ را نشاں نگذاشتیم

(ص ۸۸۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان اشعار میں "لاالہ، لا و الا اور ماسوا اللہ" عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ لاالہ الا اللہ کی تاثیر کی بدولت بادشاہ اور فقیر دونوں کو طاقت اور عظمت حاصل ہوتی ہے اسی لئے جب تک ہمارے یعنی مسلمانوں کے ہاتھ میں لاالہ الا اللہ کی تلوار رہی ماسویٰ اللہ یعنی کائنات پر غالب رہے اور بزرگی کے حامل رہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

تانہ رمز لاالہ آید بدست
بند غیر اللہ را نتواں شکست

(ص ۸۱۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں "لاالہ اور غیر اللہ" عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب تک کوئی فرد یا قوم لاالہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم سے آگاہ نہ ہو اس وقت تک وہ غیر اللہ کی غلامی سے نہیں نکل سکتی اور لاالہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کائنات میں کوئی شے حقیقی معنوں میں موجود ہی نہیں ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

فرنگی صید بست از کعبہ و دیر
صدا از خانقاہاں رفت لاغیر

حکایت پیش ملا باز گفتم

دعا فرمود یا رب عاقبت خیر

(ص ۹۵۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں "لاغیر" عربی الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو اپنا غلام بنانا شروع کیا تو خانقاہوں کے سجادہ نشینوں نے کہا "لاغیر" گویا انہوں نے مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت کا مشورہ دیا۔ میں ان سے مایوس ہو کر ملا کے پاس گیا اور سارا قصہ بیان کیا تو اس نے بھی جہاد کا حکم نہیں دیا بلکہ صرف اس دعا پر اکتفا کی کہ اے خدا! مسلمانوں کا انجام بخیر ہو۔



سید افتخار حسین شاہ کلامِ اقبال میں قرآنی آیات واحادیث کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> "آیات و مشہور اقوال کا بجنسہ شعر میں کھپا دینا آسان کام نہیں ہے قرآن مجید نظم میں نہیں بلکہ نثر میں ہے لیکن اس کی بعض آیات یا آیات کے بعض ٹکڑے ایسے ہیں کہ شاعری کے مقررہ اوزان پر پورے اترتے ہیں۔ ایسے ٹکڑے وہی شخص تلاش کر کے شعروں میں لا سکتا ہے جس نے قرآن کا مطالعہ غور سے کیا ہو۔"(۶۰)

اور کلام اقبال میں قرآن و احادیث کے جابجا حوالوں کے پیش نظر یہ کہنا مشکل نہیں کہ علامہ اقبال نے قرآن و احادیث کا مطالعہ غور سے کیا ہو گا۔

بلکہ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی :

> "اقبال کی زندگی پر یہ کتاب جس قدر............ اثر انداز ہوئی ہے اتنا نہ وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے۔ اقبال کا ایمان چونکہ "نو مسلم" کا سا ہے۔ خاندانی وراثت کے طور پر انہیں نہیں ملا ہے اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف، تعلق اور شعور واحساس کے ساتھ مطالعہ کا ذوق بہت زیادہ ہے۔ اقبال کا قرآن پڑھنا عام لوگوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز صبح قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے اقبال کے والد جب انہیں دیکھتے تو فرماتے کیا کر رہے ہو؟ اقبال جواب دیتے قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایک دن اقبال نے

پوچھا: ابّا جان آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے۔ اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گزاری۔ قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے، قرآن مجید ان کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے انہیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا۔ اس سے انہیں ایک نیا یقین ایک نئی روشنی اور ایک نئی قوت و توانائی حاصل ہوتی۔ جوں جوں ان کا مطالعہ قرآن بڑھتا گیا ان کے فکر میں بلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی۔"(۶۱)

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

آنکہ بر اعدا در رحمت کشاد
مکہ را پیغام لاتثریب داد
(ص ۲۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حضرت محمدؐ نے دشمنوں پر بھی رحمت اور شفقت کا دروازہ کھول دیا اور مکہ معظّمہ میں بسنے والے ان قریش کو جو بیس بائیس سال تک مسلمانوں پر گوناگوں ظلم کر چکے تھے لاتثریب اور معافی کی بشارت دے دی۔

یہاں قرآن عزیز کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ (یہی الفاظ (لاتثریب) فتح مکہ کے موقع پر رسول کریمؐ نے کفار مکہ سے مخاطب ہو کر کہے تھے)

قال لا تثریب علیکم الیوم ط یغفر اللہ لکم و هو ارحم الرحمین.

۹۲/۱۲

(یوسفؑ نے) کہا کہ (نہیں) آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ
(ص ۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی دل کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں اسی طرح عشق کے لئے عزت، نیکنامی اور ناموس کا سر و سامان ہو جا۔

اس شعر میں قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

صبغة الله و من احسن من الله صبغة و نحن له عبدون . ۱۳۸/۲

(ہمارے اوپر) اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے بہتر کون رنگ (دینے والا) ہے ؟

ہم تو اس کی بندگی کرنے والے ہیں۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

اہلِ حق را رمزِ توحید ازبر است
دراتی الرحمٰن عبداً مضمر است

(ص ۹۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اہل حق توحید کی رمز کے ہر پہلو سے آگاہ ہیں یہ رمز سورہ مریم کی اس آیت سے واضح ہے جس کے آخر میں اتی الرحمٰن عبداً آتا ہے۔

اس شعر میں قرآن عزیز کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

ان کل من فی السموت والارض الااتی ا لرحمن عبداً . ۹۳/۱۹

(جتنے) جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدائے رحمٰن کے روبرو عبد کی حیثیت سے حاضر ہوتے ہیں۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

مرگ را سامان ز قطع آرزوست
زندگانی محکم از لا تقنطواست

(ص ۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی کیا تمہیں معلوم ہے کہ موت کا سر و سامان کیا ہے ؟ یہ کہ آرزو کا رشتہ کٹ جائے۔ جو شخص آرزو سے محروم ہوا سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی موت کے سامان جمع ہو گئے زندگی کو مضبوط و مستحکم بنانے کا وسیلہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بشارت لاتقنطوا کو سامنے رکھتا ہوا کبھی مایوس نہ ہو۔

اس شعر میں قرآن حکیم کی حسبِ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے :

قل یعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رحمة الله ط

ان اللہ یغفر الذنوب جمعیاً . انہ ھوا لغفور الرحیم. ۳۹/۵۳

آپ (میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جو اپنے اوپر زیادتیاں
کر چکے ہو اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو بے شک اللہ سارے گناہ معاف کر دے گا
بے شک وہ بڑا غفور بڑا رحیم ہے۔

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

گفت حکمت را خدا خیر کثیر
ہر کجا این خیر را بینی بگیر
(ص ۱۸۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حکمت کو خدا نے خیر کثیر کہا ہے لہذا اے مخاطب! تجھے جہاں کہیں یہ نعمت ملے اسے حاصل کر لے۔
یہاں قرآن حکیم کی حسبِ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے :

**یؤتی الحکمۃ من یشآ ج و من یؤ ت الحکمۃ فقد اوتی خیراً
کثیرا ط وما یذکر الآ اولو الا لباب. ۲/۲۶۹**

وہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہو گئی اسے یقیناً خیرِ کثیر
عطا ہو گئی اور نصیحت تو بس صاحبانِ فہم ہی قبول کرتے ہیں۔

پیام مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

دیدۂ اے خسرو کیوان جناب
آفتابِ ما توراتِ بالحجاب
(ص ۱۸۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے والی افغانستان امیر امان اللہ خان آپ بھی اس المناک حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ہماری قوم کی عزت اور سربلندی کا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔

اس شعر میں قرآن عزیز کی ان آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

**اذ عرض علیہ بالعشی الصفنت الجیاد. فقال انی احببت حب
الخیر عن ذکر ربی ج حتّیٰ تورات بالحجاب. ۳۸/۳۱.۳۲**

(وہ قصہ بھی قابلِ ذکر ہے) جب شام کے وقت (حضرت سلیمان) کے
روبرو اصیل عمدہ گھوڑے پیش کئے گئے تو کہنے لگے میں اس مال کی محبت میں اپنے

پروردگار کی یاد سے غافل ہو گیا یہاں تک کہ (آفتاب) پردے میں چھپ گیا۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

مہ و سالت نمی ارزد بیک جو
بحرف کم لبثتم غوطہ زن شو
(ص ۷۵۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے انسان اس دھرتی پر تیرے گزارے ہوئے مہ و سال چونکہ جو کے ایک دانے سے بھی ارزاں ہیں لہذا تجھے چاہئے کہ تو آیۂ کم لبثتم پر غور کر۔

کم لبثتم قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے ماخوذ ہے :

قل کم لبثتم فی الارض عدد سنین. قالوا لبثنا یوماً او بعض یوم فسئل العادین. قل ان لبثتم الا قلیلاً لو انکم کنتم تعلمون.۲۳/۱۱۲.۱۱٤

ارشاد ہو گا کہ (اچھا) تم برسوں کے حساب سے کتنی مدت زمین پر رہے وہ کہیں گے ہم ایک دن رہے ہوں گے یا دن کا بھی کچھ حصہ۔ سو تو گننے والوں سے پوچھ لے ارشاد ہو گا کہ بے شک (تم دنیا میں) تھوڑی ہی مدت رہے کاش تم (اسے) سمجھ رہے ہوتے۔

زبور عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

مجو مطلق دریں دیر مکافات
کہ مطلق نیست جز نور السموات
(ص ۵۴۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اس دنیا میں بجز خدائے واحد کے جو آسمانوں کا نور ہے سز لوجزا سے بری کسی دوسرے موجود کو تلاش کرنا بیکار ہے۔

اس شعر میں قرآن حکیم کی اس آیت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اللہ نور السموٰت والارض ط مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح ط . المصباح فی زجاجۃ ط الزجاجۃ کا نھا کوکب دری یوقد من شجرۃ مبرکۃ زیتونہ لا شرقیۃ ولا غربیۃ یکاد زیتھا یضئ ولم لم تمسسہ نار ط . نور علی نور . یھدی اللہ لنورہ من یشاء ط . و یضرب اللہ الامثال للناس

ط . والله بكل شيءٍ عليم. ٣٥/٢٤

اللہ (ہی) آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور (ہدایت) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے۔ چراغ قندیل میں ہے۔ قندیل گویا ایک چمکدار ستارہ ہے۔ چراغ روشن کیا جاتا ہے۔ ایک نہایت مفید درخت (یعنی) زیتون سے جو نہ پورب رُخ ہے نہ پچھّم رُخ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اٹھیگا اگرچہ آگ اسے نہ بھی چھوئے۔ نور ہی نور ہے۔ اللہ اپنے اس نور تک جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

صرصرے ده با ہوائے بادیہ
انّھم اعجاز نخلٍ خاویہ
(ص ۶۴۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ابو جہل ہبل سے درخواست کرتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کے لئے نہایت تند و تیز ہوا بھیج تاکہ وہ تباہ ہو جائیں اور بلا شبہ وہ تنے ہیں کھجوروں کے درختوں کے جو گر پڑے ہیں۔

یہاں قرآنِ عزیز کی ان آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

و اما عاد فاهلكوا بريح صرصر غاتية. سخرها عليهم سبع ليال و ثمنية ايام حسوماً فترى القوم فيها صرعٰى كانهم اعجاز نحل خاوية. ٧.٦/٦٩

اور رہے عاد سو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کئے گئے (اللہ نے) اسے ان پر مسلط کر دیا تھا سات راتوں اور آٹھ دنوں تک لگاتار تو وہاں اس قوم کو یوں گرا ہوا دیکھتا ہے کہ گویا وہ گری ہوئی کھجور کے تنے پڑے ہیں۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

ارض حق را ارض خود دانی بگو
چیست شرح آیۂ لا تفسدوا
(ص ۶۹۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے انسان تو خدائی زمین کو اپنی زمین یعنی اپنی ملکیت قرار دیتا ہے اور اسی تصرف بے جا سے دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہوتے ہیں لیکن کیا تو آیۂ لاتفسدوا کے معنی جانتا ہے۔

یہاں قرآنِ مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها ذلكم خيرلكم ان كنتم مومنين. ٨٥/٧

ملک میں فساد نہ مچاؤ۔ اس کی درستی کے بعد یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

از شریعت احسن التقویم شو
وارث ایمان ابراہیمؑ شو
(ص ۸۲۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب! تو اگر شریعت کی پابندی کرے تو تجھ پر **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقويم** کی حقیقت منکشف ہو جائے مراد یہ کہ اگر تو شریعت کا اتباع کرے تو بلاشبہ مذکورہ آیت کا مصداق بن سکتا ہے یعنی تیری تمام پوشیدہ صلاحیتیں اور استعدادیں بالفعل ظاہر ہو سکتی ہیں جن کے ظہور کے بعد تجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ میں واقعی احسن تقویم پر پیدا ہوا ہوں اور جب یہ صداقت تجھ پر واضح ہو جائے گی تو قدرتی طور پر تیرے اندر ابراہیمیؑ ایمان یعنی کامل ایمان پیدا ہو جائے گا۔

اس شعر میں قرآنِ عزیز کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے :

لقد خلقنا الانسان فی احسن التقويم. ٩٥/٤

کہ ہم نے انسان کو بہترین انداز کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ آیات خدا بیند حراست
اصل این حکمت ز حکم انظر است
(ص ۸۳۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کرتا ہے وہ حُر ہو جاتا ہے یعنی غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس حکمت کی بنیاد قرآنِ حکیم کی آیۂ انظر ہے مراد یہ کہ جب وہ اشیائے کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر شے

اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے یعنی اپنے وجود میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے اور میری طرح عاجز مسکین اور ناتواں ہے۔ چونکہ ایسا ہے اس لئے نہ کوئی شے مجھے کچھ دے سکتی ہے نہ مجھ سے کچھ لے سکتی ہے نہ مجھے نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ نہ مجھ پر حکومت کر سکتی ہے نہ مجھے اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتی ہے لہذا میں اللہ کے سوا کسی کو اپنا رازق، مالک یا حاکم نہیں بناؤں گا بس یہی احساس انسان کو حُر یعنی مومن بنا دیتا ہے۔

اس شعر میں درج ذیل آیۂ قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

انظر كيف نصرف الايت ثم هم يصدفون. ٤٦/٦

آپ دیکھتے ہیں کہ ہم کس کس طرح دلائل (توحید) بیان کرتے ہیں اور یہ
پھر بھی بے رُخی کئے ہوئے ہیں۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

می دہد مارا پیامے لا تخف
می رساند بر مقام لاتخف
(ص ۸۸۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی قرآنِ عزیز کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیں لا تخف کا مژدہ بھی سناتا ہے اور لا تخف کی منزل پر بھی پہنچاتا ہے مراد یہ کہ جو شخص اس کتاب کی تعلیمات پر عمل کرتا ہے وہ کائنات میں کسی شے سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا کے سوا کسی میں یہ طاقت ہی نہیں ہے کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔

اس شعر میں قرآنِ حکیم کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے :

فاوجس فی نفسه خيفة موسٰى . قلنا لا تخف انك انت الاعلٰى.

٦٨.٦٧/٢٠

اس سے موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ اندیشہ محسوس کیا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں
غالب تو یقیناً تم ہی رہو گے۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

آشکارا دیدنش اسرائے ماست
در ضمیرش مسجد اقصائے ماست
(ص ۸۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی (جس طرح حضورؐ کی معراج یہ تھی کہ آپؐ نے خدا کو دیکھا اُسی طرح) ہماری معراج یہ ہے کہ ہم آپؐ کو دیکھ لیں

(کیونکہ) ہماری مسجد اقصیٰ یا ہمارا انتہائی روحانی عروج آپؐ کی ذات میں پوشیدہ ہے۔
اس شعر میں قرآن حکیم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بر کنا حولہ لنریہٗ من ایتنا انہ ھو السمیع البصیر. ۱۷/۱

پاک ذات ہے وہ جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے ارد گرد کو ہم نے بابرکت بنا رکھا ہے تاکہ ان (بندہ) کو ہم بعض اپنے عجائب (قدرت) دکھائیں بے شک سمیع وبصیر (وہی اللہ) ہے۔

مثنوی مسافر میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

از مقام ذوق و شوق آگاہ شو
ذرہٗ؟ صیاد مہر و ماہ شو
(ص ۸۵۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی مقام عشق سے آگاہ ہی حاصل کر داس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اگرچہ بظاہر تم ذرے کی طرح حقیر اور ضعیف ہو لیکن عشق کی بدولت تم میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ کائنات پر حکومت کر سکو گے۔
اس شعر میں قرآن عزیز کی مندرجہ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے۔

و سخرلکم ما فی السموت وما فی الارض جمیعا منہ ط ان فی ذلك لایت لقوم یتفکرون. ۱۳/۴۵

اور اس نے تمہارے لئے مسخر کیا جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے نشان ہیں جو غور کرتے رہتے ہیں۔

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

بجامِ نو کہن مے از سبو ریز
فروغ خویش را بر کاخ وکوریز
اگر خواہی ثمراز شاخِ منصور
بہ دل لا غالب الا اللہ فرو ریز
(ص ۹۵۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان تو (اپنے وجود کے) نئے جام میں (قرآن حکیم) کے سبو سے (اسلام کی) پرانی شراب انڈیل اور تمام دنیا کو اپنی تابانی سے منور کر دے۔ اگر تو شاخِ منصور سے ثمر حاصل کرنا چاہتا ہے یعنی دنیا میں سربلند ہونا چاہتا ہے تو پھر اپنے دل میں اس صداقت کو جگہ دے کہ تجھ پر اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی ہستی غالب نہیں آسکتی۔

لا غالب الا اللہ قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لایعلمون. ۲۱/۱۲

اور اللہ اپنے (ہر) کام پر غالب ہے لیکن اکثر انسان (اتنا بھی) نہیں جانتے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

دریں وادی زمانی جاودانی
زخاکش بے صور روید معانی
حکیماں باکلیماں دوش بردوش
کہ این جاکس نگوید "لن ترانی"

(ص ۹۱۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی شہر مدینہ میں یہ تاثیر ہے کہ یہاں کی فضاؤں میں عشقِ رسول ﷺ کی بدولت وقت بھی ٹھہر سا جاتا ہے اور معانی کے لئے اگرچہ صورت یعنی الفاظ کا ہونا ضروری ہے لیکن اس سرزمین کی شان یہ ہے کہ یہاں الفاظ کے واسطے کے بغیر ہی دل پر معنی منکشف ہوتے ہیں۔ مراد یہ کہ اگر کوئی شخص حضور انور ﷺ کے روضۂ مقدسہ کے سامنے ادب سے بیٹھ جائے اور حضور ﷺ سے لو لگا لے تو اس کے دل پر فیضانِ رسالت ﷺ کا نزول ہونے لگتا ہے نیز حضور انور ﷺ کا روضۂ مقدسہ ایسی جگہ ہے کہ جہاں حکیم اور کلیم، فلسفی اور صوفی، اہلِ استدلال اور اہلِ وجدان دونوں کی تسلی کا سامان موجود ہے وجہ یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ اپنے تمام عاشقوں کی دلداری فرماتے ہیں۔ ان کے دروازے سے کوئی محروم نہیں جاتا اور نہ ہی وہ کسی کو "لن ترانی" کہتے ہیں۔

یہاں قرآن عزیز کی مندرجہ ذیل آیت کی طرف اشارہ ہے۔

ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا و کلمه ربه لا قال رب ارنی انظر الیك ما قال لن ترانی. ۱۴۳/۷

اور جب موسیٰ ہمارے وقت (موعود) پر آگئے اور ان سے ان کا پروردگار ہمکلام ہوا۔ موسیٰ بولے۔ اے میرے پروردگار مجھے اپنے آپ کو دکھلا دیجئے (کہ) میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں (اللہ نے) فرمایا تم مجھے ہر گز نہیں دیکھ سکتے۔

☆☆☆

کلامِ اقبال میں احادیث کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ذات او دروازۂ شہر علوم

زیر فرمانش حجاز و چین و روم

(ص ۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حضرت علی مرتضٰی کی ذات علوم کے شہر کا دروازہ ہے اور حجاز چین اور روم سب اُسی کے زیر فرمان ہیں۔

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاں رسول کریمؐ نے حضرت علیؓ کو علم کا دروازہ کہا ہے :

انا مدینة العلم و علی بابها.

(جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۱۲ طبع میرٹھ)

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔

اسرار خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

زندگی از دہر و دہر از زندگی است

لا تسبوا الدھر فرمانِ نبی است

(ص ۲۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی زمانے سے ہے اور زمانہ زندگی سے ہے رسول اکرمؐ کا فرمان ہے کہ زمانے کو بُرا بھلا نہ کہو۔

روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں جن کی طرف شعر میں تلمیح کی گئی ہے۔

عن ابی هریره عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لا تسبوالدهر فان الله هو الدهر.

(مسلم، ج ۲، ص ۲۳۷ علیمی)

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

آنکہ مہتاب از سرانگشتش دونیم

رحمت او عام و اخلاقش عظیم

(ص ۱۳۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حضورؐ کی وہ پاک ذات جن کی انگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا سب کے لئے رحمت تھی اور ان کے اخلاق سب سے اعلیٰ تھے۔

اس شعر کے مصرع اولیٰ کی تائید حسب ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔

عن ابی مسعود بنبا نحن مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمغیٰ اذا انفلق القمر فلقتین وراء الجبل و فلقة دونه فقال لنا صلی اللہ علیہ وسلم اشهدوا.

(جمع الفوائد، ج ۲، ص ۲۰۰، طبع میرٹھ)

یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ہم رسول کریمؐ کے ساتھ منی میں تھے کہ (کفار مکہ کے معجزہ طلب کرنے پر آپ کی انگلی کے اشارے سے) چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے (جن میں سے) ایک ٹکڑا پہاڑ کے پیچھے چلا گیا اور دوسرا (پہاڑ کے) اُس طرف رہ گیا تب آپ نے ہماری طرف مخاطب ہو کر فرمایا گواہ رہو۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

بہر آن شہزادہ خیر الملل
دوشِ ختم المرسلین نعم الجمل
(ص ۱۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی سب سے بہتر امت یعنی ملت اسلامیہ کے اس شہزادے یعنی حضرت امام حسینؑ کی شان یہ تھی کہ رسولوں کے خاتم کا دوش مبارک اس کے لئے اچھی سواری قرار پایا۔

اس شعر میں جس روایت کی طرف اشارہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

عن جابر قال دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم والحسن والحسین علی ظهره وهو يقول نعم الجملِ جملكما و نعم العدلان انتما.

(کنز العمال ج ۷ ص ۱۰۸ مصری)

حضرت جابر فرماتے ہیں کہ میں رسول کریمؐ کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا کہ حضرت حسین آپؐ کے کاندھوں پر سوار تھے اور آپ فرما رہے تھے کہ تمہاری سواری بھی بہترین ہے اور تم سوار بھی بہترین ہو۔

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

سروری در دین ما خدمت گری است
عدل فاروقی و فقر حیدری است

(ص ۹۰ ا کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے والیٔ افغانستان امیر امان اللہ خان! اس بات کو مدِ نظر رکھئے کہ اسلام میں سرداری کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کا سردار ہو وہ ان کی خدمت کرے چنانچہ فاروق اعظمؓ اور حیدر کرارؓ کی زندگی اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اگر مسلمانوں کے امیر میں فاروق اعظم کا سا عدل اور حیدرؓ کا سا فقر نہ ہو تو اسلام کی رو سے وہ امارت یعنی حکومت کا اہل نہیں۔

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

سید القوم خادمهم.

(حافظ عبدالرحمٰن سخاوی۔ المقاصد الحسنہ، ص ۱۱۶ طبع لکھنؤ)

قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔

زبور عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

منور شو زنور "من یرانی"

مژہ برہم مزن تو خود نمانی

(ص ۵۵۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب تو من یرانی کے نور سے منور ہو جا کیونکہ تیرا وجود ذاتِ مصطفویؐ کی بدولت ہے۔ اگر ذات مصطفویؐ نہ ہوتی تو یہ کائنات ہی تخلیق نہ ہوتی اور اگر کائنات نہ ہوتی تو انسان کا وجود کہاں ہوتا لہٰذا تجھے چاہئے کہ تو حضور اکرمؐ کا دیدار کرتے ہوئے پلکیں جھپکنا بھی بھول جائے کیونکہ اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تو خود بھی باقی نہیں رہے گا۔ مراد یہ کہ تو عشقِ رسولؐ میں ڈوب جا کیونکہ اسی عشق کی بدولت تجھے بقا اور دوام حاصل ہوگا۔

یہاں من یرانی اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

عن ابی قتادة قال قال رسولاللہ صلی اللہ علیه وسلم من رانی فقد رای الحق.

(مشکوٰۃ ص ۳۹۴)

حضرت ابی قتادہ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے فی الحقیقت مجھے دیکھا۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

از حدیثِ مصطفیؐ داری نصیب

دین حق اندر جہاں آمد غریب

(ص ۶۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی کیا تو نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث سے آگاہ ہے کہ دین حق یعنی دین اسلام اس دنیا میں اجنبی ہے اس شعر میں جس مضمون کی طرف اشارہ ہے اس کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :

بدء الاسلام غریبا و سیعود کمابدء فطوبی للغرباء.

(مشکوٰۃ، ج ا، ص ۲۹، ۳۰، ترمذی ج ۲ ص ۹۲)

اسلام ابتداء میں جس طرح اجنبی تھا آخر میں بھی ایسا ہی اجنبی ہو جائے گا۔

(اس کی حالت غربا سے ملتی جلتی ہے) پس غربا کے لئے بشارت ہو۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

گفتمش بگذر ز آئین فراق

ابغض الاشیاء عندی الطلاق

(ص ۷۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں نے ابلیس سے کہا کہ تو آئین فراق یعنی خدا کی نافرمانی سے باز کیوں نہیں آجاتا ؟ تجھے چاہئے کہ اپنی اس روش کو ترک کردے کیونکہ خدا کی نظر میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے تو وہ جدائی ہے۔

اس شعر میں ذیل کی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

"**البغض الحلال الی اللہ الطلاق**" راوہ ابوداؤد ابن ماجہ۔

(ابن حجر عقلانی بلوغ المرام ص ۲۲۳ مجتبائی)

ابنِ حجر سے روایت یہ ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

بندۂ حق وارث پیغمبراں

او نگنجد در جہانِ دیگراں

(ص ۸۵۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی بندۂ حق پیغمبروں کا وارث ہوتا ہے وہ دوسروں کی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں رہتا اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے۔

اس شعر میں حسب ذیل حدیث کی طرف اشارہ مقصود ہے :

العلماء ورثة الانبیا.

(اسنی المطالب ص ۱۴۵ طبع مصر)

علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

مومناں را گفت آں سلطانِ دین

مسجدِ من این ہمہ روے زمین

(ص ۸۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حضور رسالتمآبؐ نے مومنین سے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے تمام روے زمین کو میرے لئے مسجد بنادیا ہے۔ حضور اکرمؐ کے اس ارشاد بلیغ کے دو معنی ہیں۔ پہلے اور ظاہری معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو نماز پڑھنے یا سجدہ کرنے کے لئے مسجد کی احتیاج نہیں ہے وہ بھی اللہ کے بندے ہیں اور یہ زمین بھی اللہ کی ملکیت ہے اس لئے وہ جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں ان کی عبادت کسی عمارت کے وجود پر موقوف نہیں۔

اس ارشاد کے دوسرے اور باطنی معنی یہ ہیں کہ اللہ نے سرکارِ دوعالم کو حکم دیا ہے کہ ساری دنیا کو مسجد بنادو یعنی ساری دنیا میں اسلامی حکومت قائم کردو تاکہ ہر جگہ اللہ ہی کا قانون نافذ ہو سکے اور ہر شخص آزادی کیساتھ اللہ کے سامنے سر جھکا سکے۔ کوئی انسان کسی کو اللہ کی عبادت سے باز نہ رکھ سکے یا اس کی اذان یا نماز پر پابندی عائد نہ کر سکے۔

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

جعلت لی الارض مسجد و طهورا.

(بلوغ المرام ص ۱۰۵ مجتبائی)

میرے لئے تمام روئے زمین مسجد بنادی گئی ہے اور پاکیزہ ٹھہرادی گئی ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست

چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست

(ص ۸۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی افسوس کہ یورپ اس نکتے سے آگاہ نہیں ہے کہ اکل حرام سے انسان کو حقیقی راحت اور اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس کی آنکھیں اللہ کے نور کے ذریعے نہیں دیکھتیں یعنی قرآن سے روشنی یا بصیرت حاصل نہیں کرتیں۔

اس شعر میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اتقوا فراسته المومن فانه ینظر بنور الله.

(اسنیٰ المطالب، ص ۲۳۸ طبع مصر)

مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور کے ذریعے سے دیکھتا ہے۔

ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

مسلمان را ہمیں عرفان و ادراک
کہ در خود فاش بیند رمز لولاک
خدا اندر قیاس ما نگنجد
شناس آن را کہ گوید ما عرفناک

(ص ۱۰۲۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی مومن کے عرفان کی انتہا یہ ہے کہ وہ فنافی الرسولؐ ہو کر خود اس حدیث کا مصداق بن جائے کہ واقعی اگر حقیقت محمدیہؐ واسطہ نہ ہوتی تو کائنات پیدا نہ ہوتی۔ مراد یہ کہ اگر وہ اپنے وجود کو حضورؐ کے وجود میں فنا کر دے تو اسے مذکورہ حدیث کا عرفان حاصل ہو جائے۔ ذاتِ ایزدی چونکہ وراء الفہم ہے اس لئے مومن کا منتہائے عرفان یہ ہے کہ وہ کم از کم اس کی معرفت تو حاصل کرے جس نے یہ فرمایا :

ما عرفناك حق معرفتك (یہ امام ابو حنیفہؒ کے فرمودات میں سے ہے)

یعنی اے خدا ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم عاجز اور ناقص اور محدود عقل و خرد والے بندے تجھے اس طرح نہیں پہچان سکتے جس طرح پہچاننے کا حق ہے۔

یہاں لولاک اشارہ ذیل کی حدیث قدسی کی طرف ہے :

لولاك لما خلقت الافلاك.

(ملا علی قاری المصنوع فی احادیث الموضوع ص ۲۲)

اے نبی اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کو بھی پیدا نہ کرتا۔

☆☆☆

٦۔ تمثیل نگاری

علامہ اقبال نے اپنے افکار و معانی کی صراحت کے لئے تمثیل نگاری کا وصف استعمال کیا لیکن اپنے دقیق مضامین اور بلند افکار کی وضاحت کے لئے اس تمثیلی انداز کو اختیار کرنے میں وہ یقیناً فارسی کے صوفی شعراء سے متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر محمد ریاض اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

> "تمثیل نگاری کے صنایع اقبال کے ہاں موجود ہیں .... نظامی...... رومی...... (اور) دیگر معروف عرفانی شعراء جیسے سنائی، عطار، عراقی، حافظ اور جامی وغیرھم کے ہاں بھی یہ روش موجود رہی ہے اور استاد سعید نفیسی مرحوم کے بقول (رومیٔ عصر ص ۱۲۴) اقبال اسی سمبولیزم کے دلدادہ تھے۔"(۷۲)

لیکن علامہ اقبال نے ان عرفانی شعراء کی طرح چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعے ہی اس انداز کو اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے فرد فرداً اشعار میں بھی تمثیلی رنگ پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اصناف کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں بھی یہ وصف بھرپور انداز سے دیکھنے کو ملتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرار خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

گفت با الماس در معدن زغال
اے امین جلوہ ہائے لازوال
ہمدمیم و ہست و بود ما یکسیت
در جہاں اصلِ وجودِ مایکسیت
من بکاں میرم زدردِ ناکسی
تو سرِ تاجِ شہنشاں رسی
قدرِ من از بدگلی کمتر زخاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک
روشن از تاریکیٔ من مجمر است
پس کمالِ جوہرم خاکستر است
پُشت پا ہرکس مرا برسر زند

بر متاع ہستیم اخگر زند
بر سر و سامان من باید گریست
برگ و ساز ہستیم دانی کہ چیست؟
موجۂ دودے بہم پیوستۂ
مایہ دارِ یک شرار جستۂ
مثل انجم روے تو ہم خوے تو
جلوہ ہا خیزد ز ہر پہلوے تو
گاہ نورِ دیدۂ قیصر شوی
گاہ زیب دستہء خنجر شوی
گفت الماس اے رفیق نکتہ بیں
تیرہ خاک از پختگی گردد نگیں
تا بہ پیرامونِ خود درجنگ شُد
پختہ از پیکار مثل سنگ شُد
پیکرم از پختگی ذوالنور شُد
سینہ ام از جلوہ ھا معمور شُد
خوار گشتی از وجودِ خام خویش
سوختی از نرمیٔ اندامِ خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثل سنگ شو الماس باش
در صلابت آبروے زندگی است
ناتوانی، ناکسی ناپختگی است
(ص ۵۶، ۵۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

حکایت کا مطلب یہ ہے کہ کوئلے نے الماس سے کہا کہ ہم دونوں کان میں اکٹھے رہتے ہیں ہماری اصل بھی ایک ہی ہے لیکن میں بے حقیقتی کے رنج سہتا ہوں اور تو بادشاہوں کے تاج کی زینت بنتا ہے۔ مجھ سے لوگ انگیٹھیاں دہکاتے ہیں۔ بالآخر راکھ ہو جاتا ہوں۔ تو اتنا روشن ہے کہ تیرے ہر پہلو سے جلوے پھوٹ پھوٹ کر نکلتے ہیں۔ اس اختلاف حال کا سبب کیا

الماس نے جواب دیا کہ صرف پختگی اور پائیداری اس کا سبب ہے۔ معمولی مٹی اپنے اندر پختگی پیدا کر لیتی ہے تو انگشتری کا نگینہ بن جاتی ہے۔ میں بھی پختگی ہی سے روشن ہوا۔ تو اس لئے ذلت و خواری میں پڑا کہ خام تھا۔ اس وجہ سے جل گیا کہ تیرا جسم نرم تھا دنیا اسی سے نور حاصل کرتی ہے جو پختہ اور پائیدار ہو۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

روزے آن زیبندۂ تاج و سریر
آن سپہدار و شہنشاہ و فقیر
صبحگاہاں شد بہ سیر بیشۂ
با پرستارے وفا اندیشۂ
سرخوش از کیفیت بادِ سحر
طائراں تسبیح خواں بر ہر شجر
شاہِ رمز آگاہ شُد محوِ نماز
خیمہ برزد در حقیقت از مجاز
شیرِ بیر آمد پدید از طرف دشت
از خروشِ او فلک لرزندہ گشت
بوے انسان دادش از انسان خبر
پنجہ عالمگیر را زد بر کمر
دستِ شہ نادیدہ خنجر بر کشید
شرزہ شیرے را شکم از ہم درید
دل نخود راہے نداد اندیشہ را
شیرِ قالین کرد شیر بیشہ را
باز سوے حق رمید آن ناصبور
بود معراجش نمازِ باحضور
این چنین دل خودنما و خود شکن
دارد اندر سینۂ مومن وطن
بندۂ حق پیشِ مولا لاستے

پیشِ باطل از نعم برجاستے
توہم اے ناداں دلے آورد بدست
شاہدے را محملے آور بدست
خویش را درباز و خود را بازگیر
دام گستر از نیاز و ناز گیر
عشق را آتش زن اندیشہ کن
روبہ حق باش و شیری پیشہ کن
حرفِ حق عنوانِ ایمان است و بس
خوف غیر از شرک پنہاں است و بس
(ص ۹۸، ۹۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

حکایت کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر سیر کے لئے جنگل کی طرف نکل گیا۔ صرف ایک غلام ساتھ تھا۔ بادشاہ نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ عین اس حالت میں شیر نے حملہ کیا۔ عالمگیر نے خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر ڈالا۔ پھر بے تابانہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہو گیا تاکہ نماز پوری کرے جو مومن کے لئے معراج کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا ہی دل مومن کے سینے میں جگہ پا سکتا ہے۔ غیر اللہ کا خطرہ ہو تو اس سے بڑھ کر اپنی قوت کی نمائش کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ عبودیت اور عبادت کا مقام آجائے تو اس سے بڑھ کر عاجز اور درماندہ دل بھی کوئی نہ ہو گا۔ موقع اور محل کے لحاظ سے مومن کا دل ان دو بالکل متضاد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہی ایمان ہے جبکہ غیر اللہ کا خوف شرکِ پنہاں کے سوا کچھ نہیں۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست
زبان لرزد کہ معنی پیچدار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را
درون او نہ گل پیدا نہ خار است
(ص ۲۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی برائی اور اچھائی کا فلسفہ اس قدر مشکل ہے کہ اس کے بیان پر میری زبان لرزنے لگتی ہے۔ اس کی مثال کانٹے اور پھول کی سی ہے جن کا امتیاز شاخ سے باہر تو دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے اندر نہ پھول کا کوئی وجود ہے اور نہ کانٹے کا۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

محبت چون تمام افتد رقابت از میان خیزد
بہ طوف شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد
(ص ۳۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی جب محبت کامل ہو جاتی ہے تو رقابت کا احساس فنا ہو جاتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ پروانے چونکہ محبت میں کامل ہیں اس لئے جب وہ شمع یعنی کسی محبوب کا طواف کرتے ہیں تو کوئی پروانہ کسی پروانے سے جنگ و جدل میں جو رقیبوں کا شیوہ ہے، مصروف نہیں ہوتا بلکہ سب مل کر آشتی کے رنگ میں اپنے محبوب کا طواف کرتے ہیں۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ترا ناداں امید غم گساریھا ز افرنگ است
دل شاہین نسوزد بہر آں مرغے کہ درچنگ است
(ص ۵۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان تو انگریزوں کا غلام بن چکا ہے لیکن اپنی نادانی کے باوصف انہی سے ہمدردی کی توقع کئے بیٹھا ہے حالانکہ شاہین کے دل میں اس پرندے کے لئے رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا جو اس کے پنجے میں ہو یعنی جسے وہ شکار کر چکا ہو۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں

ذات حق را نیست این عالم حجاب
غوطہ را حائل نگردد نقشِ آب
(ص ۶۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگر آپ ذاتِ حق سے ملنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے یہ عالم حجاب نہیں ہے یعنی آپ کے اور ذاتِ حق کے درمیان کوئی پردہ یا مغائرت نہیں ہے جسے آپ پردہ سمجھتے ہیں یہ آپ کے فہم کا قصور ہے یا محض فریبِ نظر ہے۔ تعینات نے من و تو کا امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ تعینات کے اس پردے کو ہٹا دیجے جس سے آپ ملنا چاہتے ہیں وہ آپ کو آپ ہی کے اندر دکھائی دے گا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ دریا میں غوطہ لگانے کے لئے کھڑے ہوں تو آپ کو اپنا عکس پانی میں نظر آئے گا لیکن یہ عکس آپ کے اور دریا کے درمیان حائل نہیں ہوتا جونہی آپ نے غوطہ لگایا یعنی آپ میں اور دریا میں اتصال ہوا وہ عکس فوراً غائب ہو گیا اس لئے کہ وہ مشہود تو تھا لیکن موجود نہ تھا اور وہ اُسی وقت تک موجود رہتا ہے جب تک آپ اور دریا ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ ادھر دوئی مٹی اُدھر وہ نقش غائب ہو گیا۔ اسی طرح عالم خود حق تعالیٰ ہی کی ایک شان جلوہ گری ہے اسی لئے سالک اور حق کے درمیان اس کے حائل ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ وہ غیر اللہ ہوتا تو حائل ہوتا مگر غیر حق کا تو کوئی وجود ہی نہیں

ہے۔اس لئے کسی کے حائل ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔بلکہ جب سالک عالم میں غوطہ زن ہوتا ہے تو در حقیقت وہ ذاتِ حق میں ہی غوطہ زن ہوتا ہے کیونکہ عالم خدا کی ہی تجلی کا دوسرا نام ہے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

چشم کور است این کہ بیند ناصواب
ہیچ گہ شب را نہ بیند آفتاب

(ص ۶۲۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگر تجھے کائنات میں بدی یا برائی نظر آئے تو سمجھ لے کہ تیری آنکھ نورِ معرفت سے محروم ہے کیونکہ آفتاب کو کسی جگہ اور کسی وقت بھی تاریکی نظر نہیں آتی یعنی اگر تیرا دل پاک اور روشن ہے تو تجھے دنیا میں کہیں بھی ناپاکی اور تاریکی یعنی بدی نظر نہیں آئے گی۔ تو جہاں جائے گا وہ جگہ پاکیزہ اور منور ہو جائے گی جس طرح آفتاب جہاں جاتا ہے وہاں نور یعنی روشنی پھیلا دیتا ہے اندھیرا باقی ہی نہیں رہتا جو اُسے دکھائی دے اسی طرح اگر تو نیک بن جائے تو تجھے بدی نظر ہی نہیں آئے گی کیونکہ تیرا وجود قاطع شر بن جائے گا جس طرح آفتاب کا وجود قاطع ظلمت ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

اندرین رہ تکیہ برخود کُن کہ مرد
صید آہو با سگے کورے نکرد

(ص ۸۳۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ان حالات میں جبکہ حکمرانوں کی اسلام سے ناواقفیت اور ان کی انگریز دوستی کے نتیجے میں ملتِ اسلامیہ ذلیل و خوار ہو چکی ہے اور ان کی پیروی میں سراسر نقصان ہے مسلمانوں کو بجز اپنی ذات کے کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اندھے کتے کی مدد سے ہرن کو شکار نہیں کیا جاسکتا یعنی نااہل حکمرانوں کی معیت میں حقیقی منزل یعنی منزلِ اسلام کا حصول ناممکن ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

بخود پیچیدگاں در دل اسیرند
ہمہ درد اند و درماں ناپذیرند
سجود از ماچہ می خواہی کہ شاھاں
خراجے از دہ ویران نگیرند

(ص ۸۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے خدا! تیرے عشاق اپنے دل کی گرفت سے آزاد ہی نہیں ہوتے کہ کسی دنیاوی کام کی طرف متوجہ ہوں۔اس

رنگِ عاشقی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ سراپا درد بن گئے ہیں اور چونکہ درد ان کی زندگی بن گیا ہے لہذا وہ اسکا درماں یا علاج کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں اندریں حالات تیرا اپنے عاشقوں سے سجدہ طلب کرنا بیکار ہے کیونکہ تباہ شُدہ دیہاتوں سے بادشاہ خراج وصول نہیں کرتے۔

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

گلہ از سختیٔ ایّام بگذار
کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است
نمی دانی کہ آبِ جویباراں
اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است

(ص ۹۹۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے انسان! زمانے یا تقدیر کی شکایت کرنا ترک کر دے کیونکہ جو شخص دنیا کی مشکلات کا مقابلہ نہیں کرتا وہ اپنی خودی کو کبھی مستحکم نہیں کر سکتا۔ کیا تو نہیں جانتا کہ چشمے کا پانی اسی صورت میں خوشگوار دکھائی دیتا ہے جب وہ پتھروں سے ٹکرا کر گزرتا ہے۔



۷۔ جذبات نگاری

ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں :

"اقبال کے کلام میں قلبی جذبات اور شخصی تاثرات کی جگہ "اجتماعی تصورات" کا غلبہ ہے مگر شاعر نے ان کی بنیاد "ہمہ گیر احساسات" پر رکھی ہے اس لئے ہر چند کہ اس میں عام قلبی تجربات اور ہمہ گیر انسانی جذبات کی کمی محسوس ہوتی ہے مگر اجتماعی حساسات میں بھی وہ اثر پیدا ہو گیا ہے کہ وہ احساسات عام جذبات انسانی کی سطح پر آگئے ہیں۔" (۶۳)

علامہ اقبال کی شاعری دراصل حیاتِ انسانی کے آفاقی شعور کو مرتعش کرنے والا سرمدی نغمہ ہے لہذا انہوں نے جذبات کے دقیق و عمیق پہلوؤں کی طرف وہ توجہ نہ دی جو سبکِ عراقی کا خاصہ تھا۔ اس کے باوجود ان کے یہاں جذبات نگاری انتہائی اثر انگیز ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ان کی شاعری روح کو تڑپانے والے اور قلب کو گرما دینے والے پیغام پر مبنی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ شیخ بو علی قلندر کی داستان سناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا ایک مرید بازار کی طرف جا رہا تھا اس نے حضرت شیخ کی شرابِ محبت اتنی پی رکھی تھی کہ اسی میں سرمست تھا۔ اسی اثنا میں شہر کے حاکم کی سواری سامنے آگئی جس کے ساتھ غلاموں اور چوبداروں کی ایک جماعت تھی حاکم کی ہمرکابی کے باعث تکبر و غرور سے بدمست ایک چوبدار نے اسے راستے سے ہٹنے کو کہا۔ لیکن اس کے دھیان نہ دینے پر اپنا عصا پورے زور سے اس کے سر پر دے مارا۔ علامہ نے یہاں درویش کے جذبات کی عکاسی نہایت مؤثر انداز میں کی کہ :

ازرہِ عامل فقیر آزردہ رفت
دلگراں و ناخوش و افسردہ رفت
در حضور بو علیؒ فریاد کرد
اشک از زندانِ چشم آزاد کرد
صورتِ برقے کہ برکہسار ریخت
شیخ سیلِ آتش از گفتار ریخت

(ص ۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس شیخ بو علی قلندر نے اپنے منشی سے بادشاہ کے نام ایک فرمان لکھوایا کہ تو اس بد فطرت حاکم کو معزول کر دے وگرنہ میں تیرا ملک کسی دوسرے کے حوالے کر دوں گا۔ شیخ کے اس خط سے بادشاہ پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا اظہار علامہ نے

ان الفاظ میں کیا :

نامۂ آن بندۂ حق دستگاہ
لرزہ ہا انداخت در اندامِ شاہ
پیکرش سرمایۂ آلام گشت
زرد مثل آفتاب شام گشت
(ص ۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

لہذا اس نے فوراً حکم دیا کہ اس حاکم کو سزا دی جائے۔

اسی طرح مشہور صحابی حضرت ابن مسعودؓ جنہوں نے اپنے آپ کو عشق الٰہی اور عشق رسولؐ کے بحرِ بیکراں میں غرق کر رکھا تھا۔ اپنے بھائی کی وفات پر کس طرح مضطرب ہوئے رموزِ بے خودی میں علامہ کی زبانی اس کا بیان ملاحظہ ہو :

سوخت از مرگ برادر سینہ اش
آب گردید از گداز آئینہ اش
گریہ ہائے خویش را پایاں ندید
در غمش چون مادران شیون کشید
(ص ۶۳ اکلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک درویش دروازے پر بار بار صدائیں لگا رہا تھا مجھے غصہ آگیا اور میں نے ڈنڈے سے اس کی پٹائی کر دی۔ والد دیکھ رہے تھے سخت آزردہ ہوئے۔ ان کی آزردگی اور اپنے اندر کے احساس کو علامہ نے کس خوبصورتی سے شعروں کے پیکر میں ڈھالا ملاحظہ ہو :

از مزاج من پدر آزردہ گشت
لالہ زار چہرہ اش افسردہ گشت
بر لبش آہے جگر تابے رسید
درمیانِ سینۂ او دل تپید
کوکبے در چشم او گردید و ریخت
بر سرِ مژگاں دمے تابید و ریخت
ہمچو آن مرغے کہ در فصل خزاں
سر زد ازبادِ سحر در آشیاں

در تنم لرزید جانِ غافلم
رفت لیلائے شکیب از محملم
(ص ۱۳۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ایک رات ابرِ بہار نے رورو کر یہ بات کہی کہ زندگی مستقل گریہ وزاری کا نام ہے یہ سن کر تیز رفتار بجلی مسکرائی اور بولی کہ تو نے غلط کہا۔ زندگی تو لمحے بھر کی مسکراہٹ کا نام ہے۔ نہ جانے اس مکالمے کی اطلاع باغ میں کس نے پہنچائی کیونکہ پھول اور شبنم کے درمیان بھی اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے :

شبے زار نالید ابرِ بہار
کہ این زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برق سبک سیر و گفت
خطا کردۂ خندۂ یکدم است
ندانم بہ گلشن کہ برد این خبر
سخنہا میان گل و شبنم است
(ص ۲۶۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی پھول کھلتا ہے تو گویا مسکراتا ہے لہذا وہ اپنی اسی مسکراہٹ کو زندگی قرار دیتا ہے لیکن شبنم اس کی تردید کر رہی ہے کیونکہ وہ آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کی مانند پانی کے ایک قطرے پر مشتمل ہوتی ہے گویا سراپا گریہ ہوتی ہے لہذا وہ اپنی اسی گریہ و زاری کو زندگی قرار دیتی ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری قوتِ متخیلہ جس کا کام جنت سے پھول چُن کر لانا ہے جب کوئی نادر مضمون پیدا کرتی ہے تو میرا دل اس طرح کانپنے لگتا ہے جیسے پھول کی پتی شبنم کا قطرہ گرنے پر بُری طرح لرزنے لگتی ہے۔

خیالم کو گل از فردوس چیند
چو مضمونِ غریبے آفریند
دلم در سینہ می لرزد چو برگے
کہ بروے قطرۂ شبنم نشیند
(ص ۲۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبور عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے محبوب! تو میرے سرہانے آکر لمحہ بھر کے لئے بیٹھ اور دیکھ کہ تیرا عاشقِ صادق جو تیری محفل میں ہمیشہ تہی پیمانہ رہا یعنی تیرے دیدار سے ہمیشہ محروم رہا در دِ ہجر سے کیسے آخری سانسیں لے رہا ہے :

بہ بالینم بیا، یکدم نشیں کز درد مہجوری
تہی پیمانۂ بزمِ ترا پیمانہ لبریز است
(ص ۴۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے محبوب! تیرے بغیر میرا وجود اُس ساز کی مانند ہے جس کے تار ٹوٹ چکے ہوں جبکہ تیری موجودگی میں میرے دل سے خوشی کے ہزاروں نغمے پھوٹنے لگتے ہیں۔

بے تو جانِ من چو آن سازے کہ تارش درگسست
در حضور از سینۂ من نغمہ خیزد پے بہ پے
(ص ۴۳۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے آسمان کی جانب نگاہ کی تو مشتری ستارے کو اپنے آپ سے قریب تر پایا۔ اس ستارے کے پر ہیبت نظارے نے میرے ہوش اُڑا دیئے اور میری دنیا کو تہ وبالا کر دیا۔ میں نے اپنے سامنے تین پاکباز روحیں دیکھیں جن کے سینوں میں دنیا کو پگھلا دینے والی عشق کی آگ دھک رہی تھی اور جو لالے جیسے سرخ لباس میں ملبوس تھے۔ جن کے چہرے روزِ ازل سے عشق کی حرارت سے چمک رہے تھے اور جن کو اپنے ہی عشقیہ نغمات کی شراب نے مست بنا رکھا تھا:

من چو سوے آسماں کردم نظر
کوکبش دیدم بخود نزدیک تر
ہیبت نظارہ از ہوشم ربود
شد دگرگوں نزدو دور و دیر و زود
پیشِ خود دیدم سہ روحِ پاکباز
آتش اندر سینہ شان گیتی گداز
در برِ شان حلہ ہاے لالہ گوں
چہرہ ہا رخشندہ از سوز دروں
در تب و تابے زہنگام الست
از شرابِ نغمہ ہائے خویش مست
(ص ۷۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ حلاج، غالب اور طاہرہ جیسے عشاق کے سوز و ساز نے میرے اندر ایک نیا

ہنگامہ برپا کر دیا۔ پرانی مشکلات نے ازسرِ نو جنم لیا اور میرے فکر پر ہلہ بول دیا۔ یعنی گوناگوں عشقیہ مسائل میرے ذہن میں دوبارہ ابھر آئے جن کی بدولت میرے فکر کے دریا میں ایک طوفان برپا ہو گیا اور طوفان کی اس شدت نے میرے فکر کے اس دریا کے ساحل کو تباہ و برباد کر دیا:

سوز و سازِ عاشقانِ دردمند
شورہائے تازہ در جانم فگند
مشکلات کہنہ سر بیرون زدند
باز براندیشہ ام شبخوں زدند
قلزم فکرم سراپا اضطراب
ساحلش از زورِ طوفانے خراب

(ص ۷۰۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ نادر شاہ نے کہا کہ کابل فتح کرنے سے پہلے جب میں اپنے وطن سے دور یورپ میں زندگی بسر کر رہا تھا تو بہت پریشان تھا اور دین اور وطن کے غم میں گھلا جا رہا تھا لیکن پہاڑ اور صحرا یعنی عناصرِ فطرت میری بے چینی اور شدتِ غم سے ناآشنا تھے لہٰذا میں نے بلبل کی طرح آہ و فریاد کی اور موسم بہار کی ندی کے ٹھاٹھیں مارتے پانی کی طرح آنسوؤں کا سیلاب بہایا تاکہ میرے ہم نفس میرے درد سے آگاہ ہو سکیں۔ لیکن پھر بھی میں نے قرآن عزیز کے سوا کسی کو اپنا غمگسار نہ پایا اور آخر کار اسی کتاب کی برکت سے مجھے کامیابی نصیب ہوئی:

گفت نادر در جہاں بیچارہ بود
از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر
از غمان بیحسابم بے خبر
نالہ با بانگِ ہزار آمیختم
اشک باجوئے بہار آمیختم
غیر قرآن غمگسارِ من نبود
قوتش ہرباب را برمن کشود

(ص ۸۵۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میری اونٹنی جس پر عالمِ تخیل میں سوار ہو کر میں دیارِ محبوب ﷺ کی طرف رواں

دواں ہوں کی سیاہ آنکھیں بھی عشقِ رسولؐ میں سرشاری کے باعث نم آلود ہیں اور ان کی محبت میں وہ جس طرح صبح کے وقت آہ وزاری میں مصروف ہوتی ہے اس کی یہ حالت میرے دل کی تڑپ میں اضافے کا باعث بن رہی ہے مزید یہ کہ رسول اکرمؐ سے محبت کی جس شراب نے میری روح کو منور کر رکھا ہے اسی شراب کا رنگ اس کی آنکھوں سے بھی نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے :

نم اشک است در چشم سیاہش
دلم سوزد ز آہِ صبح گاہش
ہمان مے کو ضمیرم را بر افروخت
پیا پے ریزد از موج نگاہش

(ص ۹۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میرا چہرہ عشقِ رسولؐ میں مسلسل گریہ وزاری کے باعث سرخ ہو چکا ہے اور میری آنکھیں جو رونے کی شدت سے سُرخ ہو چکی ہیں ان سے آنسوؤں کی جگہ خون ٹپک رہا ہے میں شدتِ رنج والم کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ اے رسولؐ آپؐ میرے دل کی حالت سے بخوبی واقف ہیں اس لئے اظہار کی بھی حاجت نہیں ہے :

رخم از دردِ پنہاں زعفرانی
تراود خوں ز چشم ارغوانی
سخن اندر گلوے من گرہ بست
تو احوالِ مرا ناگفتہ دانی

(ص ۹۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی، دکتر محمد ریاض، ص ۷ ۳

۲۔دیوان امیر معزی، انتشارات کتاب فروشی اسلامیہ، تہران ۱۳۱۸ش، ص ۱۴۶

۳۔دیوان انوری بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، تہران، ۱۳۴۰، ص ۶۱۷

۴۔دیوان حکیم سنائی، بکوشش مظاہر مصفا، انتشارات امیر کبیر، تہران، س ن، ص ۲۷

۵۔خسرو شیرین، نظامی گنجوی، چاپ علی اکبر علمی، س ن، ص ۲۹۴

۶۔کلیات خاقانی، ج ۱، مطبع رفیع منشی نولکشور، س ن، ص ۸۳

۷۔دیوان عبدالواسع جبلی، ج ۱، باهتمام و تصحیح و تعلیق، ذبیح اللہ صفا، چاپ خانہء دانش تہران، ۱۳۳۹، ص ۳۲۰

۸۔کلیات سعدی، ص ۴۱۳

۹۔دیوان عراقی، موسسہ انتشارات نگاہ، تہران ۱۳۷۴، ص ۴۵

۱۰۔دیوان فرید الدین عطار، با تصحیح و مقابلہ و مقدمہ سعید نفیسی، انتشارات کتابخانہ سنائی، ۱۳۳۹، ص ۲۱۵

۱۱۔کلیات سعدی، ص ۷۸۷

۱۲۔ایضا، ص ۵۵۱

۱۳۔ایضا، ص ۶۰۰

۱۴۔ایضا، ص ۵۱۸

۱۵۔ایضا، ص ۸۰۴

۱۶۔ دیوان اشعار ابن یمین فریومدی' انتشارات کتابخانۂ سنائی' س ن' ص ۳۹۹
۱۷۔ دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی' ص ۳۰۷
۱۸۔ مثنوی معنوی' مولانا جلال الدین رومی' دفتر ا' بیت ۹۱۳
۱۹۔ دیوان سلمان ساوجی' انتشارات بنگاہ مطبوعاتی صفیعلیشاہ' ۱۳۳۶' ص ۴۵۸
۲۰۔ کلیات غزلیات خسرو' ج ا' پیکجز لیمیٹڈ' لاہور' پاکستان' ۱۹۷۲ء' ص ۱۷۳
۲۱۔ ایضاً' ج ۲' ص ۸۶۸
۲۲۔ اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی' دکتر محمد ریاض' ص
۲۳۔ دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی' ص ۳۳۲
۲۴۔ اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی' دکتر محمد ریاض' ص
۲۵۔ ایضاً' ص
۲۶۔ ایضاً' ص
۲۷۔ ایضاً' ص ۷۳
۲۸۔ اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ' رفیق خاور' بزم اقبال کلب روڈ، لاہور ۱۹۸۸ء، ص ۲۶۱
۲۹۔ اقبالیات کی مختلف جہتیں' یونس جاوید، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۵۸
۳۰۔ اقبال سہ ماہی' جولائی۔ اکتوبر' بزم اقبال لاہور' ۱۹۸۲ء ص ۱۹
۳۱۔ فلسفہ' شاعری اور اقبال' پروفیسر ظفر احمد صدیقی' دہلی یونیورسٹی' دہلی' ۱۹۷۵ء' ص ۵۳' ۵۴
۳۲۔ روح اقبال' ڈاکٹر یوسف حسین خان آئینۂ ادب' لاہور' س ن' ص ۵۳
۳۳۔ اطراف اقبال' پروفیسر حسن اختر' مکتبہ میری لائبریری لاہور' ۱۹۷۲ء' ص ۱۳۲
۳۴۔ مسائل اقبال' ڈاکٹر سیّد عبداللہ' ص ۱۳۶
۳۵۔ خطوط اقبال' مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ھاشمی' مکتبۂ خیابان ادب لاہور' ۱۹۷۷ء' ص ۱۴

۳۶۔ اطراف اقبال، پروفیسر حسن اختر، ص ۱۱۷
۳۷۔ اقبال سب کے لیے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۸۹
۳۸۔ مطالعہ اقبال مرتبہ گوھر نوشاہی، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۱ء ص ۲۰۵
۳۹۔ ذکر اقبال، عبدالمجید سالک، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۷، ۲۴۸
۴۰۔ تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں، ڈاکٹر وزیر آغا، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۳
۴۱۔ اقبال ۸۵ء، مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶۷
۴۲۔ تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مترجم سیّد نذیر نیازی، بزم اقبال لاہور ۱۹۵۹ء، ص ۲۳
۴۳۔ تنویر اقبال، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۲۰۴
۴۴۔ ایضاً، ص ۱۲۳
۴۵۔ اقبال نامہ، ج ۱، شیخ عطاالله، ص ۱۴۵
۴۶۔ اقبال کی شخصیت اور شاعری، پروفیسر حمید احمد خان، بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۴ء ص ۱۳۸
۴۷۔ تنویر اقبال، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۱۱۷
۴۸۔ اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندوی، ص ۱۸۷
۴۹۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ص ۵۲۶
۵۰۔ شعر اقبال، سید عابد علی عابد، بزم اقبال لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۳۷۶، ۳۷۷
۵۱۔ تنویر اقبال، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۱۱۸
۵۲۔ اقبال کامل، مولانا عبدالسلام ندوی، ص ۲۱۸
۵۳۔ فکرِ اقبال کی منور گوشے، مرتبہ سلیم اختر، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۷ء، ۲۲۳
۵۴۔ تنویر اقبال، ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۱۱۸

۵۵۔ شعر اقبال، سیدّ عابد علی عابد، ص ۳۹۲
۵۶۔ اقبال کے صنایع بدایع، نذیر احمد، آئینۂ ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۷ ۳
۵۷۔ دیوان عراقی، ص
۵۸۔ دیوان غالب اُردو، دار الشعور، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۷۰
۵۹۔ شعر اقبال، سیدّ عابد علی عابد، ص ۳۱۱
۶۰۔ اقبال اور پیرویٔ شبلی، سیدّ افتخار حسین شاہ، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۸۷
۶۱۔ نقوش اقبال، مولوی شمس تبریز خان ص ۶۱، ۶۲
۶۲۔ اقبال اور صوفی شعراء، ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۲۲۷
۶۳۔ مقامات اقبال، ڈاکٹر سیدّ عبداللہ، ص ۹۹

باب چہارم

سبکِ ہندی

سبکِ ہندی اور اس کی خصوصیات

ڈاکٹر حسین خطیبی فرماتے ہیں کہ :

"فارسی شاعری میں جب سبکِ عراقی (عراقی دبستان شعر) کا دور نویں صدی ہجری کے بعد ختم ہوا تو بعض وجوہ کی بنا پر فارسی شاعری کی پرانی رونق اور ساکھ جاتی رہی۔ جس کے نتیجے میں ایران کے شعراء بر صغیر میں مغلوں کے دربار کی طرف متوجہ ہوئے جو ان دنوں شاعروں، ادیبوں اور اہل علم و فضل کی بہت بڑی آماجگاہ تھا۔ وہاں آہستہ آہستہ ماحول کے اثر کے سبب ایک نیا اسلوب وجود میں آیا جس کی بنیاد ہر چند اصفہان میں رکھی گئی تھی اور جسے بعض کے مطابق سبکِ اصفہان کا نام دینا چاہئے لیکن اس کی ترقی و تکمیل بر صغیر پاک و ہند میں ہوئی اسی لئے وہ اسلوب سبک ہندی سے مشہور ہوا۔ اس اسلوب نے تھوڑی ہی مدت میں اس قدر پیش رفت کی کہ خود ایران کے شعراء نے بھی اس کی پیروی کی اور بتدریج شعر کی بنیاد اسی اسلوب پر رکھی گئی۔ (۱)

سبک ہندی بقول ڈاکٹر محمد ریاض :

در ایران.......... در حدود دو قرن و نیم رونق داشتہ است (تا اواخر قرن دوازدھم ہجری) ولی در خارج از ایران تا اواخر ربع اول قرن چھاردھم ھجری ہمیں شیوہ ادامہ داشتہ است در شبہ قارہ پاکستان و ہند بعنوان مثال، شبلی نعمانی (م ۱۹۱۳م) و اقبال باعث دگرگونی و تحول این سبک گردیدہ اند و بوسیلۂ آنان دورۂ بازگشت بہ سبک ھای عراقی و خراسانی در آنسامان عودت نمودہ است۔" (۲)

سبک ہندی، سبک عراقی و خراسانی سے جن اعتبارات سے مختلف ٹھہرا ان میں تخیل اور نکتہ آفرینی کی خصوصیت بنیادی اہمیت کی حامل قرار پائی۔ بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا :

کوشش شاعر سبک ھندی مضمون یابی و ارایہ ء خیال خاص و معنئ برجستہ است یعنی فکری جزئ اما تازہ و بگفتہ و بیان آن بہ صورتی اعجاب انگیز"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۹۷

عرفی کا ایک شعر ہے :

مشت سوزن بدلم زآن مژہ تاریختہ اند
گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہن چشم(۳)

یعنی مژگان دلدار سے مٹھی بھر سوئیاں اس لئے میرے دل میں ڈال دی گئی ہیں کہ خیاط گریہ سے کہا جائے کہ دل کے ٹکڑوں کو سی کر آنکھوں کے لئے پیراہن بنادے۔اسی طرح فغانی کا ایک شعر ہے :

ساقی مدام بادہ باندازہ می دہد
این بیخودی گناہ دل زود مست ماست(۴)

یعنی ساقی ہر شخص کو اس کے ظرف مے نوشی کے موافق شراب دیتا ہے اس خیال سے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے یعنی اب ہماری طرف جو جام شراب نہیں آتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم تھوڑی سی پی کر ہی بیخود ہو گئے ہیں اس میں ساقی کا کیا قصور ہے قصوروار تو ہمارا دل ہے جو ذرا سی عطائے شراب سے مست ہو جاتا ہے۔

مجاز کے مضامین کو حقیقت کا لبادہ اوڑھنے کی بجائے براہ راست بیان کرنے کی کوشش کی گئی اور عام انسانوں کو عشق و عاشقی میں پیش آنے والے معاملات و تجربات کو شعر میں ڈھالا گیا۔

انداز بیان کو انتہائی حد تک لطیف بنانے کی کوشش کی گئی۔عام الفاظ کو نئے نئے معانی بیان کرنے کا ذریعے بنایا گیا اور نئی ترکیب وضع کر کے فارسی زبان کے سرمائے میں اضافہ کیا گیا۔مثلاً نظیری کا ایک شعر ہے :

از کف نمی دہد دل آسا ن ربودہ را
دیدیم زورِ بازوی نا آزمودہ را(۵)

"دل آسان ربودہ" بالکل نئی ترکیب ہے۔"زوربازوی نا آزمودہ" جیسی ترکیبیں بھی اگرچہ استعمال ہوتی آئی ہیں لیکن نظیری نے انہیں بالکل نئے انداز میں پیش کیا۔اسی طرح عرفی کا ایک شعر ہے :

زلال چشمۂ امید نقد اکبر شاہ
طراز دولت جاوید شاہزادہ سلیم(۶)

اکبر کو شہزادہ سلیم سے جو محبت تھی اور اس سے جو امیدیں وابستہ تھیں ان کے پیش نظر سلیم کو "نقد اکبر شاہ" کہا ہے نقد ایک عام لفظ ہے جو سودا سلف یا بنیے کے کاروبار سے تعلق رکھتا ہے اس لفظ کو بنیے کی دکان سے اٹھا کر کہاں کا کہاں پہنچا دیا۔ کسے خیال آتا ہوگا کہ نقد اکبر شاہ کہہ کر شہنشاہ اکبر کا سرمایۂ حیات بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر سیروس شمیسا اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"روآوردن طبقات مختلف مردم بہ شعر کہ عمدۃً تحصیلات ادبی نداشتند 'باعث شد کہ

زبان کوچہ وبازار بہ شعر راہ یابد واز این رو خون تازہ یی در زبان شعر دمیدہ شد۔ از طرفی وسعت دائرہء واژگان شعر گسترش یافت واز سوی دیگر بسیاری از لغات ادبی قدیم از صحنہء شعر رخت بر بست..... شاعرانی از قبیل صائب ھم کہ در اشعار قدما تتبع بسیار داشتند باز از بہ کار بردن زبان قدیم پرہیز داشتند چون دیگر مدتی بود کہ شعر از مدرسہ بہ بازار آمدہ بود و زبان رائج مرسوم ھمان زبان مردم عصر بود و در نتیجہ عدم استفادہ از زبان شعری قدما را نباید دلیل بی فضلی برخی از شاعران بزرگ سبکِ ہندی محسوب کرد"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۹۵، ۲۹۶

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

"یک نکتہء قابل توجہ در شعر این دورہ ورودِ افکار و لغات مربوط بہ مذاھب وآداب و رسوم ھندوان است کہ ھر چند چندان چشمگیر نیست اما جا دارد بہ صورت جدی مورد مطالعہ قرار گیرد واصولاً یکی از مختصات شعر این دورہ اشارہ بہ ھند است"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۹۸

انتہائی نادر اور عمدہ تشبیہات واستعارات کا استعمال کیا گیا مثلاً طالب آملی کا ایک شعر ہے :

بی نیازانہ ز ارباب کرم می گذرم

چون سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشان گزرد (۷)

ڈاکٹر سیروس شمیسا اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"در سبک ھندی چندان بہ بدیع وبیان توجہ نمی شود البتہ تشبیہ اساس سبکِ ھندی است اما از دیگر امور بدیعی و بیانی جز بہ صورت طبیعی و تصادفی خبری نیست زیرا شعر سبک ھندی شعر مضامین اعجاب انگیز وایجاد رابطہ ھای غریب است..... از ھمہ صنایع بیشتر، تلمیح مورد توجہء شاعران این دورہ است کہ در مضمون سازی نقش فعالی دارد و می تواند از مصالح کار باشد۔ اما البتہ از تلمیحات رائج استفادہ می کنند و تلمیحات غریب نادر ندارند"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۲۹۹

ایمائی اور رمزیہ علامات سے کام لیا گیا جس سے اشعار کے مفاہیم بسا اوقات مبہم بھی ہو جاتے لیکن یہ بھی پُر لطف تھا ابو طالب کلیم کے دو شعر ہیں :

با من آویزش او صورت موج است و کنار
دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من(۸)
بہ تکلم بہ خموشی بہ اشارت بہ نگاہ
بتواں برد بہر شیوہ دل آسان از من(۹)

ان اشعار میں ایک طرف تو "حسن" اور اس کی رنگا رنگی اور گریزپائی کا ذکر ہے دوسری طرف عشق کے ساتھ حسن کا تعلق اور کشمکش اداؤں کی دلربائی کا بیان اور کیفیات قلب کا اظہار ہے۔ یہ داستانِ عشق کا ایک ضخیم باب ہے۔ لیکن کلیم نے ایمائی قوت سے کام لے کر کچھ اس طرح واردات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حُسن و عشق کی داستان کا یہ باب خود بخود پڑھنے والے کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

اشعار میں موسیقت پیدا کرنے کی غرض سے ہم آہنگ الفاظ استعمال کر کے ان میں زیر و بم کی سی کیفیت پیدا کی گئی مثلاً نظیری کی ایک غزل ہے :

ہزار شیخ و برہمن زکیش و دین برگشت
تصرف نظر ارجمند را چہ خبر(۱۰)

جو پوری کی پوری سرود و نغمہ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً درجِ بالا شعر میں "ر" کی تکرار نے موسیقی کی اس کیفیت کو تیز تر کر دیا ہے۔

اور بقول ڈاکٹر سیروس شمیسا سبک ہندی میں :

"توجہ بہ ردیف ھای دراز خوشاھنگ ابتکاری رائج است"۔

سبک شناسی شعر، دکتر سیروس شمیسا، ص ۳۰۰

اس سبک میں شاعرانہ تعلّی کا بھی بہت زیادہ مظاہرہ کیا گیا یعنی شعراء اپنے بلند مقام کا بڑے فخر و غرور سے ذکر کرتے۔ فیضی کے دو شعر ہیں :

فیضی من آن بلند نگاہم کہ روزگار
پیوستہ یافت ساعد فکرم بساق عرق
آویختند اگر ز در کعبہ نظم غیر
آویختم حدیث خوداز پیش طاق عرش(۱۱)

فیضی بہت بلند نگاہ شاعر ہے محسوس کرتا ہے کہ اس کے فکر و خیال کا ہاتھ عرش کے پائے تک پہنچا ہوا ہے۔ اگر کعبے کے دروازے پر کسی غیر کی نظم لٹکائی گئی تو فیضی اور آگے بڑھ کر اپنی نظم طاق عرش سے لٹکا دے گا فیضی کے اس شاعرانہ ادعا کو

محض خود ستائی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اظہار حقیقت بھی ہے جو شاعر علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو۔ اپنے فکر و خیال کی وسعتوں سے آگاہ ہو۔ ایوان شاہی کا ملک الشعراء ہو وہ اپنی فوقیت کا اظہار کرے تو بلاشبہ اسے زیب دیتا ہے۔ اسی طرح صائب کا ایک شعر ہے :

زصد ہزار سخنور کہ در جہان آید
یکی چو صائب شوریدہ حال برخیزد (۱۲)

وجدانی اور ذوقی باتی کو اس طرح بیان کیا جاتا کہ وہ مجسم ہو کر سامنے آجاتیں۔ مثلاً محبوب کی ہر ہر اداد لنشین ہوتی ہے لیکن اداؤں کا تعلق ذوق و وجدان سے ہے ان کا ذکر نظیری نے اس طرح کیا ہے کہ وہ گویا مجسم چیزیں ہیں اور ان سے بالارادہ فعل بھی سرزد ہوتے ہیں۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست (۱۳)

یعنی محبوب کی ہر ہر ادامیں اتنی کشش ہے کہ دامانِ دل پکڑ پکڑ کر کھینچتی ہے کہ بس یہیں کے ہو رہو۔

زبیداد تو حرف مہر را نام و نشان گم شد
کتاب حسن را جزو محبت از میان گم شد (۱۴)

کہنا یہ تھا کہ محبوب بہت ستمگر ہے اس کی بے اعتنائی کا کوئی ٹھکانہ نہیں گویا معلوم ہوتا ہے کہ مہر و محبت عنقا ہو چکی ہے۔ مہر و محبت کے عنقا ہونے کو یوں مجسم کر کے پیش کیا ہے کہ حسن ایک دلفریب کتاب ہے جس کے متعدد اجزاء ہیں۔ ایک جزو کا نام مہر و محبت تھا لیکن یہ جزو اب کتابِ حُسن سے ناپید ہو چکا ہے۔

سبک ہندی نے بقول ڈاکٹر حسین خطیبی :

> "در ایران ھم اگر کوشش شعرای بزرگ بباز گشت اسالیب قدیم و بخصوص سبک عراقی معطوف نمی شد و دنبالہء سبک ہندی بھمان صورت کہ پیشمیر فت ادامہ مییافت یقیناً آثار این انحطاط و ابتذال محسوس تر میگشت زیرا سبک ہندی ھر چند تا قرن دھم و قسمتی از قرن یازدھم آثار نسبتہ پر ارزشی بوجود آورد و شعرای صاحب طبعی بدین سبک شعر گفتند کہ آثار شان را بیتوان در شمار یک قسمت از بہترین اشعار زبان فارسی بحساب آورد لیکن میل زیاد شاعران بابداع مضامین جدید و یافتن معانی نو موجب آمد کہ بتدریج اولا دائیرہء تخیل و اغراق در شعر فارسی وسعت پیدا کند و بصورتی بسیار متکلف و خارج از حد طبیعت و بیرون از دائیرہء عقل و فہم بکشد و در نتیجہ مضامین سست و کم ارزش در شعر

فارسی راه پیدا بکند۔ ثانیا تشبیہات مبہم وکنایات واستعارات دور از ذہن ودشوار بوجود آید وشاعر برای ابراز ہنر ایراد ہر گونہ تشبیہہ واستعارہ و کنایہ ای را در شعر جایز بداند۔ ثالثاً بہمین علت حدود استعمال الفاظ وسعت یابد و شاعر در انتخاب و استعمال کلمات درست بعکس شعرای قدیم خود را مقید بہ ہیچ گونہ قید وشرطی نداند ودر ضمن کلام الفاظ عامیانہ ومبتذل را با کلمات اصیل و فصیح زبان فارسی کہ قرن ھا مورد استعمال شعرای بلند طبع خراسانی وعراقی بودہ است بیک رشتہ بکشد ودر ترکیب سازی نیز ھمین راہ سہل و سادہ را پیش بگیرد وعرصہء شعر فارسی را برای ورود اینگونہ لغات وترکیبات نادرست و سست باز بگذارد۔

این مقدمات موجب آمد کہ سبک ہندی اندک اندک درسراشیب انحطاط و ابتذال بیفتد منتہی در ایران شعرای صاحب قریحہ زود متوجہ این نقصیہ شدند وہر چند کوشش آنہا بایجاد سبک جدیدی نیانجامید لیکن این فایدہ را داشت کہ شعر فارسی را بجادہء ہموار قدیم خود باز گرداند وفرصت آن داد کہ در دورہء بعد شعرای معروف با تصرفات و ابتکاراتی سبک ھای قدیم شعر را از نو احیا کنند۔"(۱۵)



علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر سبکِ ہندی کے اثرات

۱۔ تخیل

۲۔ مضمون آفرینی

۳۔ شاعرانہ تعلّی

۴۔ تجسیم نگاری

ا۔ تخیل

تخیل زندگی کا ایک اہم جزو ہے اور فن، زندگی کی عکاسی کرتا ہے لہذا اس میں بھی تخیل کا ایک قابلِ قدر حصہ دکھائی دیتا ہے لیکن زندگی اور فن دونوں میں اس کی غیر موجودگی ان کو مقصدیت وافادیت محض کے دائرے میں محدود کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اگرچہ فن کو پیش خیزانِ حیات قرار دیا اور اُسی بات کو فن قرار دیا جو زندگی کے لئے مفید تھی لیکن چونکہ فن برائے زندگی بھی اُسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب شرائط فن پر پورا اُترے ورنہ محض تجرید اس کی کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی لہذا علامہ اقبال کے مظاہر فن کے منافی اس ادعا کے باوجود اُن کی شاعری اگر کامیابی سے ہمکنار ہے تو اس وجہ سے بھی کہ وہ تمام فنی تقاضے پورے کرتی ہے اور تخیل بھی ایک اہم فنی تقاضا ہے جو علامہ اقبال کے فکر و فلسفے میں تابانی پیدا کرتا ہے اور اس کے ہر گوشے کو ایک نئے رنگ میں آشکار کرتا ہے لیکن اس غیر حقیقی پن اور پیچیدگی کا شکار نہیں ہوتا جو سبکِ ہندی کا خاصا ہے بلکہ اعتدال میں رہتا ہے۔ تخیل کی سحر آفرینی علامہ کے یہاں جذبات وافکار کے اظہار میں بھی نمایاں ہے اور مناظر کی تصویر کشی میں بھی۔

مزید برآں اُن کے اشعار تخیل میں اس طرح رچے ہوئے ہیں کہ ان کے الفاظ وتراکیب بھی دلنشیں تصویروں اور پیکروں میں ڈھل گئے ہیں۔ مثلاً اسرارِ خودی میں بنارس کے ایک برہمن کے بارے میں کہتے ہیں :

آشیانش صورت عنقا بلند
مہر و مہ بر شعلۂ فکرش سپند
در ریاض علم و دانش دام چید
چشم دامش طائر معنی ندید
(ص ۵۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

کہ جس طرح عنقا بہت بلندی پر گھونسلا بناتا ہے اسی طرح اس برہمن کا دماغ بھی ہمیشہ بلندی پر محوِ پرواز رہتا۔ وہ اتنا اونچا اُڑتا کہ کہا جا سکتا ہے کہ سورج اور چاند اس کے غور و فکر کی آگ پر سپند بنے ہوئے تھے اس نے علم و حکمت کے باغ میں مسلسل جال بچھائے رکھا لیکن اس کے جال کی آنکھ نے حقیقت کا کوئی پرندہ نہ دیکھا یعنی کوئی پرندہ اس کے حلقۂ دام میں نہ پھنسا یا علم و دانش کی کوئی محنت اُسے مطلوب تک نہ پہنچا سکی۔

رموزِ بے خودی میں اپنے آپ کو ایک تیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ترکش میں رہوں یا ہوا میں چلوں کہیں بھی ہوں سراپا آگ رہتا ہوں۔ جب میں کمان سے نکل کر مقابل کے سینے کی طرف آتا ہوں تو سینے کی گہرائی میں خوب چھان بین کرتا ہوں۔ اگر مجھے وہاں قلب سلیم نظر نہ آئے اور ایسا قلب ملے جو خوف اور مایوسی کی آلائشوں سے لتھڑا ہوا ہو تو میں اپنی نوک سے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے موجِ خون کی کُرتی پہنا دیتا ہوں۔ اگر میں دیکھوں کہ اندر مومن کا دل ہے جس کی وجہ سے پورا

سینہ آئینے کی طرح صاف ہے اور باطن کے نور سے اس کا ظاہر بھی روشن ہے تو اسکی حرارت سے میری جان پانی پانی ہو جاتی ہے اور میری نوک شبنم کی طرح قطرے بن کر ٹپک جاتی ہے۔

در هوایم یا میان ترکشم
هر کجا باشم سراپا آتشم
از کماں آیم چو سوے سینہ من
نیک می بینم بہ توے سینہ من
گر نباشد درمیان قلبِ سلیم
فارغ از اندیشہ ھاے یاس و بیم
چاک چاک از نوکِ خود گردانمش
شمۂ از موجِ خوں پوشانمش
در صفاے او ز قلب مومن است
ظاہرش روشن زنورِ باطن است
از تف او آب گردد جانِ من
ہمچو شبنم می چکد پیکانِ من
(ص ۷ ۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیام مشرق کی ایک نظم ''تنہائی'' میں تخیل کا استعمال انتہائی خوبی سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں سمندر کے پاس گیا اور ایک بے تاب موج سے پوچھا کہ تجھ پر کیا افتاد پڑی ہے کہ تو ہر وقت مضطرب رہتی ہے تو اپنے گریبان میں ہزاروں قیمتی موتی لئے پھرتی ہے لیکن یہ تو بتا کیا تیرے سینے میں دل جیسا وہ گوہر بھی موجود ہے جو میرے سینے میں ہے یہ سُن کر وہ تڑپی اور بنا کچھ کہے ساحل سے واپس چل دی۔

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابے
ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لو لوے لا لاست در گریبانت
درونِ سینہ چومن گوہر دلے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

میں پہاڑ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ یہ کیا سادگی ہے۔ تیری کانوں تک کسی غمزدہ کی آہ وفریاد بھی پہنچتی ہے؟ اگر

تیرے پتھر جیسے سینے میں خون کے قطرے سے تشکیل پانے والا موتی یعنی دل ہے تو دو گھڑی مجھ ستم رسیدہ کی داستان غم بھی سن لے۔ یہ سن کر اُس نے اپنے آپ کو دامن میں چھپا لیا سانس روک لیا اور کچھ نہ کہا۔

بکوہ رفتم و پر سیدم این چہ بیدردی است
رسد بگوش تو آہ و فغانِ غمزدۂ؟
اگر بہ سنگِ تو لعلے ز قطرۂ خون است
یکے در آ بسخن بامن ستم زدۂ؟
بخود خزید و نفس درکشید وہیچ نگفت

میں طویل مسافت طے کر کے چاند کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا اے مسافر تیری کوئی منزل بھی ہے کہ نہیں؟ تیری پیشانی کے عکس سے دنیا چنبیلی کا باغ بن گئی ہے یعنی ساری دنیا تیری چاندنی سے منور ہو گئی ہے۔ لیکن یہ تو بتا کہ تیرے اس داغ کی آب و تاب دل کے جلووں کا نتیجہ ہے یا نہیں۔ یہ سن کر اس نے ستاروں کو رقیبانہ انداز سے دیکھا اور کچھ نہ کہا۔

رہِ دراز بریدم زماہ پُرسیدم
سفر نصیب! نصیب تو منزلے است کہ نیست؟
جہان ز پر تو سیمائے تو سمن زارے
فروغِ داغِ تو از جلوۂ دلے است کہ نیست؟
سوے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

آخر کار میں چاند اور سورج سے آگے نکل کر بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ اے خدا! تیری اس دنیا میں ایک ذرہ بھی میرا آشنا نہیں ہے۔ یہ دنیا دل جیسی نعمت سے محروم ہے اور میں سراپا دل ہوں اس لئے دنیا کا یہ باغ اگرچہ بہت دلکش ہے لیکن میری نغمہ سرائی کے قابل نہیں۔ یہ سُن کر اُس کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا اور اس نے کچھ نہ کہا۔

شدم بحضرتِ یزداں گذشتم ازمہ و مہر
کہ درجہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی زدل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل
چمن خوش است ولے درخورِ نوایم نیست
تبسمے بہ لبِ او رسید و ہیچ نگفت

(ص ۲۸۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق کی ایک اور نظم کرمک شب تاب میں بھی علامہ اقبال اپنی قوتِ تخیل کا کمال دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ

جگنو بظاہر ایک حقیر مخلوق ہے لیکن اس نے اپنے اندر سوز و گداز کا رنگ پیدا کیا اور اس سوز و گداز کی بدولت اس میں پروانوں کی خُو بُو پیدا ہو گئی یعنی اس کا وجود سراپا آتش ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس نے رات کی تاریک فضا کو منور کر دیا۔

یک ذرۂ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت
شوق این قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

یہ جگنو نہیں ہے بلکہ آفتاب کی وہ شعاع ہے جو اپنی اصل کی طرف واپس نہیں گئی اور اُس نے اپنے آپ کو سمیٹ کر اپنے جسم میں گرہ لگالی اور ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر شرر بن گئی اور چونکہ اس میں سوزِ حیات تھا۔ اس لئے اس کی زندگی منور ہو گئی اور اس میں نظر پیدا ہو گئی۔

وا ماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد
از سوزِ حیات است کہ کاوش ہمہ زر شُد
دارے نظر شُد

یا جگنو ایک ایسا بے تاب پروانہ ہے جو شمع کی تلاش میں ہر طرف سرگرداں تھا لیکن جیسے ہی اُس نے اسے پالیا اُس پر اس انداز سے نثار ہوا کہ خود شمع بن گیا یعنی جلنے لگا اور اس نے اپنے اور شمع کے درمیان مغائرت کے پردوں کو اسطرح ہٹا دیا کہ اس میں اور اس کے محبوب میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد
بر شمع چنان سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترکِ من و تو کرد

یا جگنو ایک ایسا ستارہ ہے جس کی گھات میں چاند ہے اور وہ زمین کے دیدار کے شوق میں عرشِ بریں سے اُتر کر زمین کے قریب تر آگیا ہے۔

یا اخترکے ماہ بمینے بکمینے
نزدیک تر آمد بتماشائے زمینے
از چرخِ برینے

یا جگنو وہ کم روشنی والا چاند ہے جو ایک ہی دفعہ اپنا جلوہ دکھا کر ختم ہو جاتا ہے ایسا چاند جو سورج کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتا اور کسی خاص مقام کا پابند نہیں ہے۔

یا ماہِ تنک ضو کہ بیک جلوہ تمام است

ماہے کہ بر و منت خورشید حرام است

آزاد مقام است

اے جگنو تیرا جسم سراپا نور ہے اور تیری پرواز میں یہ خصوصیت ہے کہ کبھی تیری روشنی پروں میں چھپ جاتی ہے اور کبھی ظاہر ہو جاتی ہے بالفاظ دگر کبھی تو غائب ہوتا ہے اور کبھی حاضر ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ظہور یعنی زندگی کا یہی قانون ہے۔

اے کرمک شب تاب سراپاے تو نور است

پروازِ تو یک سلسلۂ غیب و حضور است

آئین ظہور است

تو اندھیری راتوں میں رات کے پرندوں کے لئے مشعل کا کام دیتا ہے تیرے اندر کیسا سوز و گداز ہے کہ تو تواتر کے ساتھ اپنی چمک دمک دکھاتا ہے اور کسی کی جستجو میں مصروف رہتا ہے۔

در تیرہ شباں مشعل مرغانِ شب استی

آن سوز چہ سوز است کہ در تاب و تب استی

گرم طلب استی

اے جگنو ہم بھی تیری طرح خاک سے پیدا ہوئے ہیں اور تیری ہی طرح مصروف جستجو ہیں ہم میں سے جس نے محبوب کی ایک جھلک دیکھ لی ہے وہ بھی تڑپ رہا ہے اور جس نے نہیں دیکھی وہ بھی تڑپ رہا ہے اور ہم تگ و دو کے باوجود ابھی تک منزلِ مقصود سے دور ہیں۔

مائیم کہ مانندِ تو از خاک دمیدیم

دیدیم تپیدیم، ندیدیم تپیدیم

جائے نرسیدیم

اے جگنو میں تجھ سے ایسی بات کہتا ہوں جو بڑے پتے کی ہے اور میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور یہ بہت بلیغ اور وسیع المعانی ہے اور کچھ یوں ہے کہ منزل گم گشتہ کا ذکر مت کر یعنی گذشتہ ناکامیوں پر کفِ افسوس مت مل بلکہ حصول مقصد کے لئے جدوجہد کر اور جو تب و تاب یعنی روشنی تیرے پاس ہے اس کو غنیمت جان اور اس کی حفاظت کر کیونکہ اگر یہ روشنی ضائع ہو گئی تو تیری زندگی ختم ہو جائے گی۔

گویم سخن پختہ و پروردہ و تہ دار

از منزل گم گشتہ مگو پاے برہ دار

این جلوہ نگہ دار

(ص ۷۸۔۷۷، ۷۷۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم کے ایک شعر میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میرے فکر و فن میں حُسن و لطافت بھی ہے، سوز و گداز بھی اور کیف و مستی بھی۔ لیکن ان کا تخیل ہر کیف کے اظہار کے لئے ایک ایسی دنیائے رنگ و بو آباد کر لیتا ہے جو اس کی دلکشی میں مزید وسعت پیدا کر دیتی ہے۔

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟

یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

(ص ۴۳۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم کے ایک اور شعر میں تخیل کو انتہائی خوبی سے استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قدیم راہنماؤں کے فہم و فراست کی کشتی سمندری طوفان کی شدت کے باعث ٹوٹ چکی ہے مراد یہ کہ وہ انتہائی ناسازگار حالات میں مسلمانوں کی صحیح سمت میں رہنمائی نہیں کر سکے اور ان کے نجات دھندہ ثابت نہیں ہو سکے جبکہ میرا دعویٰ ہے کہ میرے افکار کی کشتی انہیں ساحل تک پہنچا کر رہے گی پس خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے میرے افکار کو رہنما بنایا۔

شکست کشتیٔ ادراکِ مرشدانِ کہن

خوشا کسے کہ بدریا سفینہ ساخت مرا

(ص ۵۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں سلطان مظفر گجراتی کے گھوڑے کی تعریف میں تخیل کی دلکشی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ وہ پہاڑوں اور دریاؤں کو ہوا کی سی تیزی سے عبور کرتا۔ دورانِ جنگ نگاہ سے بھی زیادہ سُرعت سے حملہ آور ہونے کے لئے تیار رہتا اور پہاڑ اس کی طاقت سے خائف ہو کر طوفان کی مانند اُڑنے لگتے۔ اس کی دوڑ قیامت کے فتنوں کو اپنے پہلو میں سمیٹے ہوتی اور وہ پتھروں کو اپنے سموں کی ضرب سے ریزہ ریزہ کر دیتا۔

من چہ گویم وصف آن خیر الجیاد

کوہ و روے آبہا رفتے چو باد

روز ہیجا از نظر آمادہ تر

تند بادے طائف کوہ و کمر

در تگِ او فتنہ ھاے رستخیز

سنگ از ضربِ سُمِ او ریز ریز

(ص ۷۹۲، ۷۹۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ خدا کی زبان سے یوں گویا ہوتے ہیں کہ انسان جسے میں عنقریب تخلیق کرنے والا ہوں اپنی عقل کی بدولت اس کائنات کو مسخر کرلے گا اور عشق کی بدولت لامکان کو بھی اپنے تصرف میں لے آئے گا اس کی عقل کسی رہنما کے بغیر بھی اپنے راستے سے آشنا ہوگی اور اس کی نگاہ جبریل کی نگاہ سے بھی زیادہ تیز ہوگی۔ خاکی نژاد ہونے کے باوجود وہ فرشتوں کی طرح محو پرواز ہوگا اور آسمان اس کی راہ میں ایک پرانی سرائے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہوگا مزید یہ کہ وہ آسمان کے جسم میں اپنے کارھائے نمایاں کی بدولت ریشمی کپڑے میں اترنے والی سوئی کی نوک کی طرح چبھے گا۔

عقلِ آدم بر جہان شبخوں زند
عشقِ او بر لامکاں شبخوں زند
راہ داں اندیشۂ اوبے دلیل
چشمِ او بیدار تراز جبرئیل
خاک و در پرواز مانندِ ملک
یک رباط کہنہ در راہش فلک
می خلد اندر وجودِ آسماں
مثل نوکِ سوزن اندر پرنیاں

(ص ۶۰۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی مسافر میں ایک جگہ فطرت کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے کل کائنات میں برپا ہونے والے ہنگاموں کی روح یعنی فطرت بے تاب کو دیکھا جو کائنات کی اچھائیوں، برائیوں اور بھیدوں سے آگاہ تھی اور عناصرِ کائنات سے برسرِ پیکار تھی اس پیکار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس نے پانی اور مٹی کو تو یکجا کیا لیکن خود آشفتگی کا شکار ہوگئی۔ میں نے پوچھا تو کس کی تلاش میں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ حکمِ خدا میں نیا آدم پیدا کرنا چاہتی ہوں چنانچہ اُس نے مشتِ خاک سے نیا آدم بنایا اور اسے گلِ لالہ کا آب ورنگ عطا کیا یعنی اس کے دل میں جذبۂ عشق ودیعت کیا، اس کے ضمیر میں توحید الٰہی کا عقیدہ مستحکم کیا اور اس سے کہا کہ اب تو اس دنیا میں ایسی نئی بہار لائے گا جو سابقہ بہاروں سے زیادہ رنگین ہوگی یعنی ایسا انقلاب برپا کر سکے گا جو گذشتہ انقلاب سے زیادہ کامیاب ہوگا۔ لیکن یاد رکھ دشمنانِ دین اس کوشش میں ہیں کہ تو اس بہار یعنی انقلاب کے ثمرات سے بہرہ یاب نہ ہو (اس لئے اُن کی کوششوں کو خاک میں ملادے)

دوش دیدم فطرت بے تاب را
روح آن ہنگامہ اسباب را

چشمِ او برزشت و خوبِ کائنات
در نگاہِ او غیوبِ کائنات
دستِ او با آب و خاک اندر ستیز
آن بہم پیوستہ و این ریز ریز
گفتمش در جستجوے کیستی ؟
در تلاش تار و پوے کیستی ؟
گفت از حکمِ خداے ذوالمنن
آدمے نو سازم از خاکِ کہن
مُشتِ خاکے را بصد رنگ آزمود
پے بہ پے تابید و سنجید و فزود
آخر او را آب و رنگ لالہ داد
لالہ اندر ضمیرِ او نہاد
باش تا بینی بہار دیگرے
از بہار پاستاں رنگین ترے
ہر زمان تدبیر ھا دارد رقیب
تانگیری از بہارِ خود نصیب
(ص ۸۶۶،۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس مقام سے حضورؐ کی رفعت کا آغاز ہوتا ہے اس مقام پر پہنچ کر سالک کی روحانی ترقی کا اختتام ہو جاتا ہے لیکن اس مضمون کو تخیل کی مدد سے کس خوبصورتی سے ادا کرتے ہیں کہ جب میں حضور انورؐ کے روضہ مقدسہ کے سامنے پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ ساری کائنات مجھ میں سما گئی ہے اور میں زمان و مکان کی قید سے بالا تر ہو گیا ہوں۔ جب میں اس مقام سے آگے بڑھا تو پرواز ختم ہو گئی۔

جہانِ چار سو اندر برِ من
ہوائے لامکاں اندر سرِ من
چو بگذشتم ازین بامِ بلندے
چو گرد اُفتاد پرواز از پرِ من

(ص ۹۱۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ عاشق کی بیچارگی اور حضور اکرمؐ سے اپنے جذبۂ عشق کی شدت در طولِ شب فراق کا بیان مقصود ہے لیکن اُسے تخیل کی مدد سے کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ مجھے کسی سے اپنا دردِ دل کہنے کی ضرورت نہیں ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ راستہ دشوار گزار ہے اور یہ راہی یعنی شاعر جو نحیف و ناتواں ہے اس کا اشتیاق آستاں بوسی حد سے فزوں ہے۔ مزید بر آں اسکا چراغ بجھ چکا ہے اور رات کا وقت ہے پھر اُس کا یہ سفر کیونکر طے ہو۔

غمِ پنہاں کہ بے گفتن عیاں است
چو آید بر زباں یک داستاں است
رہے پر پیچ و راہی خستہ و زار
چراغش مردہ و شب درمیان است
(ص ۹۱۰ کلیات اقبال فارسی)

☆☆☆

۲۔ مضمون آفرینی

علامہ اقبال کی شاعری میں مضمون آفرینی بکثرت نظر آتی ہے لیکن تخیل کی طرح اس میں بھی وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے مثلاً اسرارِ خودی کے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ آج کل کے پیر اپنے بال سفید ہو جانے کے باعث پیر کہلاتے ہیں اور اُن کی حالت یہ ہے کہ گلی کوچوں کے لونڈے اُن کا مذاق اُڑاتے پھرتے ہیں۔

پیرہا پیراز بیاض موشدند

سخرہ بہرِ کودکانِ کو شدند

(ص ۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

بال اگرچہ بڑھاپے میں ہی سفید ہوتے ہیں یعنی جب انسان کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں تو بالوں کی کیا بساط کہ ان کی توانائی بحال رہے اور وہ سیاہ دکھائی دیں گویا سفید بال بڑھاپے کی ہی علامت ہیں لیکن علامہ اقبال نے اس شعر میں یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ چونکہ بقول سعدی :

بزرگی بعقل است نہ بسال(۱۶)

لہذا اگر انسان محض سفید بالوں کی بدولت بوڑھوں میں شمار ہونے لگے اور عقل یا تجربہ نام کی کوئی شے اس کے پاس موجود نہ ہو جس کی موجودگی میں وہ صحیح معنوں میں نہ بزرگی کا حامل قرار پائے تو گلی کوچوں کے لونڈے اُس کا مذاق ہی اُڑائیں گے۔

اسرارِ خودی کے ایک اور شعر میں فرماتے ہیں کہ پھول کی پنکھڑیاں اس طرح بکھر گئیں جس طرح اس کی خوشبو بکھرتی ہے اے اپنی ذات سے بھاگے ہوئے پھر اپنی طرف لوٹ آ۔

شد پریشاں برگِ گل چون بوے خویش

اے زخود رم کردہ باز آسوے خویش

(ص ۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

کلی کھل کر پھول ہی بنتی ہے یعنی اس کی ایک ایک پنکھڑی وا ہو کر پھول کی شکل اختیار کرتی ہے اور اپنی خوشبو ہوا میں بکھیرتی ہے۔ گویا خوشبو کی حیثیت جداگانہ نہیں بلکہ وہ پھول کا اٹوٹ انگ ہوتی ہے جبکہ علامہ اقبال نے کلی کے کھل کر پھول بننے کو اس کی خوشبو سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح خوشبو ہوا میں بکھیرتی ہے اُسی طرح کلی کھل کر پھول بنتی ہے۔

مزید یہ کہ علامہ اقبال کلی کو اپنی ذات میں مجتمع قرار دیتے ہیں جبکہ اس کی ایک ایک پتی کے الگ ہو کر اُس کو ایک پھول کی شکل عطا کرنے کو اپنی ذات سے فرار تصور کرتے ہیں اور بکھری ہوئی شخصیت کے مالک مسلمان کو بھی اُسی کی مثال دیتے ہوئے نصیحت کرتے ہیں کہ تو اپنی ذات کو دوبارہ مجتمع کر لے۔

رموزِ بے خودی کے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ دین کے سلطان یعنی رسولؐ اللہ کی ایک نوازش ملاحظہ ہو کہ ان کی بدولت تمام روے زمین ہماری سجدہ گاہ بن گئی۔

تا ز بخششہاے آن سلطانِ دین
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمین
(ص ۱۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ایک روایت کے مطابق رسولؐ نے اپنی بعض خصوصیات بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ میرے لئے روئے زمین مسجد بن گئی مقصد بظاہر یہ تھا کہ باقی مذاہب کی عبادت صرف اُن مقامات میں ہو سکتی ہے جو خاص اس غرض سے تعمیر کئے گئے ہوں لیکن مسلمان کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں جہاں بھی نماز کا وقت آجائے وہ بے تکلف ادا کر سکتا ہے۔

اقبال نے اس حدیث نبویؐ سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ روے زمین کو سجدہ گاہ قرار دینے سے ملکی انتسابات ختم ہو گئے۔ گویا انہوں نے اُسے بھی اپنے اصل مقصد یعنی ملت کی آفاقیت کا ثبوت بنادیا۔

رموِ بے خودی کے ایک اور شعر میں فرماتے ہیں کہ اس کے یعنی شہنشاہ عالمگیر کے دل میں ہرگز خوف پیدا نہ ہوا اور اُس نے ایک لمحے میں جنگل کے شیر کو قالین کا شیر بنادیا۔

دل نخود راہے نداد اندیشہ را
شیرِ قالیں کرد شیرِ بیشہ را
(ص ۹۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

شیر قالین اُس شیر کو کہا جاتا ہے جس کی تصویر قالین پر بنی ہوتی ہے اور وہ حقیقی شیر نہیں ہوتا۔ لہذا یہاں مضمون یہ پیدا کیا گیا ہے کہ عالمگیر نے جنگل کے شیر کی وہ تمام خصوصیات ختم کردیں جو اسے "شیرِ قالین" سے ممتاز کررہی تھیں اور دوسرا مضمون یہ پیدا کیا ہے کہ ایک ہی وار میں اُسے بے جان کر کے زمین پر گرادیا اور زمین پر گرے ہوئے شیر کی کیفیت بھی وہی ہوتی ہے جو شیرِ قالین کی ہوتی ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا وجود میں کس قدر لذت پنہاں ہے کہ ہر ذرے کے دل میں ظاہر ہونے کا ولولہ پایا جاتا ہے جب کلی شاخ سے پھوٹتی ہے تو اپنے وجود کے شوق میں کھل اٹھتی ہے یعنی تبسم ریز ہو جاتی ہے اور اس کا یہ تبسم دراصل اُس مسرت کا اظہار ہوتا ہے جو اُسے وجود میں آنے کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

چہ لذت یا رب اندر ہست و بود است
دل ہر ذرہ در جوشِ نمود است
شکافد شاخ را چون غنچہ گل

تبسم ریز از ذوقِ وجود است

(ص ۲۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

شعراء پھول کے کھلنے کو تبسم سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اقبال نے تبسم سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ کلی ذوقِ وجود کی بناء پر متبسم ہو جاتی ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے انسان تو نے پتھر کے ایک ٹکڑے پر نگاہ ڈالی ہوتی تو وہ بھی تیری آرزو کے فیض سے قیمتی موتی کی حیثیت اختیار کر جاتا لہذا اے دولت کے غلام تو اپنے آپ کو سونے سے مت تول کیونکہ سونا تیری نگاہوں کے التفات کی وجہ سے قیمتی ہو گیا۔

اگر کردی نگہ بر پارۂ سنگ

زفیضِ آرزوے تو گہر شُد

بزر خود را مسنج اے بندۂ زر

کہ زر از گوشۂ چشم تو زر شد

(ص ۲۱۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یوں تو اشیائے کائنات کی قدر و قیمت ان کے اوصاف کی بدولت متعین ہوتی ہے لیکن علامہ اقبال نے ان کے قیمتی ہونے کی ایک اور دلفریب توجیہہ پیش کی ہے کہ یہ سب انسان کی نگاہِ التفات کا نتیجہ ہے یعنی جسے وہ قیمتی قرار دے وہ قیمتی ہو جاتی ہے مثلاً الماس، زمرد، لعل، یاقوت، نیلم وغیرہ محض پارہ ھائے سنگ ہیں۔ چونکہ انسان ان کے حصول کی آرزو کرتا ہے اس لئے اس آرزو کی بدولت یہ پتھر جواہرات بن جاتے ہیں اور بازار میں بڑی بڑی قیمتوں میں فروخت ہوتے ہیں۔ یہی صورتحال سونے کی ہے۔ اگر انسان ان کی آرزو اپنے دل سے نکال دے تو یہی جواہرات بے قیمت ہو جائیں گے بالفاظ دگر یہ جواہرات بذات خود کچھ نہیں ہیں انسان کی نگاہ نے ان کو جواہرات بنا دیا ہے۔

زبورِ عجم کے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ جبرئیل یعنی فرشتہ انسان کے ارفع مقام و مرتبے کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بلند مرتبہ کی شہرت اس لئے ہے کہ وہ عرش آشیاں ہے۔

باوجِ مشتِ غبارے کجا رسد جبرئیل

بلند نامیٔ او از بلندیٔ بامِ است

(ص ۴۵۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

فرشتے اپنی عبادت گزاری کی وجہ سے خدا کے حضور انسان سے برتر تصور کئے جاتے ہیں لیکن علامہ اقبال نے اس شعر میں نہ صرف انسان کو فرشتوں کے مقابلے میں اشرف المخلوقات ہونے کے ساتھ ساتھ جذبہ عشق کا حامل ہونے کے ناتے

برتر قرار دیا ہے بلکہ فرشتے کے بلند رتبے کو اس کی عبادت کا نتیجہ قرار دینے کی بجائے اس کی عرش آشیانی کا نتیجہ قرار دیا ہے جو ایک نادر مضمون ہے۔

زبورِ عجم کے ایک اور شعر میں فرماتے ہیں کہ صبح سویرے اٹھ کر کی جانے والی گریہ وزاری اور آہ و فریاد انسانی سوچ سے بھی زیادہ بلندی پر پہنچتی ہے لہذا اس کے توسط سے میں نے نیلے آسمان کے اس گنبد سے جس کا کوئی دروازہ نہیں باہر نکلنے کا یعنی خدا تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔

برونِ زیں گنبدِ دربستہ پیدا کردہ ام راہے
کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحر گاہے
(ص ۴۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

خدا تک رسائی کے لئے اگرچہ کسی ذریعے یا واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ خدا تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے لیکن یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ آہِ سحر گاہ زود رس ہوتی ہے جبکہ علامہ نے اسے اس علت کے تحت آسمان سے باہر نکلنے اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ اس کی اُڑان انسانی فکر سے اونچی ہوتی ہے جو ایک نادر مضمون ہے۔ دراصل عقل کے مقابلے میں عشق کے ذریعے ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کر دینا علامہ اقبال کا ایک محبوب موضوع ہے جسے انہوں نے آہِ سحر گاہی کے حوالے سے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

جاوید نامہ کے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ اے روشن فطرت انسان کافری موت ہے کیونکہ یہ حق کی عدم معرفت کا دوسرا نام ہے۔ اگر کافر حق سے آگاہ ہو جاتا تو وہ حق کا رنگ اپنے اندر پیدا کر لیتا اور زندہ ہو جاتا چونکہ وہ حق سے ناواقف ہے اس لئے حق اور رنگِ حق دونوں سے دور ہے اور حق زندگی ہے اس لئے وہ زندگی سے دور ہے یعنی مُردہ ہے لہذا غازی یعنی مومن کے لئے ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ مُردے سے جہاد کرے کیونکہ مومن تو زندہ شخص سے جہاد کرنا پسند کرتا ہے اور مردِ مومن زندہ ہے اس لئے وہ اپنے آپ سے جنگ کرتا ہے یعنی جہادِ نفس کرتا ہے اور اپنے نفس امّارہ پر اسطرح حملہ آور ہوتا ہے جس طرح چیتا ہرن پر۔

کافری مرگ است اے روشن نہاد
کے سزد با مُردہ غازی را جہاد
مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ
بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ
(ص ۷۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

اسلام میں کفر کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے جس کی نفی ناممکن ہے لیکن علامہ اقبال نے اس قسم کے جہاد کو ایک نیا

مفہوم دے کر بڑے دلچسپ انداز میں اس کی نفی کی ہے کہ کافری در حقیقت موت کا دوسرا نام ہے کیونکہ کافر حق سے ناواقف ہے اور حق زندگی ہے لہذا وہ زندگی سے دور ہے یعنی مُردہ ہے اور مومن کسی مردے کے خلاف جہاد نہیں کرتا بلکہ زندہ شخص سے جہاد کرتا ہے اور علامہ اقبال کے نزدیک زندہ وہ ہے جو حق شناس ہے اور مومن چونکہ حق شناس ہے لہذ اُسے اپنے آپ سے جہاد کرنا زیب دیتا ہے کیونکہ یہی جہاد اس کو نیابت کے مرتبے پر فائز کر سکتا ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے مسلمان تو خود کو تلاش کر کیونکہ تو اپنی ذات سے چھپا بیٹھا ہے یعنی تیری صلاحیتیں تجھ ہی سے پوشیدہ ہیں اور اسلام میں اس قسم کے حجاب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اے زخود پوشیدہ خود را بازیاب
در مسلمانی حرام است این حجاب
(ص ۸۵۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے اس شعر میں حجاب کو ایک نیا مفہوم دے کر اس کی نفی کی ہے اور اُسے حرام قرار دیا ہے۔ حالانکہ اسلام نے حجاب کا حکم دیا ہے لیکن وہ حجاب جسم کا ہے جبکہ علامہ اقبال نے روح کے حجاب کی بات کی ہے اور اپنی روح یعنی اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہونا، اُن کو آشکار کرنا، اُن میں نکھار پیدا کرنا اور انہیں دوسروں کے لئے مفید بنانا بے حد ضروری ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے خدا! میرا طرز زندگی عام لوگوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ میرا دل مسائل کائنات کے حل کے لئے کوشاں ہے اور اپنی نگاہیں چاند اور ستاروں سے بھی آگے مرکوز کئے ہوئے ہے لہذا اگر اس کے نصیب میں دوزخ بھی لکھی ہے تو وہاں بھی اسے تنہائی عطا کرنا کیونکہ یہ کافر دنیا میں بھی اپنے ہم نفسوں سے نالاں ہو کر تنہائی پسند رہا ہے۔

دلِ من درکشادِ چون و چند است
نگاہش از مہ و پرویں بلند است
بدہ ویرانۂ در دوزخ او را
کہ این کافر بے خلوت پسند است
(ص ۸۸۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں جو معنوی خوبی مضمر ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو دوزخ کی رعایت سے دل کو کافر کہا گیا ہے دوسرا جس چیز کو بہت عزیز یا محترم سمجھا جاتا ہے اُس کو بھی کافر کہہ دیا جاتا ہے مثلاً :

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے (۱۷)

تیسرا یہ کہ کافر نے تو بہر حال دوزخ میں ہی جانا ہے لیکن علامہ اقبال اپنے دل کو کافر قرار دیتے ہوئے خدا سے بالا صرار اُسے جہنم میں بھیجنے کی درخواست کرتے ہیں گویا وہ ان کے خیال میں جنت میں بھی بھیجا سکتا ہے۔ چوتھا یہ کہ وہ کام جو قوم کے لئے نا قابلِ قبول ہو خواہ وہ فردِ واحد کی نگاہ میں درست ہی کیوں نہ ہو وہ کافری کے دائرے میں آتا ہے۔ اسی لئے علامہ اپنی خلوت پسندی کو کافری کا درجہ دیتے ہیں۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میرا علائقِ دنیوی سے آزاد دل اس اضطراب کا شکار ہے کہ میرا انجام کیا ہو گا۔ مجھے جہنم رسید کیا جائے گا یا بہشت عطا کی جائے گی کیونکہ میں مخلوقِ خدا کو تکلیف نہیں پہنچاتا حتیٰ کہ ابلیس کی بھی دل آزاری نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کبھی گناہ کر لیتا ہوں کیونکہ اگر میں بالکل گناہ نہ کروں تو اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہو گی جس کا لازمی نتیجہ رنج ہے لہذا اسے خوش کرنے کے لئے گناہ بھی کر لیتا ہوں۔ اب چونکہ میری نیت بخیر ہے اور اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اس لئے جو گناہ میں کسی کو خوش کرنے کے لئے کروں وہ گناہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔

دل بے قیدِ من در پیچ و تا بیست
نصیبِ من عتابے یا خطا بیست
دلِ ابلیس ہم نتوانم آزرد
گناہِ گاہ گاہے من ثوابیست

(ص ۸۸۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یہاں جو معنوی خوبی مضمر ہے وہ یہ ہے کہ گناہ کرنا بہر حال غلط ہے جس کا بدلہ سزا ہے جزا نہیں لیکن علامہ اقبال نے اسے قابلِ جزا قرار دیا ہے کیونکہ وہ ابلیس کو خوش کرنے کے لئے سرزد ہوا ہے اور کسی کو خوش کرنا نیکی کے زمرے میں آتا ہے برائی کے زمرے میں نہیں۔



۳۔ شاعرانہ تعلّٰی

ڈاکٹر محمد ریاض کے بقول :

"تعلیاں (اگرچہ)........... سبک (ہندی) کا عنصر نہیں ہیں (بلکہ) ہر سبک کے شعراء نے تعلیاں کی ہیں" (۱۸)

اور ڈاکٹر محمد ریاض کا یہ کہنا کسی حد تک بجا ہے لیکن سبکِ ہندی میں اس کا مظاہرہ مقابلتاً زیادہ کیا گیا اسی لئے یہ اس سبک کا ایک نمایاں وصف کہلایا۔ علامہ اقبال کے یہاں شاعرانہ تعلیٰ تو نہیں لیکن اس کے برعکس شاعرانہ تفاخر کا احساس خراسانی، عراقی اور ہندی سبک کے تمام شعراء کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے مثلاً :

اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ذره ام مهرِ منیر آنِ من است
صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تراز جامِ جم است
محرم از نازادهاے عالم است
فکرم آن آهو سرِ فتراق بست
کو هنوز از نیستی بیرون نجست
سبزه ناروئیده زیبِ گلشنم
گل بشاخ اندر نهاں در دامنم
محفل رامش گری برهم زدم
زخمه بر تارِ رگِ عالم زدم
بسکه عُود فطرتم نادر نواست
هم نشین از نغمه ام نا آشناست
در جهاں خورشید نوزائیده ام
رسم و آئین فلک نا دیده ام

(ص ۶ کلیات اقبال فارسی)

یعنی اگرچہ میں ذرہ ہوں لیکن زمانے کو روشن کرنے والا سورج میری ملکیت ہے اور سینکڑوں صبحیں میرے گریباں سے پھوٹ سکتی ہیں۔ میری خاک جامِ جمشید سے بھی زیادہ روشن ہے اس لئے کہ جمشید تو جام میں دنیا کے صرف عصری حالات

دیکھتا تھالیکن میری خاک اُن حالات سے بھی آگاہ ہے جو ابھی تک عالمِ ظہور میں نہیں آئے۔ میری فکر نے حقیقتوں کا وہ ہرن اپنے شکاربند سے باندھ لیا ہے جس نے ابھی تک عدم سے باہر قدم نہیں رکھا۔ یعنی میں شعر میں وہ حقائق پیش کرنے والا ہوں جو پہلے کسی شاعر کو نصیب نہ ہوئے جو سبزہ ابھی تک اگا نہیں وہ میرے باغ کے لئے زیب وزینت کا سامان بنا ہوا ہے جو پھول ابھی تک شاخ کے اندر چھپا ہوا ہے وہ میرے دامن میں پہنچ گیا ہے۔ شاعر بالعموم نغمہ وسرود اور راگ رنگ کی محفل آراستہ کرتے تھے میں ایسی محفل کو درہم برہم کر رہا ہوں اور ساز کے تاروں کی بجائے رگِ کائنات کے تار چھیڑ رہا ہوں۔ دوسرے شاعر صرف وقتی عیش ونشاط کا سامان بہم پہنچاتے تھے میں زندگی کے حقائق سے پردہ اٹھا رہا ہوں میری فطرت کے ساز سے نادر نغمے بلند ہو رہے ہیں۔ میرے رفیق ان سے بالکل ناآشنا ہیں۔ میں آفاق میں ایک نیا سورج پیدا ہوا ہوں۔ پرانے سورج کے برعکس مجھے آسمان کے رسم وآئین کا ابھی تجربہ نہیں ہوا ہے۔

اسرارخودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

عصر من دانندۂ اسرار نیست
یوسفِ من بہر این بازار نیست
ناامیداستم زیارانِ قدیم
طورِ من سوزد کہ می آید کلیم
قلزم یاراں چو شبنم بے خروش
شبنم من مثلِ یم طوفان بدوش
نغمۂ من از جہان دیگر است
این جرس را کاروانِ دیگر است

(ص ۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میرا زمانہ رازوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتالہذا میرا یوسف اس بازار میں صحیح قیمت نہیں پاسکتا۔ میں پرانے دوستوں کی رفاقت سے نااُمید ہوں۔ میرے طور پر آگ روشن ہے شاید اس کے لئے بھی کوئی کلیم آپہنچے۔ میرے قدیم رفیق جو سمندر لئے بیٹھے ہیں شبنم کی طرح جوش وخروش سے عاری ہیں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ میری شبنم بھی سمندر کی طرح طوفان آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ میرا نغمہ ایک نئی دنیا کی خوش خبری سناتا ہے۔ یہ جرس ایک نئے قافلے کا طلبگار ہے۔

رموزِ بےخودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ہم نوا از جلوۂ اغیار گفت
داستانِ گیسو و رخسار گفت

بر در ساقی جبین فرسود او
قصۂ مغ زادگان پیمود او
از ستایش گستری بالا ترم
پیش ہر دیواں فرو ناید سرم
از سخن آئینہ سازم کردہ اند
وز سکندر بے نیازم کردہ اند
(ص ۸۲، ۸۳ کلیات اقبال فارسی)

یعنی میرے ہم نواؤں نے غیروں کی جلوہ افروزیوں کے افسانے سنائے اور گیسوور خسار کی داستانیں بیان کیں۔ انہوں نے ساقی کے دروازے پر اپنی پیشانیاں گھسائیں اور مغ زادوں کے قصے کہے لیکن میں کسی کی مدح و ستائش نہیں کر سکتا نہ ہی میرا سر ہر بادشاہ کے سامنے جھکتا ہے کیونکہ قضاو قدر نے مجھے شعر و سخن کا آئینہ ساز بنایا ہے اور سکندر سے بے نیاز کر دیا ہے۔ مراد یہ کہ سکندر نے تو ایسا آئینہ تیار کروایا تھا جس میں وہ زمانے بھر کے حالات وواقعات کا مشاہدہ کرتا تھا لیکن میں اس شاعری کی آئینہ سازی کر رہا ہوں جو قبل ازیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ کیونکہ اس میں اُمتِ مسلمہ کا ماضی ہی نہیں حال اور مستقبل بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

مرا از پردۂ ساز آگہی نیست
ولے دانم نوائے زندگی چیست
سرودم آنچناں در شاخساراں
گُل از مرغِ چمن پُرسد کہ این کیست
(ص ۲۴۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں موسیقی کے سُر تال یا آہنگ سے آشنا نہیں ہوں لیکن زندگی کے نغمے سے آگاہ ہوں مراد یہ کہ میں فنِ شعر گوئی سے واقف نہیں ہوں لیکن جانتا ہوں کہ زندہ شاعری کیا ہوتی ہے اسی لئے جب میں نے پرندوں کی طرح درختوں کی شاخوں میں زندگی بھرے نغمات الاپے تو پھول یعنی لوگ باغ کے پرندوں یعنی میرے ہم عصر شعراء سے پوچھنے لگے کہ یہ کون نغمہ سرائی میں مصروف ہے یعنی یہ کون ہے جس کی شاعری دوسرے شعراء کے مقابلے میں زندگی کے پیغام کی حامل ہے۔

پیام مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

بساطم خالی از مرغ کباب است

نہ در جامم مئے آئینہ تاب است

غزال من خورد برگِ گیاہے

ولے خونِ دل او مُشکِ ناب است

(ص ۳۲۴۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی نہ تو میرے دستر خوان پر مرغِ مسلم چنا جاتا ہے اور نہ کھانے کے بعد شغل میناو جام ہوتا ہے بلکہ میری زندگی اُس ہرن سے مشابہ ہے جو گھاس کھاتا ہے لیکن اسکی طبیعت برگِ گیاہ کو مُشک ناب میں تبدیل کر دیتی ہے یعنی میں سادہ زندگی بسر کرتا ہوں لیکن فطرت نے مجھے فکرِ رسا عطا فرمائی ہے اس لئے نانِ جویں کھاتا ہوں لیکن میرے اشعار موتیوں سے بھی زیادہ آبدار ہیں۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

دُردِ من گیر کہ در میکدہ ہا پیدا نیست

پیر مردے کہ مئے تندو جوانے دارد

(ص ۴۸۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب! تجھے شراب خانوں میں تندو تیز شراب رکھنے والا مجھ جیسا کوئی عمر رسیدہ شخص نہیں ملے گا۔لہذا تو میری تلچھٹ سے فیض اٹھا۔مرُاد یہ کہ شاعری کی جو تاثیر تجھے میرے یہاں ملے گی میرے ہم عصر شعراء کے یہاں کم ہی دکھائی دے گی کیونکہ اُن کے پاس وہ فکرِ نادر نہیں،وہ ارفع پیغام نہیں جو میں اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں تک پہنچارہا ہوں لہذا تجھے چاہئے کہ تو میری شاعری سے فیض اٹھائے۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند

جہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(ص ۴۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میری وفات کے بعد لوگ میرے شعر پڑھیں گے،انہیں سمجھیں گے اور کہیں گے کہ یہ کیسا خود آگاہ انسان تھا جس نے اپنے انقلاب انگیز افکار سے ایک دنیا کو تہ وبالا کر دیا۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

من بطبع عصرِ خود گفتم دو حرف

کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف

حرف پیچا پیچ و حرفِ نیش دار
تاکنم عقل و دلِ مرداں شکار
حرفِ تہ دارے بانداز فرنگ
نالہء مستانہ از تار چنگ
اصل این از ذکر و اصل آن زفکر
اے تو بادا وارثِ این فکر و ذکر
آبجویم از دوبحر اصل من است
فصلِ من فصلِ است وہم وصلِ من است
تامزاج عصرِ من دیگر فتاد
طبعِ من ہنگامہء دیگر نہاد
(ص ۷۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں نے اپنے زمانے کے مزاج کے مطابق دو طرح کی شاعری کی اور دو سمندروں کو دو کوزوں یا پیالوں میں میں بند کیا یعنی ایک طرف لوگوں کے دل ودماغ کو متاثر کرنے کے لئے پیچیدہ اور چبھتی ہوئی شاعری کی اور دوسری طرف انگریزی طرز کی رمزیہ شاعری کی اور ساز کے تار چھیڑ کر مستی بھرے سُر پیدا کئے۔ اس دوسری طرز کی شاعری کی اصل قوت فکر ہے اور پہلی طرز کی شاعری کی اصل قوت ذکر ہے۔ اور اے مخاطب میں چاہتا ہوں کہ تو میری ان دونوں قوتوں کا وارث بن جائے یعنی ان سے استفادہ کرے۔ میں نے ذکر یعنی عشق اور فکر یعنی عقل کو ایک دوسرے سے جدا بھی کر دیا ہے اور ان دونوں قوتوں کو ملا بھی دیا ہے کیونکہ انسانی شخصیت کی صحیح تربیت ان دونوں قوتوں کے امتزاج ہی سے ہو سکتی ہے اور چونکہ اس زمانے کے لوگوں کا مزاج گزشتہ زمانے کے لوگوں سے مختلف ہے لہذا میں نے اسلام کے حقائق کو نئے جوش اور ولولے کے ساتھ پیش کیا ہے۔
مثنوی مسافر میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

خاوراں از شعلہء من روشن است
اے خنک مردے کہ در عصر من است
از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازین ناید چو من مردِ فقیر
گوہر دریاے قرآں سفتہ ام
شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

با مسلماناں غمے بخشیدہ ام
کہنہ شاخے رانمے بخشیدہ ام
عشق من از زندگی دارد سُراغ
عقل از صہبائے من روشن ایاغ
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت
با مسلماں حرف پر سوزے کہ گفت
ہمچونے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقام خویش برمن فاش گشت
حرفِ شوق آموختم واسوختم
آتشِ افسردہ باز افروختم

(ص ۸۸۱، ۸۸۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میرے کلام نے مشرق کو منور کر دیا اور وہ شخص بہت خوش نصیب ہے جو میرے زمانے میں ہے اور میرے کلام کا مطالعہ کرتا ہے۔ پس اے مخاطب تو بھی میرے فکر کی تابانی سے اپنا حصہ لے لے کیونکہ مجھ جیسا مردِ درویش پھر نہیں آئے گا۔ میں نے اپنی شاعری میں قرآنی حقائق و معارف پیش کئے ہیں اور رمزِ صبغۃ اللہ کی تشریح کی ہے یعنی مسلمانوں کو وہ طریقہ بتادیا ہے جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگین کر سکتے ہیں۔ یعنی اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کر سکتے ہیں۔ میں نے مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا پیغام دیا ہے اور عشقِ رسولؐ مسلمانوں کو اُسی طرح زندہ کر سکتا ہے جس طرح نمی یعنی پانی سے پرانی یعنی سوکھی ہوئی شاخ ہری ہو جاتی ہے۔ میں نے جس عشق کا پیغام مسلمانوں کو سنایا ہے وہ ان کی زندگی کا ضامن ہے اس عقل کی بدولت عقلِ انسانی منور ہو جاتی ہے یعنی عقل بذاتِ خود انسان کو خدا تک پہنچانے کی بجائے اُس سے دور کر دیتی ہے۔ کیونکہ عقل کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دل میں شکوک پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر عقل کو عشق کے تابع کر دیا جائے تو وہ خدارسی میں معاونت کر سکتی ہے۔ اس زمانے میں میرے سوا کسی شاعر نے دینِ اسلام کے حقائق و معارف اس قدر وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کئے اور نہ کسی نے مسلمانوں کو میری طرح عشقِ رسولؐ کا پیغام سنایا۔ میں نے مدتوں خلوت میں دینِ اسلام کے اسرار و رموز پر غور کیا تب کہیں جا کر میرا مقام مجھ پر واضح ہوا۔ یعنی آیات قرآنی میں تدبر کرنے سے مجھے یہ منصب حاصل ہوا کہ میں قوم کو پیغام دے سکوں میں نے قرآن و حدیث کے مطالعے سے اپنے اندر عشقِ رسولؐ کا رنگ پیدا کیا اور اپنی ہستی کو عشق کی آگ میں جلا کر خاک کر دیا تب میرے اندر قوم کو درسِ عشق دینے کا ولولہ پیدا ہوا۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

ندانم نکتہ ھاے علم و فن را
مقامِ دیگرے دادم سخُن را
میان کارواں سوز و سرورم
سبک پے کرد پیران کہن را
(ص ۱۰۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگرچہ میں استاد فن ہونے کا مدعی نہیں ہوں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ میں نے شاعری کو ایک نیا مقام و مرتبہ عطا کیا ہے یعنی شاعری میرے لئے ذریعۂ افتخار نہیں ہے بلکہ میرا کلام شاعری کے لئے موجب صد فخر و مباھات ہے اور اسی کی بدولت شاعری کو مقام رفیع حاصل ہوا ہے۔ مزید برآں میری شاعری میں جو سوز و سرور پایا جاتا ہے اس نے قافلے میں موجود بوڑھوں میں بھی جوانوں کا سا ولولہ پیدا کر دیا ہے اور انھیں تندرو بنادیا ہے۔

ارمغان حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

دو صد دانا دریں محفل سخن گفت
سخن نازک تر از برگِ سمن گفت
ولے با من بگو آن دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوالِ چمن گفت
(ص ۱۰۱۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگرچہ میری قوم کے سینکڑوں داناؤں نے انتہائی باریک علمی موشگافیوں میں اپنا وقت صرف کیا لیکن مجھ جیسا دیدہ ور کہاں جس نے کانٹے دیکھ کر چمن کا حال بیان کر دیا یعنی مسلمانوں کو انتہائی زبوں حالت میں پایا لیکن اُن کو مایوسی کے دریا میں غرق ہونے سے بچایا اور انھیں ان کے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کر کے ترقی کی راہیں سجھائیں۔

☆☆☆

۴۔ تجسیم نگاری

علامہ اقبال کے یہاں وجدانی اور ذوقی باتوں کی تجسیم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً اسرارِ خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ زمانے کی آنکھ یعنی صاحب نظر افراد مجھ سے مانوس نہیں۔ میں اپنے چہرے سے پردہ اٹھا کر نمایاں تو ہو رہا ہوں لیکن اس اندیشے سے جسم پر لرزہ طاری ہے کہ خدا جانے میرے متعلق کیا رائے قائم کی جائے :

خوگر من نیست چشمِ ہست و بود
لرزہ برتن خیزم از بیمِ نمود
(ص ٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

زمانے کا کوئی جسمانی وجود نہیں ہوتا لیکن علامہ اقبال نے اس شعر میں زمانے کو مجسم کیا ہے اور اس کی آنکھ کا تذکرہ کیا ہے۔

اسرارِ خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ اردو کو شیرینی اور مٹھاس میں شکر کی حیثیت حاصل ہے لیکن فارسی کے طرزِ سخن میں زیادہ مٹھاس پائی جاتی ہے۔ اسی لئے میری فکر پر فارسی کی جلوہ افروزی کا جادو چل گیا اور اس جلوہ افروزی کی بدولت میرا قلم طور کے درخت کی شاخ بن گیا۔

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرزِ گفتار دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
(ص ١١ کلیاتِ اقبال فارسی)

فارسی زبان مادی وجود سے عاری ہے لیکن علامہ اقبال نے اس شعر میں اُسے مجسم کرتے ہوئے اس کی جلوہ افروزیوں سے فیض یاب ہونے کا ذکر کیا ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ میرے پرانے جسم میں جو غموں سے نڈھال ہے جان کی کیفیت ایسی ہے جیسے آہ کا ایک جلوہ گرد و غبار سے آلودہ ہو :

جانم اندر پیکر فرسودۂ
جلوۂ آہے است گرد آلودۂ
(ص کلیاتِ اقبال فارسی)

آہ کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے جو گرد و غبار سے آلودہ نہیں ہو سکتی لیکن علامہ اقبال نے اس شعر میں آہ کو مجسم کیا ہے۔

رموزِ بے خودی میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ عقل اپنے مقصد کے لئے قدم اٹھانے سے پہلے اسباب ووسائل پر غور کرتی ہے۔ ان کی فراہمی کی فکر میں رہتی ہے۔ نیز یہ سوچتی ہے کہ فلاں قدم اٹھانے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے برعکس عشق عمل کے میدان کا شہسوار ہے وہ ہمشہ آگے بڑھتا ہے سرگرم کار ہوتا ہے نہ اس امر کی پرواہ کرتا ہے کہ اسباب اور ساتھیوں کا کیا حال ہے نہ اس جھنجھٹ میں پڑتا ہے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ صرف یہ جانتا ہے کہ فلاں کام ہونا چاہئے اور اس کے لئے میدان میں اُتر آتا ہے۔ عشق اپنے بازو کی قوت سے شکار کرتا ہے اور ہیر پھیر سے کام نہیں لیتا۔ عقل فطرتاً مکار ہے اور مکرو فریب کے جال پھیلاتی رہتی ہے۔ عقل کا سرمایہ خوف اور شک کے سوا کچھ نہیں اس کے برعکس عشق سے عزم اور یقین جدا ہو ہی نہیں سکتے گویا عقل جدھر قدم اٹھاتی ہے ڈرتے ہوئے اٹھاتی ہے اور اسے یقین نہیں ہوتا کہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ عشق ایسی ہر بات سے آزاد ہے وہ عزم ویقین لے کر اٹھتا ہے اور ہر اچھے مقصد کے لئے اس انداز سے کام شروع کر دیتا ہے کہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا۔

عشق در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند
عقل مکار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقیں لاینفک است
(ص ۱۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ چلنے والوں کے خون سے راستہ ایسا سُرخ ہو رہا ہے جیسے بہار میں گلِ لالہ کا تختہ خون آلود نظر آتا ہے۔ یہ کس کے نازنے نیاز کے قافلے کو قتل کر دیا ہے مُراد یہ کہ دنیا میں جس قدر عاشقانِ حق گزرے ہیں ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو مختلف اقسام کے مصائب سے دوچار نہیں ہوا۔

جادہ ز خونِ رہرواں تختۂ لالہ در بہار
ناز کہ راہ می زند قافلۂ بہار را
(ص ۳۱۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیام مشرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ اے قاصد میرے محبوب سے سلام کے بعد یہ کہنا کہ تیری ایک نگاہِ ناز نے میری آرزوؤں کے شہر میں آگ بھڑکا دی ہے یعنی آرزوؤں میں ہیجان برپا کر دیا ہے یا بالفاظ دگر آتشِ عشق کو مزید تیز کر دیا ہے :

از ماہجو سلامے آن ترکِ تند خورا
کآتش زد از نگاہے یک شہرِ آرزو را
(ص ۳۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

پہلے شعر میں ناز اور نیاز کے الفاظ معشوق اور عاشق کے لئے کنایۃً استعمال کئے گئے ہیں جبکہ دوسرے شعروں میں محبوب کے نازوانداز کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان کا تعلق ذوق ووجدان سے ہے جبکہ علامہ اقبال نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا وہ انسانی وجود رکھتے ہیں اور ان سے افعال بھی سرزد ہوتے ہیں۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اے اہلِ عجم! میری فکر نے زندگی کے باطن میں غوطے لگا کر تمہارے اُن افکار سے آگاہی کی اہلیت پیدا کی جو مجھ پر روشن نہ تھے مرُاد یہ کہ تمہارا شعروادب زندگی کے حقائق کا مرقع ہے لہذا اس سے آگاہی کے لئے زندگی کی حقیقتوں کا علم ضروری ہے۔

غوطہ ھازد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہان شما
(ص ۵۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

غوطے لگانے یا ڈوبنے کے لئے سیال مادے مثلاً پانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن علامہ اقبال نے اس شعر میں زندگی کے باطن یا اس کی گہرائیوں میں غوطے لگانے کا تذکرہ کیا ہے۔اسی طرح غوطہ لگانے والے کو مادی وجود کا حامل ہونا چاہئے جبکہ علامہ اقبال نے اپنی فکر کو مجسم کرتے ہوئے اس کے غوطوں کا تذکرہ کیا ہے۔

زبورِ عجم میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ محبت یا عشق اپنی ہمت کے بل بوتے پر اُس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں حُسن و جمال پر اپنا دل نچھاور کر دینا اس کی نگاہوں میں ہیچ ہو جاتا ہے۔مرُاد یہ کہ عشق کی ابتدائی منزل تو حُسن کے ہاتھوں اپنا دل ہار دینا ہی ہے لیکن اس کی انتہائی منزل کائنات کی تسخیر ہے۔جہاں پہنچ کر اس کے لئے ابتدائی منزل اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔پس عاشق کو اپنی انتہائی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے وگرنہ وہ زندگی کے اصل مقصد کو حاصل نہ کر پائے گا:

محبت از جوانمردی بجاے می رسد روزے
کہ افتد از نگاہش کاروبار دلربائی ھا
(ص ۵۱۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

عشق ایک جذبہ ہے جسے علامہ اقبال نے اس شعر میں مجسم کرتے ہوئے اس کی ہمت، طاقت اور نگاہوں کا تذکرہ کیا ہے۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عشق اپنا کجاوہ زمانے کی اونٹنی پر لئے آگے بڑھتا ہے۔مرُاد یہ کہ عشق میں یہ

طاقت ہے کہ عاشق کو زمانے پر حکمرانی کے قابل بنا دیتا ہے لہٰذا اے مخاطب اگر تو عاشق ہے تو شام و سحر کو اپنی سواری بنا یعنی عشق کی بدولت اپنی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا کر کہ شام و سحر یعنی زمانے کو اپنا غلام بنائے نہ کہ خود اس کا غلام بن جائے۔

عشق بر ناقۂ ایّام کشد محمل خویش

عاشقی؟ راحلہ از شام و سحر باید کرد

(ص ۶۸۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے اس شعر میں عشق کو مادی وجود عطا کر کے اس کے محمل کا تذکرہ کیا ہے اور شام و شحر کو سواری بنانے پر اصرار کیا ہے۔ جیسے جانور کی سواری یا گاڑی کی سواری، جبکہ وقت کا کوئی مادی وجود نہیں ہو تا کہ اُسے سواری بنایا جا سکے اسی طرح عشق ایک جذبے کا نام ہے۔

جاوید نامہ میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ علم تحقیق سے لذت یعنی خوشی حاصل کر تا ہے اور عشق تخلیق سے۔

علم از تحقیق لذت می برد

عشق از تخلیق لذت می برد

(ص ۶۵۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

لذت یا خوشی ایک ذہنی کیفیت ہے لیکن علامہ نے علم اور عشق کو ایک زندہ وجود عطا کر کے انھیں اس کیفیت کا حامل ٹھہرا لیا ہے۔

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ عصر حاضر میں حرم کو فرد کی بغاوت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے اس لئے میں مملکتِ عشق سے سپاہِ تازہ مرتب کر کے لا رہا ہوں تا کہ اس بغاوت کا قلع قمع کیا جا سکے مراد یہ کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی عقل عشق کی گرفت سے آزاد ہو گئی ہے اور چونکہ یہ صورتحال قوم کے حق میں انتہائی خطرناک ہے اس لئے میں انھیں از سرِ نو عشق کا پیغام دینا چاہتا ہوں :

سپاہِ تازے برانگیزم از ولایت عشق

کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

(ص ۸۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

پس چہ باید کرد ای اقوام شرق میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے مسلکِ عشق اختیار کیا تو میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میرا طواف یعنی عشق کی اطاعت و فرمانبرداری فرد کے لئے موجب سعادت ٹھہری۔ مُراد یہ کہ عقل جب تک عشق کی مطیع نہ ہو انسان کو تشکک اور انجام کار الحاد میں مبتلا کر دیتی ہے اور جب خدا کی ہستی کا یقین اس کے دل سے محو ہو جاتا ہے تو اوہامِ باطلہ اس کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں لیکن اگر وہ عشق کو اپنا رہنما بنائے اور عقل کو عشق کی اطاعت کا حکم دے تو

مقصدِ حیات حاصل کر سکتا ہے اور مقصدِ حیات یہ ہے کہ انسان اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرے تا کہ تسخیر کائنات کے بعد اس میں قانونِ حق جاری کر سکے اور یہ بات صرف عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے اسی لئے علامہ نے عشق کی اطاعت کو خرد کے لئے سعادت قرار دیا ہے :

باآن مقام رسیدم چو در برش کردم

طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است

(ص ۸۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

ان دونوں اشعار میں علامہ اقبال نے خرد کو رعایا کا ایک فرد قرار دیا ہے جو بغاوت پر مائل ہے جبکہ عشق کو بادشاہ کہا ہے جو اپنی فوج کی مدد سے اس بغاوت کا قلع قمع کر سکتا ہے جبکہ عشق اور خرد کسی مادی وجود کے حامل نہیں۔

ارمغانِ حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جس طرح آنسو ایک عاشق کے قلبی جذبات کا خارجی مظہر ہیں اُسی طرح میں فطرت کا وہ گراں قدر سرمایہ ہوں جو اس کے دل سے نکل کر اس کی آنکھ تک آیا۔ یعنی فطرت نے ہزاروں سال جدوجہد کی تب میرا وجود ظاہر ہوا۔ اگر کسی کو میری چمک دمک دیکھنی ہو تو فطرت کی آنکھ کی طرف دیکھے یعنی انسان فطرت کی آنکھ کا تارا ہے بہت قیمتی شے ہے مطلب یہ ہے کہ انسان کی تابناکی مژگانِ فطرت پر دیکھی جا سکتی ہے اس کی حقیقت فطرت کی دوسری مخلوقات میں ظاہر نہیں ہو سکتی بالفاظ دگر میں ادنیٰ درجے کی چیز نہیں ہوں کہ برگِ کاہ میں نظر آؤں۔

چو اشک اندر دل فطرت تپیدم

تپیدم تا بچشمِ او رسیدم

درخشِ من ز مژگانش توان دید

کہ من بر برگِ کاہے کم چکیدم

(ص ۱۰۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں علامہ اقبال نے فطرت کو مجسم کرتے ہوئے اُسے دل اور آنکھ جیسے اعضاء کا حامل قرار دیا ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے سینے میں دلِ ناشاد رکھتا ہوں اور میری ذات عشقِ الٰہی اور اس کی تجلیات سے محروم ہے۔ اسی لئے اے خدا! وہ ثواب میرے کندھوں پر بوجھ ہے جو تو مجھے میری نمازِ بے حضور یعنی خضوع و خشوع سے ادا نہ کی جانے والی نماز کے بدلے دیتا ہے لہذا تو مجھ سے یہ ثواب واپس لے لے۔

دلے در سینہ دارم بے سرورے

نہ سوزے در کفِ خاکم نہ نورے

بگیر از من کہ بر من بارِ دوش است

ثواب   این   نماز   بے   حضورے

(ص ۸۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال نے اس شعر میں ثواب کو مجسم کیا ہے جبکہ اس کا کوئی مادی وجود نہیں جو وزنی ہو یا جسے کندھوں پر اُٹھایا جا سکے۔



حوالہ جات

۱۔اقبال ۸۶ء مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت'ص ۲۰۷

۲۔اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی'دکتر محمد ریاض'ص ۹۸

۳۔کلیات عرفی شیرازی'ص ۴۰۴

۴۔دیوان فغانی'شیخ مبارک علی تاجر کتب'اندرون دروازہ لوھاری'س ن'ص ۵۳

۵۔دیوان غزلیات نظیری'مطبع نامی کریمی لاہور'۱۹۲۸ء'ص ٦

٦۔کلیات عرفی'ص ۱۳۳

۷۔کلیات اشعار'ملک الشعراء طالب آملی'انتشارات کتابخانۂ سنائی'س ن'ص ۵۷۱

۸۔اقبال لاہوری ودیگر شعرای فارسی گوئی'دکتر محمد ریاض'ص

۹۔ایضاً'ص

۱۰۔دیوان غزلیات نظیری'ص ۱۱۵

۱۱۔کلیات فیضی'ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور'۱۹٦۷ء'ص ۴۰۸

۱۲۔کلیات صائب'ص ۵۷۳

۱۳۔دیوان غزلیات نظیری'ص ۳۴

۱۴۔ایضاً'ص ۱۰۰

۱۵۔اقبال ایرانیوں کی نظر میں،خواجہ عبدالحمید عرفانی،ص ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳

۱٦۔کلیات سعدی'ص

۱۷۔دیوان غالب'ص ۲۰۲

۱۸۔اقبال اور فارسی شعراء'ڈاکٹر محمد ریاض''ص

باب پنجم

علامہ اقبال کا فارسی شعری اسلوب

برصغیر میں فارسی زبان کے انحطاط کے دور میں علامہ اقبال نے ایک غیر فارسی زبان شاعر ہوتے ہوئے ایک نئے سبک شعر کو جنم دیا جوانہی کے نام سے معروف ہوا اور اس کا اعتراف ہندوستان وپاکستان کے ناقدین نے ہی نہیں ایرانیوں نے بھی کیا۔ چند آراء ملاحظہ ہوں :

پروفیسر ڈاکٹر حسین خطیبی لکھتے ہیں :

"اگر خواستہ باشیم سبک اشعار علامہ محمد اقبال لاہوری را در چند کلمہ خلاصہ کنیم باید بگوئیم این شاعر سبک مخصوص بخود داشت کہ شاید مناسب باشد آنرا بنام سبک اقبال بخوانیم"(۱)

ڈاکٹر حسین خطیبی مزید لکھتے ہیں :

"اقبال راشاعری دیدم در انواع مختلف شعر متفنن ھم متوجہ باسالیب کہن فارسی و مقتبس ازآن وھم در اھاد اکاودمبتکر طریقہ ای جدید در بعضی از اقسام وفنون شعر۔"(۲)

رفیق خاور لکھتے ہیں :

"انھوں نے اپنا ایک سبک قائم کیا ہے جو ہندی اور ایرانی سبکوں سے جدا اور منفرد ہوتے ہوئے ان سب پر حاوی بھی ہے یعنی ان سب کی جداگانہ خصوصیات کی روح ان کی تصنیف میں سمودی گئی ہے اور ان کے سبک کو قدیم وجدید کلاسیکی ورومانی اسالیب کی شان طرح داری کا بھرپور رنگارنگ مجموعہ قرار دیتی ہے۔"(۳)

ڈاکٹر شھین دخت مقدم صفیاری لکھتی ہیں :

"اقبال در شعر فارسی سبک جدیدی بہ وجود آورد کہ باید آن را مکتب اقبال نامید۔"(۴)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"اقبال فارسی میں ایک اہم ادبی روایت کے وارث ہونے کے علاوہ ایک خاص طرزِ اسلوب کے مالک بھی ہیں۔"(۵)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں :

"فارسی شاعری میں اقبال کی نئی آواز منفرد اور ممتاز ہے سادگی وسادہ بیانی اور کلاسیکی

روایات کی پاسداری کے باوجود ان کے بے باک انقلابی لہجے تخیل کی رنگینی اور جولانی، فکری اور اسلوبی ابداعات، لفظی اور تراکیبی اختراعات، غنائیت اور ڈرامائیت نے شعر اقبال کو فارسی شاعری کی تاریخ میں ایک ایسا مقام عطا کیا ہے کہ انہیں روایتی انداز کے لسانی اور شعری دبستانوں میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص و منسلک نہیں کر سکتے۔"(۶)

ملک اشعراء بہار لکھتے ہیں :

ہیکلی گشت از سخنگوئی بیا
گفت کل الصید فی جوف الفرا
عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاران برگزشت
شاعران گشتند جیشی تار مار
وین مبارز کرد کار صد ہزار (۷)

زبان کبھی یکساں نہیں رہتی۔ آج کی اردو اور اس کی ابتدائی شکل دکنی، دو مختلف زبانیں ہیں۔ جیسے موجودہ انگریزی اور اینگلو سیکسن زبان۔ بلکہ اب تو قدیم و جدید اردو میں بھی فرق ہے۔ فارسی نے بھی دورِ جدید میں نئی وضع اختیار کی ہے جس سے اس میں اور سابقہ فارسی میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ برصغیر میں کلاسیکی فارسی ہی کا رواج تھا۔ یعنی سعدی حافظ، جامی وغیرہ کی زبان۔ اقبال کو یہی زبان ورثے میں ملی۔ بلکہ آج بھی فارسیٔ جدید سے شناسائی کے باوجود برصغیر کے اکثر فارسی دان قدیم فارسی ہی سے مانوس ہیں۔ اسے یہیں کی فارسی سمجھنا چاہیے جو ایران کی فارسی سے الگ زبان ہے۔ یہاں کے لکھنے والوں سے یہ تقاضا بے محل ہے کہ وہ جدید محاورے کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔ یہاں کی فارسی تحریروں کو یہیں کی زبان کے مطابق دیکھنا اور پرکھنا چاہئے۔ کیونکہ یہ مختلف زبان ہے۔

علامہ اقبال کی زبان بڑی حد تک ہندوستانی فارسی ہے جو ایران کی کلاسیکل فارسی ہی ہے۔ لہذا اہل ایران کو بھی اسے مختلف زبان سمجھنا چاہئے اور اُسی حیثیت سے دیکھنا چاہئے۔ علامہ نے اس زبان کو زیادہ نکھار کر برتا ہے اور اپنی لطافت ذوق سے اسے نئی آب و تاب بخشی ہے۔ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے اگر ان کی زبان و بیان کا موازنہ سابقہ ایرانی و مقامی شعراء کی زبان و بیان سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے اس کو نیا آب و رنگ عطا کیا ہے اور اسی نئے آب و رنگ کی وجہ سے علامہ اقبال کے سبکِ شعر کو اُنہی کے نام سے منسوب کر دیا گیا جس کی تفصیل یہ ہے :

وہ زبان پرست شاعر نہیں تھے اور انہوں نے زبان کو ایک جامد بُت سمجھنے کی بجائے اس کی سیال انقلابی صلاحیت سے فائدہ اٹھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ :

> ”زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب ان میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ مُردہ ہو جاتی ہے۔“(۸)

اور علامہ اقبال کے خیالات انقلابی تھے جن کو پیرایۂ اظہار بخشنے کے لئے انہوں نے بہت سے ایسے الفاظ کو جنہیں عام شعراء شعر کی لطیف بُنت میں شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں اس طرح جزو شعر بنایا کہ پڑھنے والے کو کسی قسم کی گرانی کا احساس نہیں ہوتا مثلاً اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں :

دست و دندان و دماغ و چشم و گوش
فکر و تخیل و شعور و یاد و ہوش
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت
بہرِ حفظ خویش این آلات ساخت
(ص ۷ اکلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی نے جب اپنی سواری سعی و کوشش اور تگ ودو کے میدان میں ڈالی تو اپنی حفاظت کے لئے ہاتھ، دانت، ناک، آنکھ، کان، فکر، تخیل، شعور، یاد اور ہوش جیسے آلات تیار کئے۔

ان اشعار میں استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً دست، دندان، دماغ، چشم، گوش اور آلات شعری بنت میں عام طور گراں محسوس ہوتے ہیں۔

رموزِ بے خودی کا ایک شعر ہے :

لابہ و مکاری و کین و دروغ
این ہمہ از خوف می گیرد فروغ
(ص ۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی خوشامد، مکاری، کینہ اور جھوٹ یہ سب خوف ہی سے فروغ پاتے ہیں

اس شعر میں مکاری کا لفظ لایا گیا ہے جس کے شعر میں استعمال سے عموماً گریز کیا جاتا ہے۔

پیامِ مشرق میں فرماتے ہیں :

برفتد تاروش رزم درین بزم کہن

دردمندان جہان طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند

بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

(ص ۳۶۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی انسانیت کے بہی خواہوں نے دنیا سے جنگ وجدل کا خاتمہ کرنے کے لئے ایک نئی طرح ڈالی ہے جس کے متعلق میں بجز اس کے کچھ نہیں جانتا کہ دنیا کے ماہر فن کفن چوروں نے قبروں یعنی ایشیائی یا کمزور اقوام کو دیانت داری کے ساتھ آپس میں تقسیم کرنے کے لئے ایک انجمن بنائی ہے

اس شعر میں کفن دزد کی ترکیب استعمال کی گئی ہے جو عام طور پر شعری حسن میں کمی کا باعث بنتی ہے۔

زبور عجم کا ایک شعر ہے

شاہین من بصید پلنگاں گذاشتی

ہمت بلند وچنگل ازیں تیز تر بدہ

(ص ۳۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے خدا تو نے اگر میرے شاہین یعنی ملتِ مسلمہ کو چیتوں یعنی اقوام غالب کا شکار بنا ہی دیا ہے تو مجھے بلند ہمتی اور تیز پنجہ بھی عطا کر۔

شاعری میں پلنگ اور چنگل جیسے الفاظ کا استعمال غیر شاعرانہ تصور کیا جاتا ہے۔

جاوید نامہ میں فرماتے ہیں :

بحر و ہنگام غروب آفتاب

نیلگوں آب از شفق لعلِ مذاب

(ص ۶۰۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی غروب آفتاب پر سمندر کا نیلا پانی سرخئ شفق کی بدولت پگھلے ہوئے لعل کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں پانی کے لئے لعل مذاب جیسی تشبیہ لائی گئی ہے جو شعری نزاکت سے عاری سمجھی جاتی ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں فرماتے ہیں :

سر شیری را نہ فہمد گاو میش

جز بہ شیراں کم بگو اسرارِ خویش

(ص ۸۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے انسان شیروں یعنی بہادروں کو ہی اپنے بھیدوں سے آشنا کرو کیونکہ گائے بھینس یعنی فرومایہ لوگوں کی سمجھ میں شیروں یعنی بہادروں کی زندگی کے بھید نہیں آتے۔

شعر میں گاو و میش جیسے الفاظ کا استعمال سماعت پر گراں گزرتا ہے۔

ارمغانِ حجاز کی ایک دوبیتی ہے۔

چہ گویم رقص تو چوں است و چوں نیست
حشیش است ایں نشاطِ اندرون نیست
بہ تقلید فرنگی پائے کوبی
بہ رگہائے تو آن طغیانِ خون نیست

(ص ۸۷۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان تیری رگوں میں خون کی طغیانی نہیں اسی لئے تو فرنگیوں کی تقلید میں ناچ رہا ہے اور تیرے اس رقص کے بارے میں بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ باطنی نشاط کا نہیں بھنگ کی نتیجہ ہے۔

حشیش کا لفظ عام طور پر شعریت سے عاری تصور کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اور متذکرہ بالا الفاظ جیسے دیگر کئی الفاظ حفیظ جالندھری کے بقول (۹) پتھر کی وہ بھاری چٹانیں ہیں جنہیں علامہ نے موتیوں کی طرح اپنے اشعار میں جڑ دیا اور انور سدید کے بقول (۱۰) ان کی جگہ کوئی بھی دوسرا مترادف لفظ بٹھانے کی کوشش شعر کے مفہوم کو تبدیل کر سکتی ہے۔



علامہ اقبال نے پرانی اصطلاحات کو نئے معانی دیئے۔ متداول الفاظ کے معانی میں توسیع پیدا کی اور نئی تراکیب وضع کیں۔ ان کے ہاں خودی، بے خودی، عشق اور خرد وغیرہ معمولی معانی کے آئینہ دار نہیں ہیں۔ محمد عثمان علامہ کی خودی و بے خودی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> ”خودی کا لفظ اردو اور فارسی شعر و تصوف کی کتابوں میں غرور تکبر اور خودبینی کے معنوں میں زیادہ استعمال ہوا ہے اور ذات اور نفس کے معنوں میں کم کم۔ اقبال نے اسے مقدّم الذّکر مفہوم سے بالکل الگ کر لیا اور اس کے دوسرے معنوں میں بڑی وسعت، گہرائی اور ندرت پیدا کی۔ اسی طرح ”بے خودی“ کو فارسی اور اردو کے شعراء کیف و مستی اور از خود رفتگی اور سرشاری کے معنوں میں لائے ہیں۔ غالب کا یہ شعر اسی مفہوم کی نمائندگی کرتا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

لیکن اقبال کے ہاں اس کا مفہوم یکسر اور ہے۔ خودی غرور و تکبر نہیں، اپنی ذات کی پہچان اور اس کی تکمیل ہے۔ بے خودی عشق یا شراب کے نشے میں اپنے آپ کو بھول جانا یا بھلا دینا نہیں بلکہ ذاتی مفاد اور نفسی اغراض کو ملت کے وسیع تر مفاد پر قربان کر دینے کا نام ہے۔"(۱۱)

خودی اور بے خودی کے موضوع پر علامہ اقبال کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

خویشتن را وا نمودن زندگی ست
ضربِ خودرا آزمودن زندگی ست
(ص ۸۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی اپنی ذات کی نمود اور اپنی طاقت کو آزمانے کا نام ہے۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو
(ص ۵۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی انجمن آرا (اجتماعی) بھی ہے اور نگہبان خویش (انفرادی) بھی ہے لہذا اے مخاطب تو جو شریک قافلہ ہے سب کے ساتھ چل لیکن اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر بسر کر۔

عشق بھی علامہ اقبال کے یہاں اپنے روایتی مفہوم سے ہٹ کر ہے وہ انسان کو کائنات کے خارجی عناصر سے بے تعلق کر کے دل کی پُر اسرار کائنات میں ڈوب جانے اور اس محویت و استغراق اور سوز و مستی کی کیفیت دوام سے لذت حاصل کرنے کی ترغیب دینے کو ہی نہیں خارجی دنیا کے تصرف اور عناصر فطرت کی تسخیر کو بھی لازم ٹھہراتے ہیں کیونکہ خلوت و جلوت کے امتزاج ہی سے عشق کی پوری قوت و توانائی کا اظہار ممکن ہے۔ خلوت میں روح کی تربیت ہوتی ہے لیکن اس باطنی تربیت کا نتیجہ جلوت میں ظاہر نہ ہو تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انقلاب برپا نہیں ہو سکتا۔ جلوت کے بغیر یہ خلوت رہبانیت کی طرف لے جاتی ہے اور اس عشق سے محروم کر دیتی ہے جو فعال بھی ہے اور خلاق بھی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"ان کی شاعری میں شوق اور عشق جیسے الفاظ مجاز اور ہوس کی منزلوں سے بلند تر سطح کے معانی اور تصورات کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں لفظ عشق، طلب اور

سعی کی جملہ مادی، اخلاقی اور روحانی صورتوں پر حاوی ہے جس میں یہ جذبہ انفرادی دائرے تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام اجتماعی مقاصد پر محیط ہے۔"(۱۲)

علامہ کی نظر میں عشق کی بہترین مثال رسول کریمؐ کی زندگی ہے جو خلوت اور جلوت کے صحیح امتزاج کی آئینہ دار ہے اور ان کی تقلید ہی سے عشق کا جوہر نکھرتا ہے اور روحِ انسانی کو لازوال بنا دیتا ہے لیکن علامہ کے یہاں عشق کا سلسلہ صرف انسان تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اس کی روح کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں بھی جاری و ساری پاتے ہیں اور اسے کائنات میں تخلیق، نمو، ارتقاء، حرکت اور نظم و ترتیب کا سرچشمہ بھی قرار دیتے ہیں عشق کے موضوع پر علامہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں :

عشق از فریاد ما ہنگامہ ھا تعمیر کرد
ورنہ این بزم خموشاں ہیچ غوغاے نداشت
(ص ۵۲۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ہماری آہ و فریاد سے عشق نے ہنگامے کھڑے کر دیئے وگرنہ یہ دھرتی شور شرابے سے عاری تھی۔

عشق آئین حیات عالم است
امتزاج سالمات عالم است
(ص ۱۳۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عشق ہی دنیاوی زندگی کا آئین ہے اور دنیا کے ذرات کا امتزاج اسی کی بدولت ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"عشق کے باب میں اقبال کا نقطۂ نظر ذات و کائنات کے اثبات و تسخیر کا داعی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عشق دوسرے شاعروں کے متصوفانہ اور رسمی عشق سے یکسر مختلف ہے۔"(۱۳)

علامہ اقبال اگرچہ استدلالی عقلیت کے سخت مخالف ہیں لیکن عقل پر عشق کی برتری کا روایتی مضمون بھی ان کے یہاں دکھائی نہیں دیتا کیونکہ وہ عقل اور عشق دونوں کو زندگی کی بنیادی قدریں قرار دیتے ہیں اور زندگی کے ارتقاء کے لئے دونوں کے تعاون کو لازمی گردانتے ہیں ان کے نزدیک عقل اور عشق ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ان کی اساس ایک ہے اور عقل منتہائے کمال پر پہنچ کر وجدان یا عشق میں بدل جاتی ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

زیرکی از عشق گردد حق شناس
کار عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود
نقشبند عالمِ دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

(ص ۶۵۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عقل انسانی عشق کی بدولت حق شناس ہو جاتی ہے اور عقل کی بدولت عشق کو استحکام حاصل ہوتا ہے جب عقل عشق کی ساتھی ہو جاتی ہے تو عشق میں نئی دنیا تعمیر کرنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے اے مسلمان اٹھ اور عشق اور عقل دونوں کی مدد سے عالمِ نو کی بنیاد ڈال۔

علامہ کا پروانہ اور جگنو بھی دوسرے شعراء کے روایتی پروانے اور جگنو سے مختلف ہے پروانہ ان کے نزدیک سوز کا مظہر ہے جبکہ جگنو جلنے کے لئے دوسری کا احسان نہیں اٹھاتا اس لئے شاعر کی نظر میں پروانے سے برتر ہے۔ عزیز احمد علامہ کے یہاں پروانے اور جگنو کی اس تفریق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"جگنو کا مقام پروانے سے افضل اس لئے ہے کہ جگنو کی آگ آتشِ بے سوز سہی لیکن وہ اس کی اپنی خودی کی پروردہ ہے۔ پروانہ پرائی آگ کا دلدادہ ہے اس میں حرکت کی صفت ضرور ہے مگر وہ اسے اپنی خودی سے ہٹا کر فنا کی طرف لے جاتی ہے۔ پروانے کا یہ تصور مشرقی شاعری کی ہزاروں سال پرانی ڈگر سے بڑا انقلابی انحراف ہے۔" (۱۹)

جگنو اور پروانے کے مقام کے تعین کے حوالے سے علامہ اقبال کی ایک دوبیتی ملاحظہ ہو :

توان بے منت بیگانگاں سوخت
نپنداری کہ من پروانہ کیشم
اگر شب تیرہ تر از چشم آہوست
خود افروزم چراغِ راہ خویشم

(ص ۲۸۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب! تو یہ مت سمجھنا کہ میں پروانے کا ہم مشرب ہوں، ہرگز نہیں میں تو بے منت غیر جلتا ہوں۔ کسی کا احسان لینا میری فطرت کے خلاف ہے۔ رات خواہ کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہوں۔ میں دوسروں کے سامنے روشنی کے لئے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اپنی راہ خود منور کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود افروز ہوں۔

بلبل و قمری کی بجائے شاہین کا انتخاب بھی علامہ کی فکری جدت کا آئینہ دار ہے ایک خط میں شاہین کے بارے میں

فرماتے ہیں :

"............اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خوددار اور غیرتمند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے۔ (۵) تیز نگاہ ہے۔" (۱۵)

شاہین کی انہی صفات کے پیش نظر اقبال نے اسے اپنے تخیل میں بڑی نمایاں جگہ دی ہے اور اسے خودی کا مظہر بتایا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

جرعہ شاہینی بمرغان سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پرکشا پروازِ تو کوتاہ نیست
(ص ۹ ۷ ۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان تو شاہین بچہ ہے پالتو پرندوں کی صحبت اختیار نہ کر بلکہ اٹھ اور اپنے پر کھول کیونکہ تو نیچی اُڑان کا عادی نہیں۔

تو اے شاہین نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
ہوائے او ببالِ تو دہد پرواز کوتا ہے
(ص ۹۲ ۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے شاہین! میں خائف ہوں کہ تو نے باغ کو اس لاعلمی کے نتیجے میں کہ اس کی فضا تیرے پروں کو نیچی اڑان سکھائے گی اپنی قیام گاہ بنالیا ہے۔

شاہین من بصید پلنگاں گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازین تیز تر بدہ
(ص ۹۶ ۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے خدا تو نے اگر میرے شاہین یعنی ملتِ مسلمہ کو چیتوں یعنی اقوام غالب کا شکار بنا ہی دیا ہے تو مجھے بلند ہمتی اور درندوں جیسا پنجہ بھی عطا کر۔

اگر یک قطرہ خون داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من باتو آموزم طریق شاہبازی را
(ص ۹۶ ۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان! اگر تیرے پاس ایک قطرہ خون اور مٹھی بھر پر ہیں تو آمیں تجھے شاہبازی طور طریقے سکھاؤں۔



علامہ اقبال کے یہاں متداول الفاظ کے معنوں میں بھی توسیع دیکھنے کو ملتی ہے ڈاکٹر سید عبد اللہ اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

> "اقبال کی مخصوص لفظیات میں بعض ایسے پرانے الفاظ بھی ہیں جن کے معانی میں غیر معمولی وسعت پیدا کر لی گئی ہے مثلاً بولہبی، حیدری، کراری، خیبری، خواجگی وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام میں حیدر کی اصطلاح اپنی دلالت میں وسیع تر معنوں کی حامل ہے یہ اصطلاح ان تمام اوصاف کی جامع ہے جو ایک غیور، ایمانِ کامل کے مالک، دنیا کے تمام تکلفات سے بے نیاز فقر میں قاہری اور دلبری کے انداز رکھنے والے شخص میں جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ کردار اقبال کے فکر کے "فقرِ غیور" کا نمائندہ ہے اقبال نے توسیع زبان کے عمل میں اس طرح کے اور بھی کئی الفاظ منتخب کئے ہیں۔" (۱۶)

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

نہال ترک زبرق فرنگ بار آورد
ظہور مصطفوی را بہانہ بولہبی است
(ص ۵ ۳ ۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی قدرت ایزدی تو دیکھو کہ ترکوں پر فرنگیوں کی فوج کشی کا نتیجہ خلافِ توقع یہ نکلا کہ برقِ فرنگ سے ترکوں کا درخت سرسبز اور بار آور ہو گیا یعنی ترک کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن اسلام (ابو لہب) کا یہ حملہ سرکار ابد قرار صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کے ظہور کے لئے بہانہ بن گیا۔

مردِ کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خود داری است
(ص ۸ ۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی جب تک انسان اپنے اندر کراری کے جوہر پیدا نہ کرے بالفاظ دیگر اس کے عزم میں استواری اور عمل میں استقلال اور استقامت کمال پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک وہ سلطنتیں فتح نہیں کر سکتا۔ یہی کراری اس کی خودداری کی دلیل ہے اور خودداری ہی کی برکت سے اس کے گوہر کی آبرو قائم ہے۔

فریاد زافرنگ و دلآویزئ افرنگ
فریاد زشیرینی و پرویزئ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

(ص ۵۷۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

انگریزوں کی محبوبیت سے پناہ جن کی وحشت اور بربریت کے نتیجے میں تمام عالم کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔اے حرم کے معمار تو اس عالم کی تعمیر نو کے لئے دوبارہ اٹھ کھڑا ہو۔

دیگر اصطلاحات میں ستارہ، نسیم، جوئے آب زندگی کے پیہم سفر کے لئے نہایت بلیغ اور خوبصورت اشارے ہیں۔

افکارِ انجم میں ایک ستارہ دوسرے سے کہتا ہے :

سفر اندر سرشت ما نہادند
ولے این کارواں را منزلے نیست

(ص ۲۶۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگرچہ ہم ہر وقت گردش میں رہتے ہیں لیکن ہمیں اپنی منزل مقصود کا کچھ پتہ نہیں موجِ نسیم بھی ہمیشہ رہسپار ہے۔

این گل و لالہ تو گوئی کہ مقیم اند ہمہ
راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اند ہمہ

(ص ۱۷۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان تو یہ سمجھتا ہے کہ گل و لالہ (یعنی دنیاوی اشیاء) ہمیشہ رہنے والے چیزیں ہیں لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ موج نسیم کی طرح یہ بھی راہ پیما یعنی فانی ہیں۔

اور جوئے آب کا مستقل ترانہ بھی یہی ہے۔

ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

(ص ۲۹۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حرکت میری زندگی ہے اور سکون میری موت۔

موج علامہ کے یہاں حرکت' اضطراب اور جوش کی علامت ہے۔ دریا زندگی کے تسلسل اور روانی کے معنی دیتا ہے جبکہ ساحل سکون اور افتادگی کی علامت ہے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش درآویز

حیات جاوداں اندر ستیز است

(ص ۲۱۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی کی کش مکش سے گریز ضعفِ خودی کا باعث ہے اور ضعف خودی کا نتیجہ موت ہے اگر حیات جاوداں کی خواہش ہے تو تنازع للبقاء میں بقدر استطاعت حصہ لو تاکہ خودی مستحکم ہو سکے۔

اسی طرح لالہ خاموشی، دل سوزی، سرمستی اور رعنائی کے علاوہ صحرائے عرب کی بدوی تہذیب کی بھی علامت ہے:

عشق را داغے مثالِ لالہ بس

درگریبانش گلِ یک نالہ بس

من ہمیں یک گل بدستارت زنم

محشرے برخواب سرشارت زنم

تا ز خاکت لالہ زار آید پدید

از دمت باد بہار آید پدید

(ص ۸۳، ۸۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عشق کے لئے لالہ جیسا داغ اور گریبان میں لٹکتا آہ و فریاد کا ایک پھول ہی کافی ہے۔ میں یہی ایک پھول تیری پگڑی میں لگا کر تیری سرشار نیند میں حشر کا ہنگامہ برپا کر رہا ہوں تاکہ تیرے جسم سے لالہ زار پھوٹے اور تیرے سانسوں سے بہار کی خوشبو آئے۔



علامہ اقبال کی اصطلاحات کی طرح ان کی بیشتر تراکیب بھی ان کی اپنی ایجاد کردہ ہیں اور اس ترکیب سازی میں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"............ عموماً دو باتیں ان کے لئے محرک ثابت ہوئی ہیں اوّل نئے مطالب کے لئے پر معنی تراکیب کی ایجاد، دوّم عبارت کی صوتی فضا کی مناسبت سے لفظ کے ساتھ ساتھ خاص آواز کی تخلیق۔" (۱۷)

علامہ اقبال کی چند نئی تراکیب ملاحظہ ہوں:

اسرار خودی میں ایک جگہ حیات بخش اور دوسری جگہ حیات سوز شاعری کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"از فریب او خود افزا زندگی

خود حساب و ناشکیبا زندگی

(ص ۳۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اس جادو سے زندگی کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے وہ اپنی قدر و قیمت کا جائزہ لیتی ہے اور اس میں تگ و دو کی بیتابی پیدا ہوتی ہے۔

جوئے برقے نیست در نیسان او

یک سراب رنگ و بو بستان او

(ص ۳۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اس کا بادل بجلیوں کی ندی سے محروم ہے اور اس کا باغ رنگ و بو کا ایک دھوکا ہے۔

ان اشعار میں خود افزا، خود احساب، جوئے برق اور سراب رنگ و بو علامہ کے خلاق ذہن کی تخلیق ہیں۔

رموزِ بے خودی میں ایک جگہ حزن و خوف کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عزم محکم ممکنات اندیش ازو

ہمت عالی تامل کیش ازو

(ص ۹۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی خوف انتہائی مضبوط ارادے کے مالک اور بلند حوصلہ شخص کو بھی اپنے اعمال کی انجام دہی میں متذبذب بنا دیتا ہے۔

اور دوسری جگہ امومت کو نوع انسانی کی بقا کا باعث قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

بردمد این لالہ زار ممکنات

از خیابان ریاض امہات

(ص ۱۵۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ممکنات کا یہ لالہ زار ماؤں ہی کے باغ کی کیاریوں میں کھلے گا۔

ان اشعار میں ممکنات اندیش اور لالہ زار ممکنات علامہ اقبال کی اپنی اختراع کردہ تراکیب ہیں۔ پیام مشرق کی ایک دوبیتی میں انائے مطلق کی کائنات کی ہر شے میں جلوہ گری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

چساں اے آفتاب آسمان گرد

باین دوری بچشم من در آئی؟

بخاکی واصل واز خاکداں دور

تو اے مژگان گسل آخر کجائی؟

(ص ۲۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے آسمان کی سیاحت میں مصروف سورج تو اس بُعد کے باوجود میری آنکھوں میں کس طرح جلوہ گر ہے ؟ اور اس خاکدان سے دور ہوتے ہوئے بھی ہر مادی شے سے کیونکر واصل ہے۔ اے پلکیں جدا کر دینے والے آخر تو کہاں ہے ؟

جبکہ ایک اور دوبیتی میں عشق کو روحانی عروج اور ہوس کو روحانی تنزل کا باعث قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

ترا اے تازہ پرواز آفریدند
سراپا لذت بال آزمائی
ہوس مارا گراں پرواز دارد
تواز ذوقِ پریدن پر گشائی

(ص ۲۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے عشق خدا نے تجھے سراپا لذت پرواز بنایا ہے اس لئے تو ذوق پرواز کی وجہ سے پر کشا ہے یعنی روبہ ترقی ہے لیکن ہم گرفتار ہوا و ہوس ہیں اس لئے کسی قسم کا روحانی ترفع حاصل نہیں کر سکتے۔

ان دوبیتوں میں مژگاں گسل اور لذت بال آزمائی جیسی پُر معنی اور حسن آفرین تراکیب کا استعمال علامہ کی فکری نادر کاری کا بیّن ثبوت ہے۔

زبورِ عجم میں ایک جگہ ساقیٔ ازل سے شراب عشق کا تقاضا کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ساقیابر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز

(ص ۴۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے ساقی ! تو میرے جگر پر آگ لگا دینے والی شراب انڈیل اور میرے بدن خاکی میں قیامت کے فتنے برپا کر۔

جبکہ ایک اور جگہ انائے مطلق کی نقش پردازی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

نقش پرداز توئی ماقلم افشانیم
حاضر آرائی و آیندہ نگاری از تست

(ص ۴۲۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے خدا ہم محض قلم افشانی کرتے ہیں جبکہ حقیقی نقاش تو ہے جو موجودہ زندگی کو بھی آراستہ کرتا ہے اور آنے والی زندگی کے نقوش بھی مرتب کرتا ہے۔

ان اشعار میں، شعلۂ نمناک، حاضر آرائی اور آیندہ نگاری جیسی تراکیب علامہ اقبال کی خلاق طبع کی آئینہ دار ہیں۔

جاوید نامہ میں ایک جگہ تخلیقِ کائنات کو موضوع بناتے ہوئے فرماتے ہیں :

زندگی از لذت غیب و حضور
بست نقش این جہان نزد و دور
آن چناں تارنفس از ہم گیخت
رنگِ حیرت خانۂ ایّام ریخت
ہرکجا از ذوق و شوق خودگری
نعرۂ من دیگرم تو دیگری

(ص ۶۰۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی دنیا کی آفرینش سے پہلے حیات (انائے مطلق) ایک وحدت تھی لیکن اس میں ظہور کی آرزو موجزن تھی اس لئے وہ تعینات کے لباس میں آکر گرفتار کثرت ہو گئی یعنی انائے مقید میں تبدیل ہو گئی۔ اور انائے مقید نے زمان مسلسل کا تصور پیدا کر کے حیرت خانہ ایّام (روز و شب) کی بنیاد ڈالی۔ لیکن چونکہ ہر انائے مقید اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا چاہتی ہے اس لئے من و تو کا امتیاز پیدا ہو گیا۔

ان اشعار میں لذتِ غیب و حضور، حیرت خانہ ایّام اور ذوق و شوق خودگری جیسی معنی خیز اور خوش آہنگ تراکیب علامہ اقبال کی اپنی اختراع ہیں۔

مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں حضور رسالتمآبؐ سے نگاہ التفات کی خواہش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

گردِ تو گردد حریم کائنات
از تو خواہم یک نگاہ التفات

(ص ۸۴۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی چونکہ کائنات کی گردش کا محور آپؐ ہی کی ذات ہے لہذا میں بھی آپؐ ہی کی نگاہِ التفات کا تمنائی ہوں۔

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغ من بریز

(ص ۸۴۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی چونکہ میں باطل پرستوں کے خلاف قلمی جہاد میں مصروف ہوں لہذا آپؐ سے ملتجی ہوں کہ آپؐ میری فکر کے چراغ کو اپنے فیوض کے روغن سے منور کر دیجئے۔

ان اشعار میں حریم کائنات اور پرستاران شب جیسی نادر تراکیب سے علامہ اقبال کی فکری خلاقی عیاں ہے۔

مثنوی مسافر میں ایک جگہ حضور رسالتمآبؐ کی توصیف اور ان کے عشق کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

کاروان شوق را او منزل است
ماہمہ یک مشت خاکیم او دل است
(ص ۸۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی آپؐ کی ذات پاک عاشقوں کی منزل مقصود ہے اور بنی نوع انسان اگر بمنزلہ مشت خاک یعنی جسم ہیں تو آپؐ بمنزلہ دل ہیں۔

بادل من شوق بے پروا چہ کرد
بادۂ پرزور با میناچہ کرد
رقصد اندر سینہ از زورِ جنوں
تا ز راہ دیدہ می آید بروں
(ص ۸۷۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی آپؐ کے خرقۂ مبارک کے دیدار نے میرے دل کو جس جوش جنوں سے دوچار کیا اس کی بنا پر میرا دل سینے میں یوں رقص کرنے لگا کہ گویا آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک جائے گا۔

ان اشعار میں کاروانِ شوق اور شوقِ بے پرواہ نادر تراکیب ہیں۔

اور ارمغان حجاز کی ایک دوبیتی میں عبدالعزیز سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں :

تو سلطان حجازی من فقیرم
ولے درکشور معنی امیرم
جہانے کوز تخم لاالہ رست
بیا بنگر بآغوش ضمیرم
(ص ۹۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے ابنِ مسعود تو حجاز کا حکمران ہے اور میں فقیر ہوں لیکن جہاں تک اسلام کی حقیقت سے آگہی کا تعلق ہے تو فقیر ہے اور میں امیر ہوں کیونکہ وہ جہان جو توحید الٰہی کے عقیدے اور اس کے اقتضاء پر عمل کرنے سے پیدا ہوتا ہے میرے دل میں بخوبی جلوہ گر ہے۔

ارمغان حجاز کی ایک اور دوبیتی میں مردِ مسلمان کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

نکو میخوان خط سیمائے خودرا
بدست آور رگ فردائے خود را
چومن پا در بیابانِ حرم نہ
کہ بینی اندرو پہنائے خودرا

(ص ۹۶۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مسلمان تو اپنی تخلیق کی غایت پر غور کر اور اپنی خودی کی تربیت کر کے اپنی زندگی کو کامیاب بنا۔ اور میری طرح دینی روش زندگی اختیار کر تا کہ تو اپنی وسعت اور قدر و قیمت سے آگاہ ہو سکے۔

ان دو بیتوں میں آغوش ضمیر اور رگِ فردا جیسی تراکیب علامہ اقبال کی نُدرت کوشی کی دلیل ہیں۔

☆☆☆

علامہ اقبال کے تشبیہات و استعارات بھی ان کے خیالات اور احساسات کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں بلکہ فارسی شاعری سے وراثت میں ملنے والے اکثر تشبیہات و استعارات جن میں بمرورِ ایّام کسی خیال کی کماحقہ ترجمانی کی صفت باقی نہ رہی علامہ اقبال ان کو بھی نئی معنوی زندگی بخشتے ہیں اور ان کا سینہ چیر کر ان میں نئے معنی سمو دیتے ہیں مثلاً اسرار خودی میں فرماتے ہیں :

مشتِ خاک خویش را از ہم مپاش
مثل مہ رزقِ خود از پہلو تراش

(ص ۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں رزق کے حصول کے لئے ذاتی جدوجہد کے مفہوم کو چاند کی مثال سے واضح کیا گیا ہے جو اپنا پہلو کاٹ کاٹ کر اپنی روزی کا ساز و سامان کرتا ہے۔

اسرار خودی کا ایک اور شعر ہے :

غافل از حفظ خودی یکدم مشو
ریزۂ الماس شو شبنم مشو

(ص ۵۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں انسان کو استعارۂ شبنم کے قطرے کی بجائے ریزۂ الماس بننے کی تلقین کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایسا صرف حفظ خودی کے نتیجے میں ہی ممکن ہے رموز بے خودی میں فرماتے ہیں :

آفتاب استی یکے درخود نگر
از نجوم دیگراں تابے مخر

(ص ۱۶۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں مردِ مسلمان کے لئے سورج کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے جو روشنی کے لئے سیاروں کی مانند دیگر ستاروں کا محتاج نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی تابندگی کو خود جنم دیتا ہے رموزِ بے خودی کا ایک اور شعر ہے :

در جہاں مثل حباب اے ہوشمند
راہِ خلوت خانہ بر اغیار بند

(ص ۱۶۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

اس شعر میں انسان کو بلبلے سے تشبیہ دی گئی ہے جو اندر سے خالی ہوتا ہے لیکن اس میں اندر جانے کا راستہ نہیں ہوتا گویا وہ ایک خلوت خانہ ہوتا ہے اور اس کی اس خوبی کے حوالے سے انسان کو بھی اپنی ذات کے دروازے غیروں پر بند کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

پیامِ مشرق کی ایک دوبیتی میں انسان کو ایک موج سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا وجود ذوق نمود اور ابھرنے کی قوت پر ہی موقوف ہے لیکن اگر اس سے ابھرنے کی صفت زائل ہو جائے تو وہ سمندر میں مل کر فنا ہو جائے گی :

چہ پرسی از کجائیم چیستم من
بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موج بیقرارم
اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

(ص ۲۲۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیام مشرق کے ایک اور شعر میں انسان کو نیلے آسمان میں منزل کی تلاش میں تیزی سے محوِ سفر ستارے سے تشبیہ دی گئی ہے ؟

خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم
در نیلگوں یمے بتلاش کنارہ ایم

(ص ۳۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم کے ایک شعر میں انسان کے لئے جرۂ شاہین کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے اسے مرغان سرا کی صحبت سے دوری اختیار کرنے کو کہا گیا ہے :

جُرہ شاہینی بمرغان سرا صحبت مگیر
خیز و بال و پر کشا پروازِ تو کوتاہ نیست

(ص ۷۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جبکہ ایک اور شعر میں اسے شعلہ کی مانند خس وخاشاک کو جلادینے کا درس دیا گیا ہے۔

شعلۂ می باش و خاشا کے کہ پیش آید بسوز
خاکیاں را در حریم زندگانی راہ نیست

(ص ۷۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ میں ایک جگہ مولانا جلال الدین رومی کے لئے عقاب کی تشبیہ استعمال کی گئی ہے جو مہر وماہ کا شکاری بھی ہے اور نہ سپہر کے طواف میں مشغول بھی۔

چون عقاب افتد بصید ماہ و مہر
گرم رو اندر طواف نہ سپہر

(ص ۶۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ کے ایک اور شعر میں خدا کی حضوری کے نتیجے میں سالک کے لئے ہر ذرے کو طور قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسے ہر ذرے میں جلوۂ حق نظر آنے لگتا ہے :

باحضوراش ذرہ ھا مانند طور
بے حضور او نہ نور و نے ظہور

(ص ۶۲۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

مثنوی پس چہ باید کرد ای اقوامِ شرق کے ایک شعر میں مردِ حُر کو اونٹ سے تشبیہ دی گی ہے۔

مردِ حُر چون اشتراں بارے برد
مردِ حُر بارے بُرد خارے خورد

(ص ۸۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

جبکہ ایک اور شعر میں مردِ مسلمان کو عورتوں کی طرح بدن پر اترانے کی بجائے مردوں کی سی صفات اپنانے کو کہا گیا ہے :

فکرِ جاں کن چون زنان بر تن متن
ہمچو مرداں گو ے درمیدان فگن

(ص ۸۶۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ارمغان حجاز کی ایک دوبیتی میں اپنے مقام کو پانے والی قوم کی تب و تاب کو اس تلوار سے تشبیہ دی گئی ہے جو نیام سے

باہر ہو۔

خنک آن ملتے بر خود رسیدہ
ز درد جستجو نا آرمیدہ
درخش او تہ این نیلگوں چرخ
چو تیغ از میان بیرون کشیدہ
(ص ۹۹۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

جبکہ ایک اور دوبیتی میں اپنے آپ کو استعارۃً صبح بہار کا اولین لالہ قرار دیا گیا ہے جو اپنے پہلو میں پھولوں کے سینکڑوں قافلے لئے ہوئے ہے :

نخستین لالۂ صبح بہارم
پیا پے سوزم از داغے کہ دارم
بچشم کم مبیں تنہائیم را
کہ من صدکارواں گل در کنارم
(ص ۹۶۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

لیکن علامہ اقبال کے تشبیہات واستعارات کے حوالے سے ایک بات بے حد اہم ہے کہ ان میں سے بیشتر علامات کی صورت اختیار کر گئے ہیں بلکہ تشبیہات ان کے ہاں کم اور علامات کا استعمال زیادہ ہے اور اقبال کی شاعرانہ عظمت وبزرگی کا راز بڑی حد تک اسی میں مضمر ہے۔



کلامِ اقبال میں تلمیحات کا سلسلہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ ان سے علامہ کے مخصوص نظریات کی ترجمانی یا تائید ہوتی ہے۔ تلمیحات کا ذخیرہ یوں تو روایات کی صورت میں ہر شاعر کے سامنے اس کی علمی استعداد کے مطابق موجود ہوتا ہے لیکن شاعر کی عظمت اور اس کی فنکاری کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ اسکو نئے رنگ اور نئے پہلو کے ساتھ اپنے کلام کا جزو بنائے۔ تلمیحات کو نئے اور دوسروں سے مختلف رنگ میں پیش کرنے کی یہ کوشش اقبال کے ہاں غیر شعوری نہیں بلکہ شعوری ہے اس سلسلے میں ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو :

بہ ہر زمانہ بہ اسلوب تازہ می گویند
حکایت غمِ فرہاد و عشرت پرویز
(ص ۹۳۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی فرہاد کے عشق صادق اور پرویز کی ہوسناکی کا اظہار ہر زمانے میں نت نئے طریقوں سے ہوتا رہتا ہے۔

علامہ اقبال اس حکایت غم فرہاد اور عشرت پرویز کو کس کس رنگ میں پیش کرتے ہیں ان اشعار میں دیکھئے:

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشۂ دارد
خراشد سینہ کہسار و پاک از خونِ پرویز است
(ص ۴۰۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عشق اگرچہ بے سروسامان ہے لیکن پرویز کا خون کرنے کی بجائے پہاڑ کا سینہ چیر دینے والا تیشہ رکھتا ہے۔

بگواز من بہ پرویزانِ این عصر
نہ فرہادم کہ گیرم تیشہ در دست
زخارے کو خلد در سینۂ من
دلِ صد بیستوں را می توان خست
(ص ۱۰۱۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میری طرف سے اس زمانے کے اسلام دشمن عناصر سے کہہ دو کہ میں فرہاد نہیں جو کسی عورت کی خاطر تیشہ ہاتھ میں لئے پہاڑ کاٹنے پر آمادہ ہو جائے گا یعنی کسی مادی فائدے کے لئے تمہارے اطاعت کرے گا بلکہ میں اس عشق کی بدولت جو کانٹا بن کر میرے سینے میں چبھ رہا ہے یا جس نے میرے سینے میں ہنگامے برپا کر رکھے ہیں سینکڑوں پہاڑوں کو کاٹ سکتا ہوں۔

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد، کوہکن ہست
(ص ۳۸۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی شیریں کے ناز (اقتدار) کا خریدار اگر خسرو (زار) نہیں ہوگا تو کوہکن (لینن) ہوگا۔ گویا عوام ہمیشہ غلام رہیں گے خواہ شاہزادہ ان پہ حکومت کرے یا مزدور زادہ۔

اگرچہ تیشۂ من کوہ را ز پا آورد
ہنوز گردش گردوں بکام پرویز است
(ص ۳۶۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگرچہ میں نے اپنے تیشے سے فرہاد کی طرح پہاڑ کاٹ کر رکھ دیا بالفاظ دیگر ملوکیت کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن زمانے کی گردش ابھی تک پرویز یعنی سرمایہ دار کا ساتھ دے رہی ہے۔

دور پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز
نعمت گم گشتۂ خود را ز خسرو بازگیر
(ص ۳۶۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مزدور اٹھ ملوکیت کا دور ختم ہو گیا تو اپنی کھوئی ہوئی نعمت یعنی حکمرانی کو خسرو پرویز سے واپس لے لے۔

کوہکن تیشہ بدست آمدو پرویزی خواست
عشرت خواجگی و محنت لالائی رفت
(ص ۳۶۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی مزدور (کوہکن) نے انقلاب کا علم بلند کیا اور غلامی کی بجائے حکومت (پرویزی) کا آرزومند بنا اور بادشاہوں کے عیش اور مزدوروں کی غلامی کا زمانہ ختم ہوا۔

در عشق و ہوسنائی دانی کہ تفاوت چیست ؟
آن تیشۂ فرہادے، این حیلۂ پرویزے
(ص ۳۳۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مخاطب تو جانتا ہے کہ عشق اور ہوس میں کیا فرق ہے وہ فرہاد کا تیشہ ہے جو عاشق کے اندر ایثار اور قربانی کا رنگ پیدا کرتا ہے اور یہ پرویزی حیلہ گری ہے جو عاشق کو عیاری اور مکاری کا درس دیتی ہے۔

ان اشعار میں جہاں شاعر کے تنوع پسند اور ایک تلمیح کے جملہ پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاعر میں تلمیحات کو علامات کی صورت دے دینے کی قدرت موجود ہے اور یہ سلسلہ صرف ایک تلمیح تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ علامہ اقبال نے بعض دیگر تلمیحات کو بھی علامات کا درجہ بخشا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

در عجم گردیدم وہم در عرب
مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب
(ص ۸۴۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں نے عرب و عجم گھوم ڈالے لیکن ہر جگہ عاشقانِ مصطفیٰ نایاب اور پیروان ابولہب کی فراوانی دیکھی۔

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری
آن ہمہ جذبۂ کلیم این ہمہ سحر سامری
ضربِ قلندری بیار، سدِ سکندری شکن
رسم کلیم تازہ کن رونق ساحری شکن

(ص ۶۱۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی کلیمی جذبہ شانِ قلندری اور سکندری طنطنہ سامری جادو ہے لہذا تو قلندرانہ شان سے سکندرانہ رکاوٹوں کو توڑ ڈال یعنی طرح کلیمی سے جادو کی رونق کا خاتمہ کردے۔

امیر قافلۂ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری زکراری است

(ص ۴۶۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی تو قافلے کا امیر ہے اور ہمارے قبیلے میں حیدری کا لقب کراری کا وصف پید کرنے سے حاصل ہوتا ہے لہذا تو سخت کوشش اور مسلسل کوشش کو اپنا شیوہ بنا۔

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام
خون حسین باز دہ کوفہ و شام خویش

(ص ۴۰۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی تو اپنے کوفہ و شام کو حسینؓ کے خون سے سیراب کر کیونکہ عراق کی ریت آج بھی کسی کی قربانی کی منتظر ہے اور حجاز کی کھیتی آج بھی کسی کے خون کی پیاسی ہے۔

ہوس منزلِ لیلیٰ نہ تو داری و نہ من
جگر گرمئی صحرانہ توداری و نہ من

(ص ۳۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی یوں تو ہم دونوں الفتِ لیلیٰ کے مدعی ہیں لیکن مجنون کی طرح اس کے گھر کی خواہش اور صحرانوردی کا حوصلہ نہ تجھ میں ہے نہ مجھ میں۔ یعنی زبان سے ہم سب اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کو سربلند کرنے کے لئے تکلیف گوارا نہیں کرسکتے۔

دل و دین در گرو زہرہ و شانِ عجمی
آتش شوق سلیمی نہ تو داری و نہ من

(ص ۳۳۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ہم دونوں اپنے دل و دین عجمی حسینوں کے ہاں گروی رکھ چکے ہیں لیکن سلیمیٰ کے عشق کی آگ نہ تیرے دل میں بھڑک رہی ہے نہ میرے دل میں۔ بالفاظ دیگر ہم دونوں غیر اسلامی تصورات و عقائد کے پیرو ہیں اور اسلام کی محبت سے عاری ہیں۔

دگراز یوسف گم گشتہ سخن نتواں گفت

تپش خونِ زلیخانہ تو داری و نہ من

(ص ۳۳۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ہمیں گم گشتہ یوسف یعنی اسلام کی عظمت رفتہ کا ذکر کرنا زیب نہیں دیتا کیونکہ زلیخا کے خون کی گرمی یعنی اسلام کی محبت نہ تیرے دل میں موجزن ہے نہ میرے دل میں۔

بمتاع خود چہ نازی کہ بہ شہر دردمنداں

دل غزنوی نیرزد بہ تبسم ایازے

(ص ۳۲۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی تو اپنے کمال پر نازمت کر کیونکہ عاشقوں کی دنیا میں ایاز کے تبسم کے سامنے غزنوی کے دل کی کوئی قیمت نہیں۔

شے بہ میکدہ خوش گفت پیر زندہ دلے

بہ ہر زمانہ خلیل است و آتشِ نمرود

(ص ۳۱۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ایک رات خانقاہ میں مرشد کامل نے یہ نکتہ بیان کیا کہ تم یہ مت سمجھو کہ دنیا میں صرف ایک ہی خلیل اور ایک ہی نمرود گزرا ہے بلکہ ہر زمانے میں اس کے جانشین پیدا ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

سفالم را مئے اور جام جم کرد

درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد

خرد اندر سرم بتخانہ ریخت

خلیل عشق دیرم را حرم کرد

(ص ۲۰۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عشق الٰہی نے میری شخصیت کے سفال کو جام جم کی طرح منور کر دیا میری قطرے جیسی ذات میں اپنی ذات کے سمندر کی سی صفات پید کر دیں اور میرے دماغ کے بُت خانے کو حرم میں تبدیل کر دیا یعنی میرے دل میں دنیا کی بجائے اللہ کی محبت پیدا کر دی۔

خرد گفت او بچشم اندر نگنجد

نگاہِ شوق در امید و بیم است

نمی گردد کہن افسانۂ طور

کہ در ہر دل تمنائے کلیم است

(ص ۲۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عقل کا کہنا ہے کہ خدا کو آنکھوں کی مدد سے نہیں دیکھا جا سکتا جبکہ عشق انسان کو امید وبیم کی کشمکش سے دوچار رکھتا ہے۔ (اور اسی کشمکش کے نتیجے میں) دیدار الٰہی کی آرزو ہر دل میں موجود ہے لہذا طور کا افسانہ کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔

رزق خود را از کفِ دوناں مگیر
یوسف استی خویش را ارزاں مگیر

(ص ۸۵ اکلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی تو اپنا رزق کمینوں کے ہاتھ سے نہ لے۔ اور تو یوسف سے اپنے آپ کو کم قیمت نہ جان۔

گرچہ باشی مور و ہم بے بال و پر
حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

(ص ۸۵ اکلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی تیری حیثیت اگر بے بال و پر چیونٹی کی بھی ہو تو بھی تیرے لئے زیبا نہیں کہ اپنی ضرورت کسی صاحب اقتدار کے پاس لے جائے۔

از تمنا رقص دل در سینہ ھا
سینہ ھا از تاب او آئینہ ھا
طاقت پرواز بخشد خاک
خضر باشد موسیٰ ادراک را

(ص ۱۶ اکلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی آرزو ہی کی بدولت دل سینوں میں رقصاں رہتے ہیں اور اسی کی روشنی سے سینے آئینے بنتے ہیں آرزو خاک میں پرواز کی قوت پیدا کرتی ہے اور عقل کے موسیٰ کے لئے خضر کا درجہ رکھتی ہے۔

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

(ص ۹۷۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اگر تو اس درویش کی اس نصیحت پر کہ بتول کی مانند زمانے کی نگاہوں سے دور رہ تا کہ شبیر جیسا بیٹا آغوش میں لے سکے۔ عمل کرے گی تو ہزاروں امتوں کی فنا پر بھی تجھے فنا نہیں آئے گی۔

اس دوبیتی کے تیسرے مصرع میں بتول سے جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا کی طرف اشارہ ہے اور مخاطب دختر اسلام یا

مسلمان ہے اور چوتھے مصرعے میں شبیر سے حضرت امام حسینؑ کی طرف اشارہ ہے۔

زمانہ فتنہ ہا آوردو بگذشت
خساں را در بغل پرورد و بگذشت
دو صد بغداد را چنگیزیٔ او
چو گور تیر ختاں کرد و بگذشت
(ص ۹۹۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زمانے نے سینکڑوں فتنے اٹھائے اور سینکڑوں نااہلوں کو پروان چڑھایا اور اپنے ظلم و ستم سے سینکڑوں بغدادوں کو کھنڈر نما قبروں میں تبدیل کیا لیکن سب کچھ گزر گیا۔"



علامہ اقبال کے سبک کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ ان کے یہاں فکر و فن کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس دانائے راز نے اپنے جاندار اور حیات بخش فلسفے سے اپنی افسردہ اور شکست خوردہ ملت کو ایک نئی زندگی کا پیغام دیا اس کی اقدارِ زندگی کو دوبارہ زندہ کیا اس کو ایک نصب العین سے آشنا کیا اور اس نصب العین کے حصول کے لئے ایک منظّم ضابطۂ حیات پیش کیا مگر یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ انہوں نے اپنے پیغام کو حرف و صوت اور تخیل و نغمہ کے جس دلآویز قالب میں ڈھالا وہ کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے وہ دنیا کے ان عظیم شعراء میں سے ہیں جن کا کلام فلسفہ و شعر کی ہم آہنگی کا شاہکار ہے۔" (۱۸)

پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں :

"اقبال کا بڑا شاعرانہ کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عام انسانی تجربے کے دو ان مل عنصر لے کر ایک کو دوسرے میں منقلب کر دیا۔ تعقلات کی دنیا اور جذبات کی دنیا میں بظاہر کوئی میل نہیں ہے۔ ایک مدرک بہ عقل ہے، دوسری مدرک بہ حسیت۔ یہ نفس انسانی کے دو واضح طور پر علیحدہ کارخانے ہیں جن کی صنعت کے نمونے اپنی اپنی امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں۔ اقبال کا مواد ٹھوس، وزن دار بلکہ ثقیل تعقلات تھے لیکن جب اقبال نے انہیں بیان کیا تو وہ دہکتے ہوئے جذبات بن کر ہمارے سامنے آئے۔ تعقل اور جذبے کی دوئی کا مٹا دینا اقبال کے معجزاتِ سخن میں سے ہے۔" (۱۹)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"اقبال نے علم وحکمت اور شاعری کے درمیان رابطہ قائم کرتے ہوئے اس خیال کی عملی تردید کی کہ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں جمع نہیں ہو سکتی اُسی طرح شاعری اور علم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔"(۲۰)

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں :

"یقیناً اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں قطعی طور پر ایک واضح نظام فکر موجود ہے۔ ان کے فکر کا سراغ لگانے کے لئے نہ ان کے شعروں کو نچوڑنا پڑتا ہے اور نہ ان کے کسی خیال کی تاویل کی جاسکتی ہے ان کے ابتدائی کلام کو چھوڑ کر (جو ان کی مشقِ سخن کا دور ہے) ان کی پوری شاعری اس نظام فکر کے محور کے گرد گھومتی ہے اس کے باوجود اقبال نے فن شعر کے جمالیاتی مطالبات سے کبھی صرف نظر نہیں کیا۔ یوں مفکر شاعروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے کہ اتنی دوٹوک بات کہنے کے باوجود وہ شاعر ہی رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو اقبال کے کلام میں کہیں کہیں "خشکی" نظر آتی ہے وہ نہ تو فکر کی خشکی ہے اور نہ شعر کہتے ہوئے شاعری کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دینے کی "خشکی"۔ یہ "خشکی" اقبال کی "ڈکشن" سے قاری کی عدم واقفیت اور اقبال کے منفرد اندازِ بیان سے اجنبیت کی پیداوار ہوتی ہے۔"(۲۱)

علامہ اقبال اگرچہ شاعر محض نہ تھے کیونکہ فن بحیثیت فن کے کبھی علامہ اقبال کا بھی مقصود نہ رہا تھا بلکہ وہ ہمیشہ فن شاعری کے تقاضوں سے بے اعتنائی کا اعلان کرتے رہے۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۳ء کو خواجہ حسن نظامی کو تحریر فرماتے ہیں :

"آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے آپ کو شاعر تصور نہیں کرتا اور نہ کبھی بہ حیثیت فن کے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔"(۲۲)

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"شاعری میں لٹریچر بہ حیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں............ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں اس لئے کہ آرٹ غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔"(۲۳)

۷ اپریل ۱۹۲۲ء کو مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے یوں مخاطب ہوتے ہیں :

"میرے کلام کی مقبولیت محض فضل ایزدی ہے ورنہ اپنے آپ میں کوئی ہنر نہیں دیکھتا۔"(۲۴)

۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کو پھر سلیمان ندوی کو فنِ شاعری سے اپنی بے التفاتی کا یقین دلاتے ہیں :

"فن شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات وروایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے۔"(۲۵)

لیکن فن شاعری سے بے التفاتی اور لاتعلقی کے مکرر اظہار کے باوجود علامہ اقبال کے یہاں الفاظ و معانی ہم ردیف نظر آتے ہیں۔ اوران کی پیغام دوستی ان کی شاعری کے حسن کو کم کرتی دکھائی نہیں دیتی بلکہ ان کے قاری کے لئے یہ فیصلہ کٹھن ہو جاتا ہے کہ علامہ بطور ایک مفکر بلند تر ہیں یا بطور ایک شاعر۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

اسرارِ خودی میں اپنی ملت کی خودی سے ناآشنائی مرکز گریزی، ترک شعار ملت اور بے سر و سامانی پر انتہائی مؤثر الفاظ میں فرماتے ہیں :

بزم مسلم از چراغِ غیر سوخت
مسجدِ او از شرار دیر سوخت
از سوادِ کعبہ چون آہو رمید
ناوک صیاد پہلویش درید
شد پریشاں برگ گل چون بوئے خویش
اے زخودرم کردہ باز آسوئے خویش
ما کہ دربان حصار ملتیم
کافر از ترکِ شعار ملتیم
ساقئ دیرینہ را ساغر شکست
بزمِ رندانِ حجازی بر شکست
شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتہ تسبیح از زنار ساخت

(ص ۶۹، ۷۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی افسوس کہ مسلمان کی مجلس غیروں کے چراغ سے جل بجھی اور اس کی مسجد کو بُت خانے کی چنگاری نے راکھ کا ڈھیر

بنادیا۔ ہرن جب تک حرم کی حدود میں تھا کوئی اُسے نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جب وہ حرم کی حدوں سے باہر ہوا تو شکاری کے تیر نے اس کا پہلو چیر کر رکھ دیا۔ پھول کی پنکھڑیاں اس طرح بکھر گئیں جس طرح اس کی خوشبو بکھرتی ہے اے اپنی ذات سے بھاگے ہوئے پھر اپنی طرف لوٹ آ۔ کیا کبھی اس پر غور کیا کہ ہمارا مقام اور منصب کیا ہے؟ ہم ملت کے قلعے کے لئے محافظ وپاسبان مقرر ہوئے تھے۔ ہم نے قوی شعار اور شیوہ ترک کر دیا۔ اس لئے ایمان سے محروم ہو گئے تو ملت کی پاسبانی کا فرض کیونکر ادا کر سکتے ہیں؟ قدیم ساقی کا پیالہ ٹوٹ گیا اور شراب حجاز کے مستوں کی محفل درہم برہم ہو گئی۔ ہمارے مذہبی پیشواؤں کی حالت کیا ہے؟ وہ بتوں کے عشق میں اسلام ہار بیٹھے اور انہوں نے برہمنوں اور آتش پرستوں سے زنّار لے کر اپنی تسبیح کے لئے دھاگہ مہیا کیا یعنی ان کی اسلامیت غیروں کے شعائر وعقائد سے داغدار ہے۔

رموز بے خودی میں رحمۃ للعالمینؐ کے حضور سوز وساز اور عشق ونیاز کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ان الہام بخش اشعار کے ساتھ عرض حال کی ابتدا کرتے ہیں۔

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی
اے زمین از بارگاہت ارجمند
آسمان از بوسۂ بامت بلند
شش جہت روشن زتاب روئے تو
ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ این کائنات
فقر تو سرمایۂ این کائنات

(ص ۱۶۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی حضور والا آپؐ کا ظہور زندگی کا عہد شباب تھا اور آپؐ کا جلوہ زندگی کے خواب کی تعبیر تھا۔ حضورِ والا ہماری زمین نے صرف اس وجہ سے اونچا درجہ حاصل کر لیا کہ آپؐ کی بارگاہ سے شرف پایا۔ آسمان آپؐ کے لب بام کو چومنے کی بدولت سربلند ہوا۔ اس کائنات کا ہر پہلو آپؐ کے روئے مبارک کی چمک دمک سے روشن ہے ترک ہوں یا تاجیک ہوں یا عرب ہوں سب آپؐ کے غلام ہیں۔ اس کائنات کا رُتبہ صرف آپؐ کی بدولت اونچا ہوا اور اس کی دولت آپؐ کے فقر کے سوا کچھ نہیں۔

پیام مشرق میں (نقش فرنگ) پیام کے آخری بند میں زندگی کے ارتقائی عمل، مسلسل حرکت وانقلاب اور ایسے تابناک مستقبل کا ذکر ہے جس میں ہر زشت اور فرسودہ شے کا وجود مٹنے والا ہے اور وہ حقائق جن کے لئے آنکھیں ترستی ہیں بے نقاب ہونے والے ہیں اس بند میں افکاریوں نغمہ وشعر میں ڈھلے ہیں:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود

این مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود
آنچہ بود است و نباید زمیان خواہد رفت
آنچہ بائیست و نبود است ہمان خواہد بود
عشق از لذت دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاق نمود است و عیاں خواہد بود
آن زمینے کہ برو گریہ خونین زدہ ام
اشک من در جگرش لعل گراں خواہد بود
(ص ۳۶۲، ۳۶۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی ایک بہتی ہوئی ندی کی مانند ہے جو اسی طرح بہتی رہے گی اور یہ پرانی شراب جوان ہے اور ہمیشہ جوان رہے گی جو ہے لیکن نہیں ہونا چاہئے وہ معدوم ہو جائے گا اور جو نہیں ہے لیکن ہونا چاہئے وہ موجود ہو جائے گا۔ عاشق اگر اشتیاق دید کی شدت سے سراپا نظر بن گیا ہے۔ تو معشوق بھی اپنے حسن و جمال کی نمائش کے لئے ظاہر ہو کر رہے گا۔ وہ زمین جس پر میں نے اپنے خونین آنسو بہائے ہیں۔ میرے آنسو اس کے جگر میں جا کر قیمتی موتی بن جائیں گے۔

زبور عجم کی ایک غزل میں ذات خداوندی کے حضور میں انسان کی لامحدود عظمت کا مضمون یوں تغزل میں ڈوبا ہوا ہے۔

اے خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر
ذرۂ در خود فرو پیچد بیابانے نگر
حسن بے پایاں درونِ سینۂ خلوت گرفت
آفتاب خویش را زیر گریبانے نگر
بر دل آدم زدی عشق بلا انگیز را
آتشِ خود را بآغوش نیستانے نگر
شویداز دامان ہستی داغہائے کہنہ را
سخت کوشی ہائے این آلودہ دامانے نگر
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر
(ص ۴۵۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مہر و ماہ کے خالق اس پریشان حال آدم خاکی کو دیکھ اور اس بیابان کو دیکھ جس میں یہ ایک ذرے کی مانند پیچ و تاب

کھا رہا ہے۔ تیرے حسن بے پایاں نے ہمارے سینے کے خلوت خانے میں جگہ پائی۔ دیکھ کہ تیری ذات کا سورج کس طرح ہمارے گریبان کے اندر دل کی شکل میں موجود ہے۔ تو نے خود ہی انسان کے دل میں فتنے اٹھانے والا عشق پیدا کیا۔ اب نیستان کی آغوش میں اپنی لگائی ہوئی آگ دیکھ اس آلودہ دامن کی سخت کوشی ملاحظہ کر کہ دامنِ ہستی سے پرانے داغ دھو رہا ہے۔ اور اس ذرۂ ناچیز یعنی انسان کا بیابان کی تعمیر کا شوق دیکھ کہ ہماری مٹی نئے آسمان کی تشکیل کی خواہاں ہے۔

جاوید نامہ میں فلکِ زہرہ میں مہدی سوڈانی کی زبان سے علامہ نے دنیائے عرب کو بیدار ہونے کا حیات بخش پیغام دیا ہے ان کو ان کی عظمت دیرینہ کی یاد دلائی ہے اور ان کی غیرت کو للکارا ہے یہ پیغام اپنے سوز و ساز، حسن تخیل اور لطفِ بیان کے اعتبار سے جاوید نامہ کے شاہکاروں میں سے ہے۔

گفت اے روحِ عرب بیدار شو
چون نیاگاں خالقِ اعصار شو
زندہ کُن در سینہ آن سوزے کہ رفت
در جہان باز آور آں روزے کہ رفت
زندگانی تا کجا بے ذوق سیر
تا کجا تقدیر تو در دست غیر
از بلا ترسی، حدیث مصطفیؐ است
مرد را روز بلا روز صفاست
(ص ۶۸۵، ۶۸۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اس نے کہا کہ اے عرب کی روح بیدار ہو جاؤ۔ اپنے آباء کی طرح کئی زمانوں کے خالق بن جاؤ۔ اپنے سینے میں سوزِ سابق پیدا کرو اور اس دنیا میں زمانۂ گذشتہ واپس لاؤ۔ شوق سفر کے بغیر کب تک زندگی گزارو گے۔ اور کب تک اپنی تقدیر کو دوسروں کے ہاتھوں میں دیے رہو گے۔ تم مسلمان ہو کر مصیبت سے ڈرتے ہو۔ کیا تم نے سرکارِ دو عالمؐ کی یہ حدیث نہیں سنی کہ مسلمان کے لئے مصیبت کا دن تزکیۂ نفس کا دن ہوتا ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں فرماتے ہیں کہ فرنگ کے تاجرانہ استعمار نے کیا کیا ستم نہیں ڈھائے ہیں۔ اس نے ایشیا کا کیا کیا اور کس کس طرح استحصال نہیں کیا ہے۔ مشرق کا فرض ہے کہ وہ اس تاجرانہ لوٹ کھسوٹ کا سدِباب کرے۔ اپنے وسائل پر تکیہ کرے اور اپنے آپ کو مغرب سے بے نیاز کر دے۔

آنچہ از خاک تو رست اے مردِ حُر
آن فروش و آن پپوش و آن بخور
آن نکو بینان کہ خود را دیدہ اند

خود گلیم خویش را بافیدہ اند

وائے آن دریا کہ موجش کم تپید

گوہر خود در ز غواصان خرید

(ص ۸۴۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے مردِ حُر تیرے ملک میں جو کچھ پیدا ہو رہا ہے اُسی کو فروخت کر، اُسی کو زیب تن کر اور اُسی کو اپنی خوراک بنا کیونکہ وہ خوش بین حضرات جنھوں نے اپنا آپ پہچانا ہے انہوں نے اپنا بوریا خود بنایا ہے لیکن افسوس اس دریا پر جس کی موجیں تڑپ سے عاری ہیں اور جو اپنے ہی موتیوں کو تیراکوں سے خرید رہا ہے۔

ڈاکٹر کچکینہ کاظمی اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے لکھتی ہیں :

"مطالب فلسفی شعر را بشکل خستہ کنندہ ای در می آورد اما اقبال مطلب فلسفی و عرفانی را باشیرینی تغزل چنان آمیزش می دھد کہ خوانندہ بدون این کہ متوجہ باشد تحت تاثیر کلام او قرار می گیرد۔ خودش گفتہ است :۔

ز شعر دلکش اقبال می توان دریافت

کہ درسِ فلسفہ می داد و عاشقی ورزید (۲۶)

☆☆☆

علامہ اقبال کے سبک کی ایک اور انفرادیت ان کا بلند بانگ اور زور دار لہجہ ہے جو اردو کے ساتھ ساتھ ان کی فارسی شاعری کی بھی جان ہے۔

پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں :

اقبال کی امتیازی خصوصیت ان کے اندازِ بیان کا شکوہ ہے.......... ہمارے اور کسی شاعر کے لب و لہجے میں یہ طنطنہ نہیں ملتا۔ قدرت کی آوازوں میں اگر کسی آواز سے اقبال کے انداز تکلم کی مثال دی جاسکتی ہے تو وہ بادل کی گرج ہے۔ یہ پُر شکوہ اندازِ بیان اقبال کے پر شکوہ مضامین کی قامت پر اس طرح راست آتا ہے کہ ان مضامین کا دوسرے الفاظ میں بیان ہونا تصور میں نہیں آسکتا۔ اس اندازِ بیان کا سرچشمہ اقبال کی بلندیِ نظر اور جوشِ ایمان ہے۔" (۲۷)

علامہ اقبال کا شکوہِ بیان ان کی شاعری کی کسی ایک صنفِ سخن تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام اصنافِ سخن میں نمایاں ہے

مثلاً غلامی کی مذمت میں مثنوی بندگی نامہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

شورہ بوم از نیش کژدم خار خار
مورِ او اژدر گز و عقرب شکار
صرصر او آتشِ دوزخ نژاد
زورق ابلیس را بادِ مراد
آتشے اندر ہوا غلطیدۂ
شعلۂ در شعلۂ پیچیدۂ
آتشے از دودِ پیچاں تلخ پوش
آتشے تندرغو و دریا خروش
در کنارش مارھا اندر ستیز
مارھا باکفچہ ھائے زہر ریز
شعلہ اش گیرندہ چون کلبِ عقور
ہولناک و زندہ سوز و مردہ نور
درچنین دشت بلا صد روزگار
خوشتر از محکومئ یک دم شمار

(ص ۳۷۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی غلام دھرتی ایسی شورہ زار ہے جو بچھو کے ڈنک سے اذیت میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جس کی چیونٹی اژدھوں اور بچھوؤں کو کاٹ کھاتی ہے۔ اس کی تیز ہوا دوزخ کی اس آگ کی مانند ہے۔ جو ابلیس کی کشتی کے لئے انتہائی موافق ہے۔ وہ آگ جو ہوا میں لوٹ پوٹ ہو رہی ہے اور پیچ در پیچ شعلوں پر مبنی ہے۔ جو ناگوار دھوئیں کے مرغولوں میں لپٹی ہوئی ہے اور بجلی کی تیز کڑک اور جو شیلے دریا کی مانند ہے۔ اس کے پہلو میں زہر اگلنے والے پھنوں کے مالک سانپ لڑنے میں مصروف ہیں اس کا شعلہ باؤلے کتے کی طرح جکڑ لیتا ہے وہ ہولناک ہے، زندہ جلا دینے والا اور مردہ نور ہے تو مصیبت کے ایسے دشت میں سینکڑوں زمانوں کو ایک لمحے کی غلامی پر فائق گردان۔

جاوید نامہ میں زمزمۂ انجم کے عنوان سے چند غزلیہ اشعار ملاحظہ ہوں :

عقل تو حاصل حیات عشق تو سرِ کائنات
پیکرِ خاک خوش بیا این سوئے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری از تو رقیب یکدگر
از پئے یک نگاہ تو کش مکش تجلیات

در ره دوست جلوه ہاست تازہ بتازہ نو بنو
صاحب شوق و آرزو دل نہ دہد بکلیات
صدق و صفاست زندگی نشو ونماست زندگی
تا ابداز ازل بتاز ملک خداست زندگی
(ص ۶۱۵ کلیات اقبال فارسی)

یعنی اے پیکر خاکی تیری عقل زندگی کا حاصل ہے او تیرا عشق کائنات کی حقیقت ہے ہم تجھے مادی دنیا کے اس طرف سیاحت کے لئے آنے پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ تیری وجہ سے زہرہ، ماہ اور مشتری تمام اجرام فلکی میں باہمی رقابت پیدا ہو گئی ہے کیونکہ تو پیکر خاکی ہوتے ہوئے اپنے کمالات باطنی کے سبب کائنات کا محبوب ہے اور ان اجرام فلکی پر ہی کیا موقوف ہے تیرا مقام تو اس قدر بلند ہے کہ تیری وجہ سے باری تعالیٰ کی تجلیات میں کش مکش پیدا ہو گئی ہے کیونکہ ہر تجلی یہ چاہتی کہ تیری نگاہ پہلے اس پر پڑے۔ محبوب کی راہ میں ہر لحظہ نئے نئے جلوے نظر آئیں گے لہذا تو ہر جلوے سے لطف اندوز ہونے کے لئے تیار رہ کیونکہ عاشق اجمال سے مطمئن نہیں ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ تو اجمال سے مطمئن ہو جائے زندگی دراصل صدق و صفا کا دوسرا نام ہے اسی لئے زندگی میں نشو و نما یعنی ارتقاء کا قانون جاری ہے۔

زبورِ عجم کی ایک نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں :

میر و سلطان نردباز و کعبتین شان دغل
جانِ محکوماں زتن بردند و محکوماں بخواب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب
باضعیفاں گاہ نیروی پلنگاں می دہند
شعلہء شاید بروں آید زفانوس حباب
انقلاب
انقلاب اے انقلاب
(ص کلیات اقبال فارسی)

یعنی بادشاہ نردباز ہیں اور ان کے کعبتین دھوکا باز ہیں۔ کیونکہ انھوں نے محکوموں کے بدن سے جان بھی نکال لی ہے پھر بھی وہ خوابیدہ ہیں۔ لیکن کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کمزوروں کو چیتوں کی سی طاقت عطا کر دی جاتی ہے۔ اس امید پر کہ شاید فانوس جیسے بلبلے کی مانند اپنی ذات کے خلوت کدے میں گم انسان چنگاریاں اگلنے لگیں۔

ابلیس خاکی اور ابلیس ناری کے عنوان کے تحت ارمغان حجاز کی ایک دوبیتی ملاحظہ ہو :

فساد عصر حاضر آشکار است

سپہر از زشتیٔ اوشرمسار است

اگر پیدا کُنی ذوق نگاہے

دو صد شیطان ترا خدمت گزار است

(ص ۱۰۰۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عصر حاضر کی خرابیاں ہر شخص کے سامنے ہیں اور ساری کائنات ان کی وجہ سے شرمندہ ہے اندریں حالات اگر تو ذوق نگاہ پیدا کرلے تو عصرِ حاضر کے سارے شیاطین تیرے فرمانبردار بن سکتے ہیں۔

پیام مشرق میں حقیقت کے عنوان کے تحت ایک قطعہ ملاحظہ ہو جس میں فلسفے کا ایک قیمتی نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی شے کی حقیقت سے آگاہی اس وقت ہو سکتی ہے جب طالب حقیقت اس شے سے ہم آغوش ہو جائے یا واضح تر الفاظ میں خود وہی شے بن جائے۔

عقاب دور بین جوئینہ را گفت

نگاہم آنچہ می بیند سراب است

جوابش داد آن مرغِ حق اندیش

تومی بینی ومن دانم کہ آب است

صدائے ماہی آمد از تہ بحر

کہ چیزے ہست وہم در پیچ و تاب است

(ص ۲۷۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی عقاب نے آبی پرندے سے کہا کہ میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ سراب ہے۔ آبی پرندے نے جواب دیا کہ تجھے سراب دکھائی دیتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ سراب نہیں آب ہے۔ مچھلی نے ان دونوں کی گفتگو سنی تو پانی کے اندر سے جواب دیا۔ یہ نہ سراب ہے نہ آب بلکہ ایک شے ہے جس میں ہر لحہ تلاطم برپا ہے۔

اور زبور عجم کی ایک مثلث کا پہلا بند ملاحظہ ہو :

مانند صبا خیز و وزیدن دگر آموز

دامانِ گل و لالہ کشیدن دگر آموز

اندر دلک غنچہ خزیدن دگر آموز

(ص ۴۸۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی صبا کی طرح اٹھ اور چلنا سیکھ گل و لالہ کا دامن چاک کرنا سیکھ اور غنچے کے دل میں داخل ہونا سیکھ۔

موسیقیت علامہ اقبال کی شاعری کا ایک اہم جزو ہے اور بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ فارسی شاعری کی تاریخ میں موسیقی کی یہ سحر آفرین اور وجد انگیز کیفیت جو موضوع کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہے بہت کم شاعروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ یہ موسیقی اُس جذبۂ عشق و مستی کی دی ہوئی ہے جو شاعر کی روح میں موجزن ہے اور شاعر کے لطیف جمالیاتی ذوق اور شعورِ نغمہ نے اس میں اور زیادہ تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے ظاہری قالب کے ساتھ ساتھ ان کا فکر بھی پڑھنے والے کو وجد و سرور کی ایسی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے جو حرکت و عمل کی ترغیب کا باعث بنتی ہے۔

اسرارِ خودی میں فکر اور جذبے کا خلوص اور قوت و مستی اور موسیقی کا دلکش امتزاج ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ اے ساقی! اٹھ اور میرے پیالے میں شراب ڈال۔ زندگی کے رنج و غم میرے دل سے دور کر دے۔ مجھے وہ رواں دواں شعلہ وہ آتشِ سیال چاہئے جس کی اصل زمزم ہے۔ یہی وہ شے ہے کہ اگر ایک بے نوا فقیر بھی اس کا پرستار بن جائے تو جمشید کا درجہ حاصل کر لے گا۔ اُٹھ اور میرے پیالے میں خالص شراب ڈال دے اور میری فکر کی رات پر چاندنی بکھیر دے یعنی اسے نور سے جگمگا دے تا کہ میں گم کردہ راہوں اور بے مقصد تگ و دو کرنے والوں کو منزلِ مقصود کی طرف لے چلوں۔ اُن کی تگ و دو کو نتیجہ خیز بناؤں اور نگاہوں میں بے تابی کا ذوق پیدا کروں۔ شعر و سخن کے مال کی قیمت بڑھاؤں اور اپنے آنسوؤں کے موتی بھی اس میں شامل کر دوں۔

ساقیا برخیز و مے درجام کُن
محو از دل کاوشِ ایّام کُن
شعلۂ آبی کہ اصلش زمزم است
گر گدا باشد پرستارش جم است
خیز و در جامم شراب ناب ریز
بر شب اندیشہ ام مہتاب ریز
تاسوی منزل کشم آوارہ را
ذوقِ بے تابی دہم نظارہ را
قیمتِ جنسِ سخن بالا کنم
آبِ چشمِ خویش درکالا کنم

(ص ۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

رموزِ بے خودی میں بھی فکر کی لطافت و رعنائی اور موسیقی کی پُر کیف لے شاعری کی تاثیر میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے

فرماتے ہیں کہ اے ملتِ اسلامیہ ! کیا تجھے قرآن مجید کی وہ آیت معلوم نہیں جس میں تجھے اُمتِ عادل کا خطاب دیا گیا۔ زمانے کے چہرے کی رونق اور تازگی تیرے ہی دم سے ہے تو اس دنیا میں تمام قوموں کے لئے گواہی دینے والی ہے۔ نکتہ شناسوں کو دعوت عام دے اور امّی نبی کے علوم سے آگاہ کر۔ وہ امّی جس کی گفتگو قرآنی ارشاد کے مطابق نفس کی خواہشات سے پاک تھی اور جو کچھ اس کی زبان مقدس پر جاری ہوتا تھا وحی کے ذریعے سے پہنچا ہوا آسمانی پیغام تھا۔ وہ امّی جس کے ارشادات ''ماغویٰ'' کی شرح تھے یعنی ان میں بے راہ روی کی کوئی بات نہ تھی۔ اُس امّی نبی نے کائنات کی نبض اپنے دستِ مبارک میں لی تو زندگی کی پختگی کے تمام بھید کھول کر رکھ دیئے۔ اس چمن میں لالوں کی قبا پر جتنی آلودگیاں پُرانے زمانے سے چھائی ہوئی تھیں ان سب کو دھو کر صاف کر دیا یعنی اس دُنیا میں انسانوں نے گمراہی اور نامرادی کے جتنے منصوبے سوچے اور اختیار کئے ان سب کو ختم کر کے رکھ دیا۔ ہدایت کو گمراہی سے، سعادت کو نامرادی سے، نور کو ظلمت سے الگ کر دیا اور کسی کے لئے دونوں میں تمیز مشکل نہ رہی۔ اس دنیا میں زندگی اس نبی کے دین سے وابستہ ہے اور یاد رکھو کہ اس کی شریعت اور اس کے مقرر کئے ہوئے قاعدوں کے بغیر جینا ممکن ہی نہیں۔ اے ملت ! اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن مجید تیرے پاس ہے اُس کے نور سے فائدہ اٹھا اور اُس پر عمل پیرا ہو جا۔

می ندانی آیۂ ام الکتاب
اُمت عادل ترا آمد خطاب
آب و تابِ چہرۂ ایام تو
در جہاں شاہد علی الاقوام تو
نکتہ سنجان را صلاے عام دہ
از علوم اُمیے پیغام دہ
اُمیے پاک ازہویٰ گفتارِ او
شرحِ رمزِ ماغویٰ گفتارِ او
تا بدست آورد نبضِ کائنات
وانمود اسرار تقویم حیات
از قباے لالہ ھاے این چمن
پاک شُست آلودگیھاے کہن
در جہان وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بآئینش حیات

(ص ۱۳۹، ۱۴۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

پیامِ مشرق میں بھی موسیقیت اور نغمگی کا عنصر علامہ اقبال کے فکر و جذبے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر شاعری میں سحر آفریں تاثیر کا باعث بنتا ہے مثلاً سرودِ انجم کے عنوان سے ایک نظم حرکت اور جستجو کی مظہر ہے اور اس رعایت سے تند و تیز موسیقی کی حامل ہے فرماتے ہیں ہماری ہستی نظام کی پابندی پر موقوف ہے۔ ہماری مستی ہماری حرکت پر منحصر ہے اور ہمارا منزلِ مقصود سے ناآشنا سفر ہماری ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی کا ضامن ہے۔ ہم آسمان کی بلندیوں سے حوادثِ کائنات کا انتہائی اطمینان سے نظارہ کرتے ہوئے گردش پیہم میں مصروف ہیں :

ہستی ما نظامِ ما

مستیٔ ما خرامِ ما

گردشِ بے مقامِ ما

زندگیٔ دوامِ ما

دورِ فلک بکامِ ما

مے نگریم و مے رویم

اس کائنات میں ہر لحظہ نئے نئے مظاہر جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں اور نت نئی اشیاء عالمِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ یہاں ہر گھڑی فساد کا عالم برپا ہے۔ مخلوقات پیدا ہوتی رہتی ہیں اور فنا کے گھاٹ اُترتی رہتی ہیں۔ ہر وقت موجودات میں تصادم واقع ہوتا رہتا ہے۔ ہم اس دنیا کو جو زمان و مکان کے طلسم میں گرفتار ہے اور اس کے حوادث کو جو زمان و مکان میں واقع ہوتے رہتے ہیں دیکھتے ہیں اور محوِ سفر ہیں۔

جلوہ گہ شہود را

بتکدۂ نمود را

رزم نبود و بود را

کشمکشِ وجود را

عالمِ دیر و زود را

مے نگریم و مے رویم

اس دنیا میں ہر وقت نئے حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں جنگ و جدل کا ہنگامہ برپا ہے تو کہیں آزمودہ کاروں کی کوتاہیاں سامنے آرہی ہیں۔ کوئی تخت نشین ہو رہا ہے تو کوئی تختۂ دار پر چڑھ رہا ہے۔ آج جو شخص حکمران ہے کل وہی تخت و تاج سے محروم ہو کر جلاوطنی کی ذلت برداشت کر رہا ہے۔ ہم دُنیا کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور مصروفِ سفر ہیں۔

گرمیٔ کارزار ھا

خامیٔ پختہ کارھا

تاج و سریر و دارھا

خواریٔ شہر یارھا

بازیٔ روزگار ھا

مے نگریم وے رویم

۱۹۱۷ء میں ہماری آنکھوں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ زارِ روس جو کروڑوں انسانوں پر حکومت کرتا تھا یک گردشِ چرخ تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا اور اس کو اور اس کے خاندان کو اُسی کی رعایا نے گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ بالفاظِ دگر بادشاہ حکومت سے محروم ہو گیا اور رعایا اس کی غلامی سے آزاد ہو گئی۔ نہ زارِ روس باقی رہا نہ قیصر جرمنی۔ بالفاظ دگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ملوکیت کا دور ختم ہو گیا اور انسان اُن بتوں کی پرستش سے آزاد ہو گیا۔

خواجہ ز سروری گذشت

بندہ ز چاکری گذشت

زاری و قیصری گذشت

دورِ سکندری گذشت

شیوۂ بُت گری گذشت

مے نگریم و مے رویم

حضرت انسان کی زندگی بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ اگرچہ اس کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے جو حرکت اور شعور دونوں سے معریٰ ہے اس کے باجود وہ ہر وقت ایک نیا ہنگامہ برپا کرتا رہتا ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے وہ بہت ضعیف ہے اس کے باوجود محنت اور مشقت کی زندگی گزارتا ہے۔ آج ایک شخص محفل میں بیٹھا زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے تو کل اُسی شخص کا جنازہ کندھوں پر اٹھائے قبرستان لئے جا رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ انسان اگرچہ میرِ جہان یعنی اشرف المخلوقات ہے لیکن اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی میں مصروف ہے ہم یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سفر میں مصروف رہتے ہیں۔

خاکِ خموش در خروش

ست نہاد و سخت کوش

گاہ بہ بزمِ ناؤ نوش

گاہ جنازۂ بدوش

میر جہان و سفتہ گوش

ے نگریم و ے رویم

اے انسان یہ سچ ہے کہ تو اشرف المخلوقات ہے اور اس شرف کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے تجھے عقل سے بہرہ ور کیا ہے لیکن اس کے باوجود تو زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے اور تیری عقل کی کیفیت یہ ہے کہ کسی معاملے میں وہ تیری رہنمائی کرتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تیری عقل کارکشائی سے عاجز ہو جاتی ہے اور تو تقدیر کے سامنے ایسا بے دست و پا ہو جاتا ہے جیسے وہ ہرن جو شکاری کے جال میں پھنس جائے اور مجبور، عاجز اور بے بس ہو جائے ہم تیری اس بے چارگی کا دور سے نظارہ کرتے رہتے ہیں اور اپنا سفر طے کرتے رہتے ہیں۔

تو بہ طلسمِ چون و چند

عقلِ تو در کشاد و بند

مثلِ غزالہ در کمند

زار و زبوں و دردمند

مابہ نشیمنِ بلند

ے نگریم و ے رویم

حقیقت چشمِ انسانی سے او جھل کیوں ہے؟ نقش ھائے رنگ رنگ کی ماہیت کیا ہے؟ ظلمت و نور کی اصل کیا ہے؟ آنکھ دل اور عقل کیا ہیں؟ انسان کی بے قرار فطرت جو کسی ایک حالت پر قناعت نہیں کرتی کیا ہے؟ ذاتِ حق جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس کے باوجود پوشیدہ یعنی دور کیوں ہے؟ ہم ہر چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنی منزل کی طرف رواں ہیں۔

پردہ چرا؟ ظہور چیست؟

اصلِ ظلام و نُور چیست؟

چشم و دل و شعور چیست؟

فطرتِ ناصبور چیست؟

این ہمہ نزد و دور چیست؟

ے نگریم و ے رویم

تیرے ذخیرے ہمارے نزدیک ہیچ ہیں۔ تیرے سن و سال ہمارے نزدیک ایک لمحہ ہیں۔ اے انسان تو سمندر کے کنارے شبنم کے فقط ایک قطرے پر قناعت کیے بیٹھا ہے اور ہم کسی عظیم تر جہان کی تلاش میں محوِ مشاہدہ و محوِ سفر ہیں۔

پیشِ تو نزدِ ما کے

سالِ تو پیشِ ما دمے

اے بحنارِ تو یمے

ساختہ بہ شنمے

ما بتلاش عالمے

مے نگریم دمے رویم

(ص ۲۶۸ تا ۲۰۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبورِ عجم کی بیشتر غزلیات فکری لطافت ورعنائی کے ساتھ موسیقیت میں ڈوبی ہوئی ہیں مثلاً موضوعِ عشق کی عظمت کا نقش زبورِ عجم کی ایک بولتی اور گاتی ہوئی غزل میں کس طرح بٹھایا گیا ہے ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ اے محبوب تو میرے دلِ بے قرار کو اتنی مہلت ہی نہ دے کہ وہ اس کشمکش سے دوچار ہو سکے کہ پاکیزہ زندگی کی خوہش کرے یا مادی لذتوں اور نفسانی خواہشات کے حصول کے لئے کوشش کرے لہذا التجاہے کہ تو اپنے روشن گیسوؤں کو زیادہ دلکش بنالے یعنی مجھ پر مزید نگاہِ کرم کر تاکہ میں اپنے آپ کو مکمل طور پر تیری محبت میں فنا کردوں۔

فرصتِ کشمکش مدہ این دلِ بے قرار را

یک دو شکن زیاد کُن گیسوے تابدار را

میرے سینے میں تیرے جلوؤں کی ایسی محفل برپا ہے کہ اس کے دیدار کے لئے میں نے چاند اور سورج کو بھی انتظار کی تلخی سے دوچار کردیا ہے یعنی چاند اور سورج بھی تیرے اُس حسن وجمال کے دیدار کے منتظر ہیں جس کے جلوے میرے سینے میں آسمانی بجلی کی طرح گر رہے ہیں۔

از تو درونِ سینہ ام برقِ تجلیٔ کہ من

بامہ و مہر دادہ ام تلخیٔ انتظار را

عاشق نے اپنے معشوق کو بچشمِ خود دیکھنا چاہا لہذا دُنیا میں صنم گری کی رسم قائم ہوئی۔ میں اگرچہ عاشق الٰہی ہوں اور خدا تعالیٰ کی ذات کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا اس کے باوجود میرا عشق مجھے امید دلائے بیٹھا ہے کہ شاید کبھی محبوبِ حقیقی کا دیدار نصیب ہو جائے۔

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد

عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را

میں دراصل گلستانِ لاہوت یعنی عالمِ علوی کا طائر یعنی باشندہ ہوں لیکن اس گلستان سے دور ہو گیا ہوں اور قفس یعنی دنیا میں مقید ہوں۔ تو مجھے اس قفس سے رہائی عطا کر تاکہ میں اپنے اصل مقام پر واپس چلا جاؤں۔ وہاں پہنچ کر مجھے فراغِ خاطر

یعنی سکونِ قلب حاصل ہو اور میں پھر سے چہکنے لگوں۔

تا بفراغِ خاطرے نغمۂ تازۂ زنم
باز بہ مرغزار دہ طائرِ مرغزار را

اے خدا تو نے مجھے طبعِ بلند یعنی ترقی کی آرزو عطا فرمائی ہے اس لئے میں تجھ سے ملتجی ہوں کہ تو مجھے علائق دنیوی سے آزاد کر دے تا کہ میں بادشاہوں کی عطا کردہ خلعت کو تیرے بخشے ہوئے لبادۂ فقر پہ قربان کر سکوں یعنی تیری رضاجوئی کو اربابِ دولت اور شاہانِ عالم کی رضاجوئی پر مقدم گردانوں۔

طبعِ بلند دادۂ بند زپائے من کشا
تا بہ پلاسِ تو دہم خلعتِ شہریار را

فرہاد نے اگر شیریں کی محبت میں پہاڑ کاٹ دیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں عشق میں تو اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ساری کائنات کو فتح کر سکتا ہے۔

تیشہ اگر بسنگ زد این چہ مقامِ گفتگوست
عشق بدوش می کشد این ہمہ کوہسار را
(ص ۶۳۵ کلیاتِ اقبال فارسی)

جاوید نامہ کی ایک قابلِ ذکر نظم نغمہ ءِ بعل ہے۔ بعل خدایان کہن کا نمائندہ ہے اور قدیم خداؤں کی مجلس میں جدید دور کی عقلیت اور مادیت پرستی پر خوشی سے بغلیں بجا رہا ہے۔ یہ نظم ترجیع بند کی شکل میں ہے اور ترجیع بند ایک قدیم صنفِ سخن ہے اس لحاظ سے اس میں کوئی جدت نہیں مگر جدت آہنگ کی اُس تندی اور روانی میں ہے جس کا اہتمام شاعر نے بعل کے پر ہیجان احساسات کی ترجمانی کے لئے کیا ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسان نے آسمانوں کو بھی دیکھ لیا لیکن خدا وہاں بھی نہیں ملا۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ انسان جس خدائی مذہب کا دعویٰ کرتا ہے وہ فریبِ تخیل سے زیادہ نہیں۔ مذہب ایک خیال ہے اِدھر آیا اُدھر گیا۔ جیسے دریا میں موجیں اٹھتی ہیں۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے فنا ہو جاتی ہیں۔ انسان بغیر محسوس و مشہود خدا کے تسکین نہیں پا سکتا۔ خدا فرنگ کو سلامت رکھے اس نے مشرقیوں کو خوب سمجھا اور علم و تحقیق و اکتشافات کے نام پر ہمیں ایک بار پھر زندہ کر دکھایا۔ لہٰذا اے خدایان کہن اس سنہری موقع کو غنیمت سمجھو اور اپنی عظمتِ رفتہ دوبارہ حاصل کر لو۔

آدم این نیلی تتق را بردرید
آنسوے گردوں خداے را ندید
در دلِ آدم بجز افکار چیست

ہمچو موج این سرکشید و آں رمید
جانش از محسوس می گیرد قرار
یو کہ عہدِ رفتہ باز آید پدید
زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس
آنکہ مارا از لحد بیرون کشید
اے خدایان کہن وقت است وقت

تم اس صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لو کہ اولاد ابراہیم بھی عقیدہ توحید بھلا بیٹھی اور میثاق ازل اور پیمانِ الست کو فراموش کر چکی اور اس کی لذت کھو بیٹھی وہ فرنگ کے فیضِ صحبت سے اپنا سب کچھ لٹا چکی اور روح الامین کے لائے ہوئے دین اور لذتِ ایمان ویقین کو یکسر حوالۂ نسیاں کر چکی۔ وہ مومنِ آزاد جو حدود و قیود کا کبھی قائل نہ تھا اور نہ خدائے خالقِ کائنات کے سوا کسی کو جانتا تھا اب وطن سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اُسے پوجتا بھی ہے اس کے لئے لڑتا بھی ہے لیکن خدا کو کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا۔ آج سارا عالمِ اسلام دانشِ فرنگ کا اسیر ہو چکا ہے اور اسکے علاوہ علماء شیوخ بھی تقلید مغرب پر اُتر آئے ہیں لہذا اے خدایان کہن اس سنہری موقع کو غنیمت سمجھو اور اپنی عظمت رفتہ دوبارہ حاصل کرلو۔

در نگر آن حلقۂ وحدت شکست
آلِ ابراہیم بے ذوق الست
صحبتش پاشیدہ، جامش ریز ریز
آنکہ بود از بادۂ جبریل مست
مردِ حُر افتاد دربند حیات
باوطن پیوست و از یزداں گُسست
خونِ او سرد از شکوہ دیریاں
لاجرم پیرِ حرم زنار بست
اے خدایان کہن وقت است وقت

ہمیں آج خوشی منانے کا حق ہے کہ دین نے شکست کھائی اور قومیت و وطنیت کی فتح ہوئی اور محمدؐ کے ایک چراغ کے لئے سینکڑوں بولہبی آندھیاں اٹھنے لگیں۔ ہم لاالہ الااللہ کی آواز سنتے ہیں لیکن وہ دل کی آواز نہیں بلکہ حرف زیرِ لب سے آگے کچھ نہیں اور جو دل میں نہیں ہو تا وہ زبان پر بھی زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ سحرِ فرنگ نے دنیا پر ایک بار پھر تاریکی کی حکومت مسلط کر دی ہے اور دین کو بے دخل کر دیا ہے لہذا اے خدایان کہن اس سنہری موقع کو غنیمت سمجھو اور اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ

حاصل کرلو۔

در جہان باز آمد ایّام طرب
دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب
از چراغ مطصفی اندیشہ چیست؟
زانکہ او را پف زند صد بولہب
گرچہ می آید صدائے لااِلہ
آنچہ از دل رفت کے ماند بہ لب
اہرمن را زندہ کرد افسونِ عرب
روزِ یزداں زرد رو از بیمِ شب
اے خدایانِ کہن وقت است وقت

ہمیں چاہیے کہ ہم انسانوں کو دین کی قید سے آزاد کردیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تو اپنے بندوں یعنی بُت پرستوں کو ہر قسم کی آزادی عطا کی تھی مگر دین اسلام نے انہیں صدہا پابندیوں میں جکڑ دیا یعنی اوامر و نواہی کے گھن چکر میں الجھا دیا۔ چونکہ انسان کو نماز ادا کرنا شاق گزرتا ہے اس لئے ہم اس سے صرف ایک رکعت کے طلب گار ہیں اور وہ بھی ایسی کہ اُس میں سجدہ نہیں ہے یعنی بُت خانوں میں جاکر دومنٹ کے لئے بتوں کے درشن کرلئے اور تمام مذہبی فرائض ادا ہوگئے۔نہ رکوع نہ سجود۔علاوہ ازیں مسلمانوں کی نماز میں نہ موسیقی ہے نہ رقص اس لئے ہم اُسے ایسی عبادت کا حکم دیں گے جس میں گانا بجانا بھی ہوگا۔بھلا اس عبادت میں کیا لذت جس میں نہ نغمہ ہو گانہ رقص۔بلا شبہ اُس خدا سے جو نظر نہیں آتا وہ دیو یا بُت بدرجہا بہتر ہے جو نظر تو آتا ہے۔لہذا اے خدایان کہن اس سنہری موقع کو غنیمت سمجھو اور اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرلو۔

بندِ دیں از گردنش باید کشود
بندۂ ما بندۂ آزاد بود
تا صلوٰۃ او را گراں آید ہمے
رکعتے خواہیم و آں ہم بے سجود
جذبہ ھا از نغمہ می گردد بلند
پس چہ لذت در نمازِ بے سرود
از خداوندے کہ غیب او را سزد
خوشتر آں دیوے کہ آید در شہود

اے خدایانِ کہن وقت است وقت

(ص۶۷۹، ۶۸۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

حضور رسالتمآبؐ کے بارے میں شعر کہتے ہوئے علامہ اقبال پر وجد اور جذب کی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور شعر و فورِ عشق کی کیفیت سے ہی معمور نہیں ہو تا بلکہ اس کی زبان اور طرزِ ادا میں بھی غیر معمولی حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت سوز و گداز اور اہتزازِ روح موسیقی میں ڈوبے ہوئے پس چہ باید کرد ای اقوام شرق کے بعض نعتیہ اشعار میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اُس امّی لقب نبی کی خوش انفاسی کے فیض سے صحرائے عرب کے ریگ زاروں میں گل و لالہ کی بہار آگئی۔ آزادی کا جذبہ آپؐ ہی کی آغوشِ مبارک کا پروردہ ہے اور اس طرح گویا اقوام عالم کی حالیہ ترقیاں آپؐ کے عظیم ماضی کا نتیجہ ہیں۔ انسان کے پیکرِ خاکی میں آپ نے دھڑکتا ہوا دل رکھ دیا اور صحیح معنوں میں انسان کی صلاحیتوں سے پردہ اٹھایا اور اس کے جوہر ذاتی کی چہرہ کشائی کی۔ آپؐ نے تمام خدایانِ کہن کو شکست فاش دی اور آپؐ کے فیض سے مرجھائی شاخوں پر برگ وبار آنے لگے۔ بدر و حنین کی گرمئ ہنگامہ آپؐ ہی کے جوش و خروش کے دم سے تھی اور حضرت صدیقؓ و فاروقؓ و حیدر کرارؓ اور شہید عالی مقام حضرت حسینؓ کی انقلابی شخصیتیں آپؐ ہی کی ہمہ صفت ذات کی تجلیات تھیں۔ حالاتِ جنگ میں بلند ہونے والی اذان کی سطوت و ہیبت اور تلاوت الصافات کی لذت و حلاوت آپؐ ہی کی دی ہوئی ہے۔ صلاح الدین ایوبی کی شمشیرِ آبدار اور بایزید بسطامی کی حقیقت بیں نگاہ دو عالم کے خزانوں کی کلید ثابت ہوئیں۔ ساقئ مدینہؐ کے ایک جام سے عقل و دل دونوں ہی مست و سرشار ہو گئے اور آپؐ کی تربیت گاہ میں رومی کا ذکر اور رازی کی فکرِ فلک پیا ہم آہنگ ہوئی۔ علم و حکمت دین و شریعت اور انتظامِ سلطنت اور دنیا کے اندر پھیلی ہوئی روحانی طلب و تلاش اور سینوں میں دلوں کی بے قراری، الحمراء اور تاج محل کا وہ حسنِ عالم سوز و دل افروز جو فرشتوں سے بھی خراجِ عقیدت لے لیتا ہے۔ یہ سب کارنامے آپؐ کے اوقات عزیز و گرانمایہ کے ایک مختصر لمحہ اور آپؐ کی تجلیات باطنی کی طرف ایک تجلّی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپؐ کے فیضِ ظاہری کے اثرات ان جلوہ ہائے دل افروز کی شکل میں تو ظاہر ہو گئے لیکن آپؐ کے وجود مبارک کا باطنی پہلو عارفانِ کامل کی نگاہ سے بھی پوشیدہ ہے۔ رسول پاکؐ کی عظیم ہستی بے حد تعریفوں کی مستحق ہے جس نے مشتِ خاک کو ایمان دے کر جوہرِ قابل بنادیا۔

از دمِ سیراب آن امّی لقب
لالہ رست از ریگِ صحرائے عرب
حریت پروردۂ آغوش اوست
یعنی امروز امم از دوش اوست
او دلے در پیکرِ آدم نہاد
او نقاب از طلعتِ آدم کشاد

ہر خداوند کہن را او شکست
ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست
گرمیٔ ہنگامۂ بدر و حنین
حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ
سطوتِ بانگِ صلوٰۃ اندر نبرد
قرأت الصافات اندر نبرد
تیغِ ایوبی نگاہِ بایزید
گنجہاے ہر دو عالم راکلید
عقل و دل رامستی از یک جام مے
اختلاط ذکر و فکر روم و رے
علم و حکمت شرع و دین نظم امور
اندرون سینہ دلہا ناصبور
حُسن عالم سوز الحمراء و تاج
آنکہ از قدوسیاں گیرد خراج
این ہمہ یک لحظہ از اوقات اوست
یک تجلی از تجلیاتِ اوست
ظاہرش این جلوہ ھائے دلفروز
باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز
حمد بے حد مر رسول پاکؐ را
آن کہ ایمان داد مشتِ خاک را

(ص ۸۳۵،۸۳۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

معنویت اور موسیقی کا دلکش امتزاج ارمغانِ حجاز میں بھی جابجاد کھائی دیتا ہے مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ خودی کا وجود ذاتی یا مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود کے لئے خدا کی محتاج ہے۔ اسی طرح اگر وہ کائنات میں ظاہر ہوئی ہے تو محض اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اسے ظاہر کیا ہے وگرنہ بذاتِ خود اس میں اتنی طاقت نہ تھی۔ میں نہیں جانتا اگر دریا نہ ہوتا تو یہ گوہرِ تابندہ کہاں ہوتا مراد یہ کہ اگر خدا نہ ہوتا تو یقیناً خودی بھی نہ ہوتی۔

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے
نمی دانم کہ این تابندہ گوہر
کجا بودے اگر دریا نبودے
(ص ۱۰۰۳ کلیات اقبال فارسی)

☆☆☆

فارسی طرز شعر گوئی میں مذکورہ بالا تمام امتیازات کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے اصنافِ سخن میں بھی ایک خاموش، ہمہ گیر اور عہد آفرین انقلاب برپا کیا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"اقبال نے نظم و غزل کے ظاہری سانچوں کو اپنی اپنی جگہ بر قرار رکھتے ہوئے بھی طرز فکر اور طرز ادا کے لحاظ سے دونوں کی اندرونی سرحدوں کو توڑ کر انھیں ایک ہی دائرہ فن کے زاویوں میں تبدیل کر دیا.......... غزل ان کے ہاتھوں گل و بلبل کی نزاکتوں سے آگے بڑھ کر خودی و خدا کی صلابتوں کی ترجمان ہو گئی حالانکہ اس کے استعارات و علائم اور ہیئت سخن اپنی عام روایتی شکل میں بر قرار رہے مگر ان کے مفاہیم و مضمرات یکسر بدل گئے۔ اسی طرح نظم کے مختصر و طویل سانچے پہلے سے فارسی اور اردو میں مستعمل تھے ان میں ہی ضروری ترمیم اور اضافہ کر کے اقبال نے ان کے امکانات و کمالات کو تمثیل و رزمیہ کی وسیع و پیچیدہ تماشوں تک وسیع کر دیا۔" (۲۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں :

"اقبال کے یہاں مثنوی غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ کی ظاہری شکلوں کی موجودگی سے یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ انہوں نے ان اصناف کی روایتی روح کا بھی التزام کیا ہے۔ یعنی ظاہری سانچے کے ساتھ ان خاص مطالب اور خاص قسم کے مضامین کو بھی بر قرار رکھا ہے جن کا پرانے زمانے میں ان اصناف سے خاص تعلق رہا ہے۔
اقبال کے یہاں اصناف کا (محض اصناف کی حیثیت سے) کوئی مقام نہیں۔ ان کے یہاں اصل شے پیرایہ ہائے بیان یا اسالیب اظہار ہیں.......... اس لئے ان کی شاعری کے تبصرے میں غزل، رباعی، مثنوی کے عنوان سے بحث کرنا لاحاصل اور شاید غلط بات ہو گی۔ اقبال کے فن میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ ہے کامیابیٔ اظہار کی آروز۔ یعنی پردہ داری سے زیادہ بے پردہ اظہار حقائق کی تڑپ۔ اور پھر اس پر

نظر کہ قاری یا مخاطب کو سب سے زیادہ کس اسلوب بیان یا اسلوب اظہار سے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ انہی تقاضوں کے تحت انھوں نے اکثر یہ سوچا کہ ان کے خاص مطالب یا تجربات اپنے لئے کس قسم کا قالب چاہتے ہیں اور موسیقی اور مصوری کی صورتیں کس طرح کی تشکیلات میں پوری ہوتی ہیں۔ اقبال کے یہاں اصناف کا جو تنوع ہے اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ اس تنوع میں اقبال کے ذہن کے عہد بہ عہد تغیرات اور تبدیلیٔ مذاق کا حصہ بھی ہے۔ مگر یہ مسلم ہے کہ اقبال کے یہاں تشکیل کی رنگارنگی مضمون اور تجربے کی رنگارنگی سے متاثر ہوئی ہے۔"(۲۹)

علامہ اقبال نے اپنے فلسفہ زندگی کو مسلسل، منظّم اور مربوط طور پر صراحت سے بیان کرنے کے لئے بیشتر صنفِ مثنوی کو منتخب کیا کیونکہ وہ اپنے غیر معین حجم اور فنی لچک کے اعتبار سے اس اظہار خیال کے لئے سب سے موزوں صنف سخن تھی۔ مثلاً خودی اور بے خودی کے مضامین کو علامہ نے تفصیل اور ترتیب کے ساتھ اسرار و رموز کی شکل میں مثنوی ہی میں پیش کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سیر افلاک کا حال بھی جاوید نامہ کے عنوان سے مثنوی میں قلمبند کیا اور پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور مسافر بھی انھوں نے مثنوی کے رنگ میں ہی لکھیں لیکن علامہ کی یہ مثنویات سابقہ فارسی مثنویات سے بہت حد تک مختلف قرار پائیں مثلاً اسرار و رموز میں ہمیں وہ خوش بیانی دکھائی دیتی ہے جسے نستعلیق کہنا چاہئے۔ اور جو اس نوع کی سابقہ فارسی مثنویات مثلاً مثنوی معنوی، حدیقۃ الحقیقت اور مخزن اسرار میں دکھائی نہیں دیتی کیونکہ ان میں جذبات کو زیادہ مجرد جذبات ہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جبکہ ہیئت محض معنی پر سطحی پرت ہے۔

اسی طرح جاوید نامہ فنی حیثیت سے مشرقی شعریات میں اپنی قسم کی پہلی تصنیف ہے اور خود اقبال کی تصنیفات میں بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے کیونکہ اسمیں مثنوی معنوی کی بحر بھی ہے اور غزلوں، نظموں، مکالموں اور نغموں پر مشتمل الگ فن پارے بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں۔ تعمیر و ترتیب اور فن ہیئت کے اعتبار سے یہ نہایت اہم اقدامات ہیں جو ایک نئی جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان سے مناسب وقفوں اور موقعوں پر ٹھہراؤ بھی پیدا ہوتا ہے اور ذوقی تسکین بھی ہوتی ہے کیونکہ قاری پر مسلسل بیان کی یکسانیت گراں نہیں گزرتی بلکہ وہ ایک دلچسپ مقام سے دوسرے کی طرف خود بخود رجوع ہوتا ہے اور یکساں کیف کا احساس کرتا ہے لیکن یہ فن پارے اپنی انفرادی نوعیت کے باوجود چونکہ ایک ہی خیال کی ڈوری سے بندھے ہیں۔ لہذا ایک مسلسل نظم کے باہم گر منسلک اجزائے ترکیبی ہی کی حیثیت سے اہم ہیں۔ اس لحاظ سے جاوید نامہ مشرق کی پہلی تصنیف ہے اور فن کا نیا تصور اور نمونہ پیش کرتی ہے۔ شاید اس کا اعادہ نہ ہو کیونکہ ہر ایسی پیش کش کی نوعیت تقلیدی ہوگی۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور مسافر بھی علامہ نے مثنوی معنوی ہی کی بحر میں لکھیں جن میں سے اول الذکر ہیئت کے اعتبار سے اسرار و رموز کی صدائے بازگشت ہے تو مؤخر الذکر جو افغانستان کے اس سفر کی یادگار ہے جو اقبال نے نادر شاہ کی دعوت پر اختیار کیا جاوید نامہ کی یاد دلاتی ہے لیکن اس کا انداز جغرافیائی سفر سے بہت مختلف ہے۔ زمین وہی مثنوی معنوی کی ہے لیکن متفرق نظموں سے

آراستہ ہے اور یو قلموں اجزاء کے حسن ترتیب نے اسے خاصا متنوع بنادیا ہے۔ جاوید نامہ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جس کا یہ علیحدہ فلک معلوم ہوتا ہے۔ یا اس کا پیش آہنگ، اس کی دلچسپی اور وضع قطع اقبال کی تمام تصانیف سے مختلف ہے۔ منفرد تکنیک اور افغانستان سے متعلق مشاہدات اور تاثرات نے اسے مرکب وضع عطا کردی ہے۔ افکار تو ظاہر ہے اقبال کے وہی جانے پہچانے افکار ہیں جن کی ترجمانی وہ پیرائے بدل بدل کر اپنی تصانیف میں کرتے رہتے ہیں لیکن پیش کش میں وہ نرالا پن ہے جس نے جاوید نامہ میں زیادہ وسیع پیمانے پر رونما ہو کر اسے زندۂ جاوید بنادیا ہے دونوں سفر ہیں ایک حقیقی دوسرا خیالی۔ ایک زمینی دوسرا آسمانی لیکن اس سے پیش کش کی نوعیت میں فرق نہیں پڑا کیونکہ مسافر میں بھی حقیقت کا دامن خیال سے جاملا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ ہم اس میں شاعر کے ہمراہ زمینی سفر کے ساتھ ساتھ ذہنی سفر کے مراحل بھی طے کرتے ہیں اور بالآخر اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جو اقبال کی فکر و نظر کا منتہا ہے اسی لئے یہ مثنوی اپنی جگہ انتہائی ندرت کی حامل ہے۔

پس چہ باید کرد کا مطمح نظر، فلسفہ حیات کے رموز و نکات نہیں بلکہ وہ حکمت عملی اور تدابیر و مصالح ہیں جو نئے پیدا شدہ حالات میں درکار ہیں تا کہ مشرق کی دیرینہ روحانیت مغرب کی مادی تہذیب و تمدن کا مقابلہ کر سکے اور عالمی حالات کو صحت مندانہ نہج عطا کرنے میں کوشاں ہو۔ اور شاید اسی لئے اقبال کے سارے کلام کو بمنزلہ جسم اور پس چہ باید کرد کو اس کا دل کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی علامہ اقبال کی اصناف کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> "مثنوی میں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق، غزل میں زبور عجم پیام مشرق کا باب مئے باقی اور رباعی میں پیام مشرق کا باب لالۂ طور۔ رومی کی مثنوی معنوی، حافظ کے دیوان اور خیام کی رباعیات کے مقابلے میں زیادہ جاں سوز و دل گداز ہیں۔ جاوید نامہ کی تمثیلات تو مشرقی شاعری میں فقید المثال ہیں۔ فارسی شاعری کا پورا دفتر ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر اتنی تنظیم کے ساتھ شعر نگاری کا اب تک کسی نے حوصلہ نہیں کیا۔(۳۰)

ڈاکٹر عبدالمغنی علامہ اقبال کی جدید ہیئت میں نظم نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> "اقبال کا زیادہ دلچسپ کارنامہ جدید ہیئت میں ان کی فارسی نظموں کا ہے انھوں نے مغربی قماش پر نظم گوئی میں کامیاب ترین تجربے کئے ہیں۔ مواد کو ملحوظ رکھ کر نظم کی ہیئت کو متنوع پیچ و خم دیئے ہیں۔ کہیں مکالمہ کہیں خود کلامی، کہیں بیانیہ کبھی منظر نگاری، کبھی کردار نگاری گاہ ترانہ و سرود۔ ان متعدد طریقوں میں ایک قدرِ مشترک :

> فکر و تخیل کی تمثیل۔ نظموں کا ہیولہ ہر گوشے سے درست اور چست ہے۔ مختلف مصرعوں اور بندوں میں ارتقائے خیال واضح اور مرتب ہے۔ ہر ایک ٹکڑا دوسرے سے عضویاتی طور پر مربوط اور پیوستہ ہے۔ ابتدأ وسط اور انتہا کی تنظیم ممکن حد تک کامل ہے۔ جدید نظم نگاری میں اقبال کا موازنہ کسی دوسرے فارسی شاعر سے ممکن و مفید نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس ہیئت شاعری میں خود پیش رو ہیں۔ بعد میں آنے والوں نے قدرتی طور پر انہی کا تتبع کیا ہے اور ان سے بیسیوں قدم پیچھے ہیں۔ (۳۱)

جدید ہیئت میں نظم نگاری کے حوالے سے پیام مشرق کی پہلی نظم "فصل بہار" ہے جس کے چھ بند ہیں اور ہر بند سات مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے ہر بند کا پہلا اور آخری مصرع ایک ہے لیکن اگلے بند کے پہلے اور آخری مصرع سے مختلف ہے اور اس کا ردیف اور قافیہ بھی لگ ہے۔ ہر بند کے پہلے اور آخری مصرع کے درمیان پانچ مصرعے آتے ہیں مگر وہ اس کے پہلے اور آخری ہر دو مصرعوں سے چھوٹے ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں :

خیز کہ در کوہ و دشت
خیمہ زد ابر بہار
مست ترنم ہزار
طوطی و دراج سار
بر طرف جویبار
کشت گل و لالہ زار
چشم تمنا بیار
خیز کہ درکوہ ودشت، خیمہ زد ابر بہار
خیز کہ درباغ وراغ، قافلۂ گل رسید
بادِ بہاراں وزید
مرغ نوا آفرید
لالہ گریبان درید
حسن گل تازہ چید
عشق غم نو خرید
خیز کہ در باغ وراغ قافلۂ گل رسید

(ص ۲۶۱، ۲۶۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

''سرودِ انجم''اسی انداز کی ایک اور نظم ہے جس کے آٹھ بند ہیں اور ہر بند کے پانچ مصرع ہیں۔بنیادی طور پر سرودِ انجم اور فصل بہار کا سانچہ ایک ہے مگر فرق یہ ہے کہ سرودِ انجم کے ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم وزن ہیں اور پانچویں مصرع کی بحر ان کے مقابلے میں طویل ہو گئی ہے۔پانچویں مصرع کا پہلا ٹکڑا چاروں مصرعوں کے ساتھ ہم قافیہ و ہم ردیف ہے مگر دوسرا ٹکڑا ہر پانچویں مصرع کے دوسرے ٹکڑے کی تکرار ہے۔ نظم کے پہلے دو بند ملاحظہ ہوں :

ہستیٔ ما نظام ما

مستی ما خرام ما

گردش بے مقامِ کا

زندگی دوام ما

دورِ فلک بکام ما، می نگریم و می رویم

جلوہ گہ شہود را

تبکدۂ نمود را

رزم نبود و بود را

کشمکش وجود را

عالم دیرو زود را، می نگریم و می رویم

(ص ۲۶۸، ۲۶۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

''کرمک شب تاب'' نظم میں بھی مصرعوں کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت پہلے دونوں تجربوں سے مشابہ ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہاں ہر دو مصرعوں کے بعد ایک چھوٹا مصرع آتا ہے۔ نظم کے پہلے دو بند ملاحظہ ہوں :

یک ذرۂ بے مایہ متاع نفس اندوخت

شوق این قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت

پہنائے شب افروخت

واماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد

از سوز حیات است کہ کارش ہمہ زر شد

دارائے نظر شد

(ص ۲۷۶، ۲۷۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

"حدٰی" نظم میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہے آخری مصرع پہلے پانچ مصرعوں سے طویل تر ہے اور ہر بند کے بعد اس کی تکرار ہوتی ہے اس نظم کے پہلے دو بند ملاحظہ ہوں :

ناقۂ سیار من
آہوے تاتار من
درہم و دینار من
اندک و بسیار من
دولتِ بیدار من
تیز ترک گامزن، منزل ما دور نیست

دلکش و زیباستی
شاہد رعناستی
روکش حوراستی
غیرت لیلاستی
دُختر صحراستی
تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

(ص ۲۷۹: ۲۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

"شبنم" نظم میں نو بند ہیں۔ ہر بند کا آغاز ایک مکمل شعر سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد تین مصرعے آتے ہیں تینوں پہلے شعر کے ساتھ ہم ردیف ہیں مگر اس کے مصرعوں سے چھوٹے ہیں۔ پہلے دو بند ملاحظہ ہوں :

گفتند فرود آے ز اوجِ مہ و پرویز
برخود زن و با بحر پر آشوب بیا میز
با موج در آویز
نقش دگر انگیز
تابندہ گہر خیز

من عیش ہم آغوشی دریا نہ خریدم
آن بادہ کہ از خویش رباید نچشیدم
از خود نہ رمیدم
ز آفاق بریدم

بر لالہ چکیدم

(ص ۲۸۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبور عجم میں بھی ہیئت کا یہ تجربہ دکھائی دیتا ہے جہاں غزلوں کے درمیان شاعر کی فنی مہارت کے خوبصورت نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان وبیان کی لطافت اور تخیل کی فسوں گری میں غزل کا رنگ ہے۔ مگر ان کی ہیئت اور موضوع کی نوعیت نے انھیں غزل سے ممتاز کر دیا ہے۔ اس قسم کی پہلی کوشش وہ نظم ہے جس میں تقریباً ہر مصرع لفظ "یا" سے شروع ہوتا ہے اور ہر شعر کے بعد "یا چناں کُن یا چنین" کی تکرار ہوتی ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں :

یا مسلمان رامدہ فرمان کہ جان بر کف بنہ
یا درین فرسودہ پیکر تازہ جانے آفرین
یا چناں کُن یا چنین
یا برہمن را بفرما نو خداوندے تراش
یا خود اندر سینۂ زناریاں خلوت گزین
یا چناں کن یا چنین

(ص ۴۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبور عجم کی ہی ایک اور نظم "از خواب گراں خیز" کو علامہ اقبال نے موزوں ترین ہیئت اور آہنگ سے آراستہ کیا ہے۔ ہر دو اشعار کے پہلے تین مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں اور چوتھا مصرع نظم کے پہلے شعر کے ساتھ ہم قافیہ اور ہم ردیف ہے۔ ہر چار مصرعوں کے بعد ایک ولولہ انگیز مصرع کی تکرار ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد اس کے نصف ٹکڑے کی تکرار اس کی تائید میں مزید شدت پیدا کر دیتی ہے۔ پہلے دو بند ملاحظہ ہوں :

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ مارفت بہ تاراج غماں خیز
از نالۂ مرغ چمن از بانگِ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز
خورشید کہ پیرایہ بہ سیمائے سحر بست
آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
از دشت وجبل قافلہ ھا رخت سفر بست

اے چشم جہاں بین بہ تماشاے جہاں خیز
از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز
(ص ۳۷۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

زبور عجم کی ایک اور نظم میں ہر شعر کے بعد لفظ "انقلاب" مصرع کا کام دیتا ہے اور اس کے بعد اگلے مصرع میں بھی صرف تین لفظ آتے ہیں جن میں سے دو انقلاب پر مشتمل ہیں پہلے دو بند ملاحظہ ہوں :

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب اے انقلاب!
شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صدمو من بدام
کافران سادہ دل را برھمن زنار تاب
انقلاب!
انقلاب !اے انقلاب!
(ص ۴۸٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

علامہ اقبال کی غزلیات کے حوالے سے ڈاکٹر حسین خطیبی فرماتے ہیں :

"در غزل سرائی اقبال شاعریست بسیار بلند طبع و ہنر مند و قسمت زیادی از دو جلد اثر معروف او بنام زبور عجم و پیام مشرق را غزلیاتش تشکیل می دھد کہ میتوان آن را بسہ قسم تقسیم کرد۔

اول : آنچہ از حیث لفظ و معنی اقتفا و اقتباسی است از شعرای معروف غزل سرائی سبک عراقی بخصوص حافظ و مولوی۔ در این آثار گذشتہ از وزن و قافیہ و ردیف قسمتی از ترکیبات مستعمل در غزلیات حافظ و مولوی را نیز عینا اقتباس کردہ و بکار بردہ و در بسیاری از موارد از حیث مضمون و فکر ھم بحافظ و مولوی سخت نزدیک می شود۔

دوم : آثاری کہ ھر چند مستقیما اقتفا و تقلید غزلیات حافظ و مولوی نیست لیکن در آن از حیث سبک و اسلوب باستثنای لغات و اصطلاحاتی کہ گاہ گاہ خارج از حدود سبک عراقی بکار می برد کاملا تحت تاثیر روش این دو شاعر غزلسرائی معروف قرار دارد و در ھمین قسمت

است کہ ردیف ھای برای غزل انتخاب می کند کہ در غزلیات حافظ و بعضی دیگر از غزلسرایان سبک سابقہ نداشتہ است۔

سوم: غزلیاتی کہ رویھم رفتہ بسبک ہندی نزدیک تر شدہ و تعداد آن نسبت بہ سایر غزلیات او کمتر است دراین قسمت کم و نیز بیشتر توجہ او بدورہ اول سبک ہندی بودہ واشعارش از حیث لفظ و معنی از تکلفات و سستی ھای معنوی و لفظی او اخراین سبک تکلی دور است۔"(۳۲)

ڈاکٹر خطیبی کے اس بیان سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن علامہ اقبال کی غزل کی انفرادیت مسلم ہے جس کا سبب وہ چند جدتیں ہیں جو انہوں نے اس صنف کو عطا کیں۔

یونس جاوید لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال عظمائے غزلِ فارسی کے کاروانِ عالی شان میں شامل رہ کر بھی اپنے خیمہ و خرگاہ کو عظمت و زینت کے بعض خصائص کے باعث ممیّز و منفرد رکھتے ہیں۔"(۳۳)

ا۔ علامہ اقبال نے غزل کی زبان کو اتنی وسعت دی کہ وہ ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کے قابل ہوگئی لیکن اس کے روپ میں فرق نہ آیا۔ مثلاً ایک شعر میں استعاراتی انداز میں فرماتے ہیں کہ جب شاہین زادہ قفس کی زندگی اختیار کرکے دانے سے موافقت کرلیتا ہے۔ بالفاظ دیگر قید کی ذلت گوارا کرلیتا ہے تو وہ اس قدر بزدل ہو جاتا ہے کہ چکوروں کو دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب مومن غیر اللہ کی غلامی اختیار کرلیتا ہے تو اس میں اس قدر بزدلی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کافر کو دیکھ کر ہی لرزہ براندام ہو جاتا ہے کجا یہ کہ وہ اس سے جہاد کرے :

تنش از سایہ بال تدروے لرزہ می گیرد
چو شاھین زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد
(ص ۳۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

ایک اور شعر میں استعارے کا استعمال فکر کو مزید مؤثر بنادیتا ہے فرماتے ہیں کہ اگر تو حیات کی حقیقت سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے تو سن کہ زندگی نام ہے مسلسل تڑپتے رہنے کا کیونکہ آبجو یعنی خودی کے لئے یہ بات باعث ننگ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو قلزم یعنی خدا کی ہستی میں مدغم کردے۔

رمزِ حیات جوئی جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن ننگ است آبجورا
(ص ۳۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

مسلمان کو نصیحت کرتے ہوئے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ اگر تو اڑنا چاہتا ہے یعنی ترقی کرنا چاہتا ہے تو خود اپنے بازوؤں میں طاقت پیدا کر یعنی اپنی صلاحیتوں کو نکھار، کیونکہ دوسروں کے بازوؤں کے سہارے اُڑنا یا دوسری کی خوبیوں کے بل بوتے پر ترقی کرنا ممکن نہیں اس شعر میں بیان کی رعنائی فکری حُسن کو کیسے دوچند کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو :

در جہان بال و پر خویش گشودن آموز

کہ پریدن نتواں با پرو بالِ دگراں

(ص ۳۴۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ایک شعر میں علامتی انداز اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تمام افرادِ انسانی کی اصل ایک ہی شعلہ حیات یعنی انائے مطلق ہے لیکن انفرادیت کے شوق یا لذت خودی نے ہمیں شرر کی طرح اس شعلہ سے جدا کر دیا ہے جبکہ ہم سب اللہ کے پاس سے آئے ہیں اور انجامِ کار اُس کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

بود و نبود ماست زیک شعلۂ حیات

از لذت خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

(ص ۳۴۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ایک شعر میں مسلک عشق کے درس کے لئے بیان کا زور ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ اے مخاطب تو عشق کو اپنا رہنما بنا لے اس کے بعد جو جی میں آئے کر تیرا کوئی فعل تجھے نقصان نہیں پہنچا سکے گا یعنی تجھ سے کوئی ایسا عمل سرزد نہیں ہو سکے گا جو تجھے منزلِ مقصود یعنی اصلاح باطن سے غافل کر دے کیونکہ عشق تو اصل حیات ہے اور اس بنا پر ہوش یعنی شعور اور فرہنگ یعنی عقل دونوں کی جان ہے لہذا جب تو مسلکِ عشق پر گامزن ہو جائے گا تو ہوش و خرد دونوں غلطی سرزد کرنے سے محفوظ ہو جائیں گے۔

زعشق درسِ عمل گیر و ہرچہ خواہی کن

کہ عشق جوہر ہوش است و جان فرہنگ است

(ص ۳۲۱ کلیاتِ قبال فارسی)

ایک اور شعر میں فکری جوش الفاظ سے یوں مترشح ہے

نکنم دگر نگاہے بہ رہے کہ طے نمودم

بسراغ صبح فردا روش زمانہ دارم

(ص ۴۱۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں طے کردہ راہوں کو نہیں ناپتا بلکہ زمانے کی سی روش کے ساتھ آنے والی صبح کی جستجو میں رہتا ہوں۔

ایک شعر میں ایمائی طرز اظہار ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ امیر کارواں کو کس قدر مشکل کا سامنا ہے کہ اندھیری رات

ہے، راستے پیچیدہ ہیں اور شریک قافلہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ مراد یہ ہے کہ مسلمان بدحالی کا شکار ہیں اور راستے کی دشواری کے سبب اپنی منزل تک پہنچنے کے یقین سے بھی محروم ہیں لہذا امیر قافلہ کو لاتعداد مشکلات کا سامنا ہے۔

شب تاریک و راہ پیچ پیچ و بے یقین راہی
دلیل کارواں را مشکل اندر مشکل افتاد است
(ص ۴۹۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

ایک شعر میں نغمگی سے بھرپور الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے صورت پرستی نہیں کی اور ایک اللہ کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا بلکہ ظاہری اور باطنی ہر قسم کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور میں دنیا میں کسی طاقت سے بھی مرعوب نہیں ہوا بلکہ میری شخصیت اس سیل بے پناہ کی سی ہے جو اپنے راستے سے تمام رکاوٹوں کو دور کرتا چلا جاتا ہے ان تمام رکاوٹوں کو جو اعلائے کلمۃ الحق میں سامنے آتی ہیں :

صورت نپرستم من بُت خانہ شکستم من
آن سیلِ سبک سیرم ہربند گسستم من
(ص ۳۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

مسلمان کی مختصر زندگی کے لئے چنگاری کی خوبصورت تشبیہ استعمال کرتے ہوئے ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ اسے تمام غیر ضروری کاموں سے دستکش ہو کر اپنی پوری توجہ اپنی ذات کی تعمیر یعنی خودی کی تربیت پر مبذول کر دینی چاہئے۔

زخاکِ خویش بہ تعمیر آدمے برخیز
کہ فرصت تو بقدر تبسم شرر است
(ص ۳۱۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

استعارتی طرز گفتگو کا ترجمان ایک شعر ملاحظہ ہو :

سیلم مرا بجوئے تنک مایۂ مپیچ
جولانگہ بوادی وکوہ و کمر بدہ
(ص ۳۹۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں طغیانی ہوں تو مجھے کسی چھوٹی ندی میں مت ڈال بلکہ مجھے وادی اور کوہ ودشت عطا کہ جن میں میں جولانیاں دکھاسکوں۔

ایک شعر میں صنائع بدائع کا ماہرانہ استعمال ملاحظہ ہو :

حیات چست؟ جہان را اسیر جاں کردن
تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرد

(ص ۴۵٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی زندگی دنیا کو اپنے اندر سمو لینے کا نام ہے لیکن اے مخاطب تو تو خود دنیاوی لذتوں کا اسیر ہو چکا ہے تجھ سے یہ کام کیونکر ممکن ہے۔

علامہ اقبال کے وہ اشعار بھی جو سنگین فکری حقائق کے عکاس ہیں فنی حسن سے بیگانہ دکھائی نہیں دیتے مثلاً :

من آن علم و فراست باپر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

(ص ۴۹٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں اس علم و فراست کو ہیچ گردانتا ہوں جو مردِ غازی کو تیغ و تلوار سے بیگانہ کردے۔

چون بکمال می رسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را درتہ بوریا طلب

(ص ۵۰۷ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی جب فقر یا درویشی اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو یہی بادشاہت کی دلیل ہے لہذا تو اگر بادشاہت کا جویا ہے تو اسے درویشانہ زندگی میں تلاش کر :

فروغ آدم خاکی زتازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

(ص ۵۱۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی انسانیت کا فروغ چاند اور ستاروں کی طرح گذشتہ افعال کی تکرار کے ساتھ انجام دہی میں نہیں بلکہ نت نئے کارنامے سرانجام دینے میں ہے۔

ان اشعار کی روشنی میں پروفیسر حمید احمد خان کے بقول یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ :

> "اقبال نے........... غزل کی ہیئت ایک ایسے مضمون سے ترکیب دی جسے غزل نے اس سے پہلے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ شروع میں غزل کا سرمایہ عشق و عاشقی کے موضوعات تھے پھر سنائی و عطار نے اسے متصوفانہ مضامین کے لطف سے آشنا کر کے ایک عظیم الشان قدم آگے بڑھایا۔ اقبال نے اس نوعیت کا ایک اور انقلاب برپا کیا یعنی عاشقی اور تصوف سے قطع نظر کر کے غزل کو بین الاقوامی معاملات و سیاسیات سے دوچار کیا۔ غزل کے لئے مضمون کی قید ہمیشہ بڑی اہم رہی ہے۔ اب فارسی اور اردو غزل صدھا سال پرانے مضامین کی قید سے آزاد ہوئی اور اقبال نے یہ

کارنامہ اس صفائی سے انجام دیا کہ کہ جھٹکے کا احساس نہ ہوا یہ ادبی معجزہ اس لئے ممکن ہو
سکا کہ اوّل اقبال نے غزل کی قدیم روایات کا احترام ملحوظ رکھا اور دوّم اپنے نئے افکار کو
بے انتہا شدت سے محسوس کیا۔ ان کا کمالِ فن یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو مروڑ دیئے
بغیر ایک نئے راستے پر ڈال دیا۔"(۳۹)

۲۔ علامہ اقبال کی غزلوں میں نظموں کی سی فکری وحدت پائی جاتی ہے بلکہ اکثر غزلوں میں تخلص کی غیر موجودگی انھیں نظموں کی طرح موضوعاتی بنادیتی ہے۔ حالانکہ تغزل کی پوری لطافت وایمائیت ان میں موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل غزل کا کلیدی سُر عشق کی بے باکی اور پر شوری ہے جبکہ زمین کی رواں دواں نوعیت اور الفاظ کا دروبست بھی احساسِ وحدت کو ابھارنے میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔

صورت نپرستم من بتخانہ شکستم من
آن سیل سبک سیرم ہر بند گسستم من
در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویدا شُد این نکتہ کہ ہستم من
در دیر نیازِ من در کعبہ نمازِ من
زنّار بدوشم من تسبیح بدستم من
سرمایۂ دردِ تو غارت نتواں کردن
اشکے کہ زدل خیزد دردیدہ شکستم من
فرزانہ بگفتارم دیوانہ بکردارم
از بادۂ شوق تو ہشیارم و مستم من

(ص ۳۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں نے صورت پرستی نہیں کی اور ظاہری اور باطنی ہر بُت کو پاش پاش کر دیا۔ میری حیثیت اس سیل بے پناہ کی ہے جو اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتا چلا جاتا ہے عقل اگر ایک طرف میری ہستی کا اثبات کرتی رہی تو دوسری طرف میرے وجود میں شبہات بھی وارد کرتی رہی لیکن عشق سے مجھے اپنے ہونے کا یقین ہوا۔

دیر ہو یا کعبہ مجھے دونوں جگہ خدا کے جلوے دکھائی دیتے ہیں اسی لئے میں دونوں جگہ نیاز اور نماز میں مصروف رہتا ہوں اور زنّار کندھے پر لٹکائے اور تسبیح ہاتھ میں لئے رہتا ہوں۔

اے محبوب جو اشک تیری محبت میں میری آنکھوں سے نکلتے ہیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں اور چونکہ درد کے اس سرمائے کو تباہ نہیں کیا جا سکتا لہذا میں ان کو زمین پر گرنے نہیں دیتا بلکہ جب وہ میری آنکھوں میں آجاتے ہیں تو انھیں پی جاتا ہوں۔

تیری محبت کے نتیجے میں میں کوئی بات خلافِ عقل نہیں کہتا لیکن سر بکف ہو کر سامنے آتا ہوں یعنی دیوانگی کا مظاہرہ کرتا ہوں پس میں تیری محبت کی شراب پی کر ہشیار بھی ہوں اور مست بھی۔

ایک اور غزل میں ذات باری کے سلسلے میں اٹھنے والے سوالات اور عبد و معبود کے بارے میں رونما ہونے والے معاملات ادا کئے گئے ہیں جو حیرت خانہ امروز و فردا میں طرح نو افگن کے تقاضے پر منتج ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ لفظ "ساختی" سے ہر شعر میں مخاطب کی طرف روئے سخن لازم آتا ہے جو تسلسل کا موجب ہے۔

آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
در بیابان جنوں بُردی و رسوا ساختی
جرم ما از دانۂ تقصیر او از سجدۂ
نے بآن بیچارہ می سازی نہ باما ساختی
صد جہان می روید از کشت خیال ما چو گل
یک جہان و آن ہم از خون تمنا ساختی
پر تو حسن تو می افتد بروں مانند رنگ
صورت مے پردہ از دیوار مینا ساختی
طرحِ نو افگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم
این چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی
(ص ۳۲۴، ۳۲۵ کلیات اقبال فارسی)

یعنی تو نے ہمیں دیوانہ بنا کے رسوا کیا اور ہر شخص کو ہماری داستان عشق سے آگاہ کر دیا۔ تو نے آدم کو اس بنا پر جنت سے نکال دیا کہ اس نے گندم کا دانہ کھا لیا تھا اور ابلیس کو اس لئے راندۂ درگاہ کر دیا کہ اس نے تجھے سجدہ نہیں کیا۔ کیسی حیرت انگیز بات ہے کہ تو نے نہ اس سے موافقت کی نہ ہم سے۔

اے خدا تو نے صرف ایک ہی دنیا بنائی اور اسمیں بھی ہر لمحہ لاکھوں عاشقوں کی تمناؤں کا خون ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ہم تیرے عاجز بندے ہر روز ایک نئی دنیا پیدا کرتے رہتے ہیں جو ہمارے تصور کی کشت سے پھول کی طرح اُگتی رہتی ہے۔

اے خدا اگرچہ تو نے اپنے آپکو مخلوقات کے پردے میں پوشیدہ کر لیا ہے اس کے باوجود تیرا حسن ان پردوں سے اس طرح چھن چھن کر باہر نکل رہا ہے جس طرح شراب کا رنگ بوتل کی دیوار سے نمایاں ہو جاتا ہے۔

ہم چونکہ جدت پسند ہیں اس لئے تجھ سے التماس ہے کہ کوئی نئی دنیا پیدا کر کیونکہ تیری بنائی ہوئی دنیا کے آج اور کل میں کوئی فرق نہیں اور اس یکسانیت سے ہم پر حیرت کا عالم طاری ہے۔

ایک اور غزل میں خدا سے ہٹ کر اپنے ہم جنسوں سے خطاب ہے اور ہر شعر کی تان "آموز" پر آن کر ٹوٹتی ہے جس

سے وحدت کی اساس پہلے ہی قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یکے بعد دیگرے تین اشعار میں اگر اور اس کا جواب ہے جبکہ ابتدائی اور آخری اشعار بنیادی تلقین کا آغاز بھی ہیں اور انجام بھی۔ اس طرح اجزاء آپس میں پیوست ہو کر متحد قالب کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

دانۂ سبحہ بہ زنار کشیدن آموز
گر نگاہ تو دو بین است ندیدن آموز
پاز خلوت کدۂ غنچہ برون زن چو شمیم
بانسیم سحر آمیز و وزیدن آموز
آفریدند اگر شبنم بے مایہ ترا
خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند
پاس ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغبان گر زخیابانِ تو برکند ترا
صفتِ سبزہ دگر بارہ دمیدن آموز
تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیرون
عزلتِ خم کدۂ گیرو رسیدن آموز
تاکجا درتہ بالِ دگراں می باشی
در ہوائے چمن آزاد پریدن آموز
درِ بتخانہ زدم مغبچگانم گفتند
آتشے در حرم افروز و تپیدن آموز

(ص ۳۲۷، ۳۲۸ کلیات اقبال فارسی)

اگر تو عاشق صادق ہے تو تسبیح کے دانوں کو زنّار میں پرولے لیکن اگر تو دیر و حرم میں امتیاز کرتا ہے تو تو عاشق صادق نہیں لہذا کوشش کر کہ دیر و حرم تجھے دو نظر نہ آئیں۔

غنچے کے خلوت کدے سے خوشبو کی طرح باہر نکل اور نسیم سحر سے پیوستہ ہو کر دنیا کو معطر کر دے۔

اگر تجھے بے مایہ شبنم بنایا گیا ہے تو اٹھ اور لالہ کے داغِ دل پر ٹپکنا سیکھ۔

اگر تجھے تازہ کھلے ہوئے پھول کا کانٹا بنایا گیا ہے تو باغ کی عزت کا پاس کرتے ہوئے چبھنا سیکھ لے۔

اگر تجھے باغبان کیاری سے اکھاڑ کر باہر پھینک دے تو تو سبزے کی طرح دوبارہ زمین سے اُگ۔

شراب وہی قیمتی ہوتی ہے جو مدتوں مٹکے میں پڑی پختہ ہوتی رہے اسی طرح اے انسان تو بھی کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنے اندر پختگی پیدا کر تاکہ تو دنیا میں قدر و منزلت حاصل کر سکے۔

اے انسان تو کب تک دوسروں کی غلامی کرتا رہے گا۔ چمن کی فضا میں آزادی سے اڑنا سیکھ۔

جب میں نے بتخانے کے دروازے پر دستک دی تو مغبچگان نے کہا کہ پہلے اپنی ذات کے حرم میں عشق کی آگ روشن کر اور اس میں تڑپنا سیکھ۔

رفیق خاور اقبال کی غزلیات میں وحدت کو ابھارنے کا ایک بڑا سبب یعنی فکری ارتکاز کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"ان کا اندیشہ ہر سو خرام نہیں اور وہی مسائل ملحوظ رکھتا ہے جو حیات و کائنات کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دائرے کے اندر جو بھی قطر یا نصف قطر ہوں گے یا اس کے حلقے میں محصور ہوں گے وہ انہی کا ادراک کرے گا اور انہی کو ضبط تحریر میں لائے گا۔ لہذا ان کی غزل کی یک رنگی بڑی حد تک پہلے ہی سے طے ہوتی ہے اسی سے ان کا متقدمین سے فرق نمایاں ہوتا ہے خصوصاً غالب سے جس نے اپنی غزل کی بنیاد تنوع پر رکھی۔(۳۵)

یونس جاوید لکھتے ہیں :

"علامہ اقبال کو روایتی فارسی غزل کے مضامین کی باہم نامربوط گوناگونی پر اعتراض تھا چنانچہ وہ فارسی شعراء کے تخیل کو تتلی سے تشبیہ دیتے ہیں جو پھول پر بیٹھتی ہے اور نیم سیراب اڑ جاتی ہے پھر کسی دوسرے پھول کو تاکتی ہے اور وہاں سے بھی نیم تشنہ پرواز کر جاتی ہے اور عیاں ہے کہ تتلی پورے گلستان کا جائزہ لے ہی نہیں سکتی۔ یہی باعث ہے کہ ایرانی شعراء اپنے عمیق احساسات و جذبات کو غیر مربوط شعروں (غزل) کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ اور غزل ہی وہ صورت شعری ہے جو اس فنکارانہ روح کی نزاکتوں کو ظہور میں لاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں علامہ اقبال کی غزلیں اس لئے نظمیت کی دارا ہیں کہ علامہ اقبال محض شاعر نہ تھے لہذا وہ ہر وادیٔ خیال میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار سکتے تھے۔ وہ ایک فلسفے کے مالک تھے وہ ایک نظریۂ حیات رکھتے تھے۔ چنانچہ کائنات کی گوناگونی کے عطا کردہ بے شمار موضوعات کو جزوِ غزل بنانے کے باوصف وہ اس ایک خاص اثر اور تاثر سے دامن کش نہ ہوتے تھے جو ان کے فلسفہ خودی کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور زیبائش بھی۔ جو مست نہیں کرتا مستانہ ضرور بنا دیتا ہے۔ جس میں حسن ہے مگر جان بخش اور روح پرور حسن۔ اس حسن میں ساحری ہے جو بے

نیازی کی دولت عطا کرتی ہے۔ مگر وہ بے نیازی غرور نہیں۔ وہ غیرت ہے۔ وہ خود اعتمادی ہے اور اگر کوئی شعر خالص مصورانہ فنکاری یا عاشقانہ جذبات کی تشریح ہے تو وہ بھی مرکزی مضامین کی گراں باری کو گوارا بنانے کی خاطر ہے گویا مرکزی مضامین کو تصاویر کی حیثیت حاصل ہے اور مشتاقانہ حسن بیان کو دلاویز چھوکھٹوں کی۔"(۳۶)

ڈاکٹرا ین میری شمل لکھتی ہیں :

"ان کی غزل کے شعر فرداً فرداً بھی ایک اکائی کے طور پر لئے جاسکتے ہیں اور اس سے ان کی جاذبیت میں کوئی فرق رونما نہیں ہوتا تاہم ان کا فلسفہ خودی غزل کو بھی ایک طرح کی وحدت بنادیتا ہے اور اسے تلقینی قوت عطا کرتا ہے۔"(۳۷)

۴۔ معروف فارسی شعری اسالیب کے پیروکار شعراء کا کلام اپنی تمام تر رعنائی اور لطافت کے باوجود زبان میں علیت کی طرف مائل تھا۔ ان کی شاعری کلاسیکی شاعری تھی جس میں ہر طرح کا عنصر شامل تھا۔ اسی لئے ان کے اشعار کی بندش صاف او رروان ہوتے ہوئے بھی کلام اقبال کی بندش سے محروم ہے جس کی موجودگی میں علامہ کا ہر مصرع اول سے آخر تک بے ساختہ پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ شاید یہ بھی ہے کہ انہوں نے چھوٹی اور زیادہ طویل بحریں بہت کم برتی ہیں چھوٹی بحریں ویسے ہی اظہار میں بندش پیدا کرتی ہیں اور طویل ادق اور پیچیدہ بحریں بیان کو نامانوس بنادیتی ہیں اسی لئے علامہ عام طور پر مروجہ مقبول بحروں میں لکھتے ہیں۔ جن سے صوتی اثر دوبالا کردینے والی کھنک اور بلند آہنگ پیدا ہوتا ہے اور غزلیات کی نوعیت غنائیہ ہوجاتی ہے مثلاً

۱۔ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ر فعلان

درون لالہ گزر چون صبا توانی کرد

۲۔ فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ر فعلان

خواجۂ نیست کہ چون بندہ پرستارش نیست

۳۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن ر فاعلان

یاد ایامے کہ خوردم بادہ ھا با چنگ ونے

۴۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب

۵۔ مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

بانشۂ درویشی در سازو دمادم زن

۶۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن / فاعلان

صور تگرے کہ پیکر روز و شب آفرید

۷۔ مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن / فاعلان

فصلِ بہار این چنین بانگ ہزار این چنین

۸۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

نہ یابی در جہان یاری کہ داند دلنوازی را



لالۂ طور کے عنوان سے پیام مشرق کا ایک حصہ اور ارمغان حجاز حصہ فارسی علامہ اقبال کی دوبیتوں پر مبنی ہے جنہیں علامہ اقبال نے رباعیات لکھا ہے لیکن ان کا وزن لاحول ولا قوۃ الا باللہ نہیں ہے جس کے ۲۴ زحافات رباعی کے لئے مخصوص رہے ہیں۔ بلکہ ان کا وزن پانچویں صدی ہجری کے شاعر بابا طاہر عریاں کی معروف دوبیتوں کا وزن ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال نے رباعی کے خاص وزن کی طرف توجہ نہ دینے کے باوجود اپنے زورِ بیان سے دوبیتی کو رباعی بنا دیا۔ انہوں نے دوبیتی کی صنف میں چند درج ذیل جدتیں پیدا کیں۔

ا۔ رباعی یا دوبیتی میں عموماً پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع مردف جبکہ تیسرا مصرع آزاد نظر آتا ہے یا بعض جگہ مقفی اور مردف۔ لیکن اقبال نے متعدد دوبیتیوں میں پہلا اور تیسرا مصرع بے ردیف و قافیہ رکھا اور اس طرح اپنی آزادہ روی اور جدت پسندی کا ثبوت دیا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

سحر می گفت بلبل باغبان را
درین گل جز نہال غم نگیرد

بہ پیری می رسد خارِ بیاباں
ولے گل چون جوان گرد د بمیر د
(ص ۱۹۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت
فروغِ زندگی تابِ شرر بود
و لیکن گر نرنجی با تو گویم
صنم از آدمی پاینده تر بود
(ص ۲۰۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

مسلمانان مرا حرفے است در دل
کہ روشن تر زجان جبرئیل است
نہانش دارم از آزر نہاداں
کہ این سرے ز اسرارِ خلیلؑ است
(ص ۲۰۲ کلیات اقبال فارسی)

مریدے فاقہ مستے گفت با شیخ
کہ یزداں را ز حال ما خبر نیست
بہ ما نزدیک ترا از شہ رگ ماست
و لیکن از شکم نزدیک تر نیست
(ص ۸۹۹ کلیات اقبال فارسی)

شبے پیش خدا بگریستم زار
مسلمانان چرا زارند و خوراند
ندا آمد نمی دانی کہ این قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

(ص ۹۲۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

ہر آن قومے کہ می ریزد بہارش
نسازد جز بہ بوھائے رمیدہ
زخاکش لالہ می روید و لیکن
قبا ے دا ر از رنگ پریدہ
(ص ۹۵۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

زمن بر صوفی و ملاّ سلامے
کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را
(ص ۹۵٦ کلیاتِ اقبال فارسی)

۲۔ علامہ اقبال کی دوبیتوں کی ایک اور انفرادیت افکار کا تنوع اور ایجاز وبلاغت ہے۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن علامہ کی دوبیتوں کو رباعیات کا نام دیتے ہوئے اس موضوع پر یوں رقمطراز ہوتے ہیں کہ :

"انھوں نے اپنے گہرے افکار کو بلیغ انداز میں پیش کرنے کے لئے رباعی کو وسیلہ بنایا اور اپنی غیر معمولی شاعرانہ استعداد سے رباعی میں فکر و فن کا نہایت دلآویز نمونہ پیش کیا۔ ان کی رباعی میں ان کے بنیادی فلسفۂ زندگی کے علاوہ مختلف ملی، اجتماعی، سیاسی اور تعلیمی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور شاعر نے ہر جگہ اپنے نقطۂ نظر کو نہایت مؤجز اور بلیغ طریقے سے پیش کیا ہے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ فارسی رباعی کی پوری تاریخ میں کسی شاعر نے اس صنفِ سخن میں موضوع کا وہ تنوع پیش نہیں کیا جو ہمیں علامہ کے ہاں نظر آتا ہے اگر پیام مشرق کی رباعیات میں عشق و خودی، زندگی کی حقیقت اور کائنات میں انسان کا مقام ایسے موضوع ملتے ہیں تو ارمغانِ حجاز میں حجاز کے تخیلی سفر اور جذبات محبت و عقیدت کے علاوہ مختلف مسائل پر شاعر کے آخری عمر کے پختہ افکار کی عکاسی ہوتی ہے۔" (۳۸)

علامہ کی دوبیتوں میں افکار کے تنوع اور ایجاز وبلاغت کے حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

(وحدت الوجود)

نفس آشفتہ موجِ ازیمِ اوست
نئے ما نغمۂ ما ازدمِ اوست
لبِ جوئے ابد چون سبزہ رستیم
رگِ ما ریشۂ ما ازنمِ اوست

(ص ۲۲۱ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ہماری روح انائے مطلق کے سمندر کی ایک بے قرار موج ہے اور ہماری ہستی (یعنی نے) اور ہمارا عمل (یعنی نغمہ) اسی کے دم سے ہے ہماری حیثیت اس سبزے کی سی ہے جو دریائے ابد کے کنارے اُگا ہوا ہے اور جس کا رگ وریشہ اسی کی نمی کا مرہونِ احسان ہے۔

(مساوات انسانی)

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

(ص ۲۲۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی ہم مسلمان نہ افغانی ہیں نہ ترکی ہیں اور نہ تاتاری ہیں بلکہ ہم سب ایک ہی چمن کی پیداوار ہیں اور ایک ہی شاخسار سے ہیں۔ ہم پر رنگ وبو کی تمیز حرام ہے کیونکہ ہم ایک ہی نو بہار کے پروردہ ہیں (اور وہ چمن، شاخسار اور نو بہار دین اسلام ہے۔)

(جدوجہد)

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت
شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی
بمیر اندر نبردو زندہ تر شو

(ص ۲۰۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی سکندر نے خضر سے کیا خوبصورت بات کہی کہ تو سوزوساز بحر وبر کا شریک ہو جا۔ تو اس جنگ کو محض کنارے سے نہ دیکھ بلکہ اس میں حصہ لے اور اگر اس جدوجہد میں تجھ پر موت وارد ہو جائے تو بلا شبہ تجھے حیات ابدی حاصل ہو جائے گی۔

(عظمت انسانی)

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور
کہ جانِ تو زخود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاش آدمے ہست

(ص ۲۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اے انسان تو خدا کی تلاش میں طور پر پہنچ گیا کیونکہ تو اپنی خودی سے ناواقف ہے۔ اپنے آپ کو تلاش کر کیونکہ خدا خود انسان کی تلاش میں ہے۔

(خدا سے شوخی)

بہ یزداں روز محشر برہمن گفت
فروغ زندگی تاب شرر بود
و لیکن گر نرنجی با تو گویم
صنم از آدمی پائندہ تر بود

(ص ۲۰۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی قیامت کے دن برہمن نے خدا سے کہا کہ انسان کی زندگی چنگاری کی طرح مختصر تھی لیکن اگر تو ناراض نہ ہو تو میں یہ عرض کروں کہ میرا تخلیق کردہ بُت تیرے انسان سے زیادہ پائیدار تھا۔

(صوفی وملاّ)

گرفتم حضرت ملاّ ترش روست
نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با این مسلمانی کہ دارم
مر از کعبہ می راند حقِ اوست

(ص ۹۵۴ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں نے مانا کہ ملاّ تند خو اور ظاہر بین ہے لیکن میں اسلام سے اس قدر دور ہو چکا ہوں کہ اگر وہ مجھے دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے تو حق بجانب ہے۔

(خلافت وملوکیت)

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است
غلام فقرِ آن گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است
(ص ۹۷۲ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی انسان ابھی تک اس دنیا میں انسان کا غلام ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا نظامِ زندگی نقائص کا شکار ہے اور اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہیں۔ جبکہ میں اس ذات پاک کا غلام ہوں جس کے دین میں ملوکیت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

(تعلیم)

زعلم چارہ سازے بے گدازے
بسے خوشتر نگاہ پاکبازے
نکوتر از نگاہ پاک بازے
دلے از ہر دوعالم بے نیازے
(ص ۹۸۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی اس علم سے جو چارہ ساز تو ہو لیکن دل میں سوز و گداز پیدا نہ کر سکے پاکیزہ نگاہ بدرجہا بہتر ہے لیکن اس پاکیزہ نگاہ سے بھی بہتر وہ دل ہے جو دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو۔

(خودی)

خودی را از وجود حق وجودے
خودی را از نمود حق نمودے
نمی دانم کہ این تابندہ گوہر
کجا بودے اگر دریا نبودے
(ص ۱۰۰۳ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی خودی کو وجودِ حق سے وجود حاصل ہوا اور اس کی نمود سے نمود حاصل ہوئی میں نہیں جانتا کہ اگر دریا کا وجود نہ ہوتا تو یہ گوہر تابندہ کہاں ہوتا۔

(موت)

شنیدم مرگ با یزداں چنین گفت
چہ بے نم چشم آن کز گل بزاید

چو جان او بگیرم شرمسارم

ولے اورا ز مُردن عار ناید

(ص ۱۰۰۵کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں نے سنا کہ موت نے خدا سے کہا کہ جو شخص مادیات میں گرفتار ہے وہ کس قدر بے غیرت ہے۔ مجھے تو اس کی روح قبض کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے لیکن وہ موت آنے پر بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔

۳۔ علامہ کی دوبیتیوں کا ایک اور وصف تسلسل بیان ہے جو ارمغان حجاز میں تو واضح طور پر حضور حق، حضور رسالتؐ، حضور ملت، حضور عالم انسانی، اور بہ یاران طریق کے مجموعی عنوانات اور ان کے مزید قائم کردہ ذیلی عنوانات کے تحت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن پیام مشرق میں بظاہر متفرق موضوعات کے باوجود علامہ اقبال کی رباعیات کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے کیونکہ ان کا تعلق بہر حال علامہ اقبال کے بنیادی افکار سے ہی ہے۔

رفیق خاور لکھتے ہیں :

"ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ فرد فرد ہونے کے باوجود مجتمع ہیں اور مسلسل نہ ہونے کے باوجود مسلسل لگتے ہیں کیونکہ ان میں احساس و تصور کا اشتراک ہے۔"(۳۹)



قطعہ نگاری میں علامہ اقبال کی انفرادیت یہ رہی کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر کم سے کم اشعار میں اپنے افکار کا اظہار کر کے ایجاز و بلاغت کے شاہکار تخلیق کئے مثلاً حکمت و شعر تین اشعار پر مبنی ایک تمثیلی قطعہ ہے جس میں علامہ نے عشق اور خرد کے فرق کو واضح کیا ہے اور انتہائی بلیغ اور اثر آفرین انداز میں فلسفہ کی بے حاصلی اور عشق کی کامرانی کا نقش دل پر بٹھایا ہے فرماتے ہیں :

بو علی اندر غبار ناقہ گم

دست رومی پردۂ محمل گرفت

این فروتر رفت و تا گوہر رسید

آن بگر دا بے چوخس منزل گرفت

حق اگر سوزے ندارد حکمت است

شعر می گردد چوسوز از دل گرفت

(ص ۲۷۶کلیاتِ اقبال فارسی)

فلسفی (بو علی) عقلی شکوک (ناقہ) کے غبار میں صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا لیکن عاشق (رومی) نے عشق کو راہنما

بنا کر محمل کا پردہ اٹھالیا یعنی منزلِ مقصود کو پالیا۔

عاشق بحرِ حقیقت کی تہ میں پہنچ کر موتی نکال لایا جبکہ فلسفی شکوک کے بھنور میں پھنس کر سطح پر ہی رہ گیا۔

حق میں اگر سوز و گداز کا رنگ نہ ہو تو وہ فلسفہ کہلاتا ہے لیکن اس رنگ کی موجودگی میں اسے شعر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"زندگی" کے عنوان سے تین اشعار کا ایک اور قطعہ ہے جس میں زندگی اور اس کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر دلکش اشاریت کے ذریعے تبصرہ کیا گیا ہے فرماتے ہیں :

شبے زار نالید ابرِ بہار
کہ این زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقے سبک سیر و گفت
خطا کردۂ خندہ یک دم است
ندانم بہ گلشن کہ برد این خبر
سخنہا میان گل و شبنم است

(ص ۲۶۶ کلیاتِ اقبال فارسی)

ایک رات ابر بہار نے رو رو کر یہ بات کہی کہ زندگی گریۂ پیہم کا نام ہے یہ سن کر تیز رفتار بجلی چمکی اور بولی غلط زندگی ایک لمحے کی مسکراہٹ کا نام ہے خدا جانے اس مکالمے کی اطلاع گلشن میں کس طرح پہنچ گئی کہ گل اور شبنم میں بھی اسی مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے۔

"زندگی و عمل" ایک اور تمثیلی قطعہ ہے جس میں ساحل کو جمود اور بے عملی کی علامت قرار دیا گیا ہے اور موج کو حرکت اور زندگی کا آئینہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور دو اشعار کے اس قطعے کو مکالماتی شکل دے کر مزید مؤثر بنا دیا گیا ہے، فرماتے ہیں :

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجے زخود رفتۂ تیز خرامید وگفت
ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

(ص ۲۹۸ کلیاتِ اقبال فارسی)

ساحلِ بحر نے جو روزِ آفرینش سے سکون کی حالت میں ہے یہ کہا کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ میں کیا ہوں جذبۂ عمل سے سرشار ایک موج نے یہ بات سنی تو تیزی سے اُٹھی اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ میری زندگی حرکت و عمل پر منحصر ہے اگر میں ساکن ہو جاؤں تو فنا ہو جاؤں گی۔

"الملک للہ" کے عنوان سے تین اشعار پر مبنی ایک قطعے میں بھی اسلامی تاریخ کے ایک مشہور تاریخی واقعے کو تحریر کر

کے اسے بلاغت کا شاہکار بنایا گیا ہے فرماتے ہیں :

طارق جو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چون رسیم
ترکِ سبب زروے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر بردوگفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست
(ص ۲۹۹ کلیاتِ اقبال فارسی)

جب طارق بن زیاد نے اندلس کے ساحل پر اتر کر اپنی کشتیاں جلاڈالیں تو اس کے بعض ساتھیوں نے کہا کہ تیرا یہ فعل اقتضائے عقل کے خلاف ہے۔ ہم اپنے وطن سے دور ہیں۔ اگر ہمیں کسی وجہ سے واپس جانا پڑا تو اس کی کیا صورت ہو گی اور پھر شریعت کی رو سے ترک اسباب بھی کہاں جائز ہے۔ طارق ہنسا اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔

اور عشق کے عنوان سے دو اشعار کے ایک قطعے میں عشق کی آفاقی حقیقت کی تعبیر گل و شبنم اور بلبل و صبا کی لطیف زبان سے یوں ہوئی ہے :

آن حرف دلفروز کہ راز است و راز نیست
من فاش گویمت کہ شنید از کجا شنید
دزدید ز آسمان و بہ گل گفت شبنمش
بلبل ز گل شنید و ز بلبل صبا شنید
(ص ۳۱۰ کلیاتِ اقبال فارسی)

یعنی میں کھل کر بتاتا ہوں کہ عشق جیسا دل افروز لفظ جو راز ہے بھی اور نہیں بھی سب سے پہلے کس نے سنا اور کس سے سنا۔ شبنم نے اسے آسمان سے چرا کر پھول سے کہا پھول نے بلبل سے کہا اور بلبل نے صبا کو اس راز سے مطلع کیا۔

المختصر شعر کی بعض اقسام اور فنون میں مذکورہ بالا تمام جدتوں کے پیش نظر (خواہ وہ ماہرین فن کے لئے قابل قبول ہوں یا نہیں) علامہ اقبال کو ایک نئے سبک شعر کا موجد ٹھہرانا غلط نہیں خصوصاً جبکہ زندگی کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ :

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کار نادر آید

گناہے ہم اگر باشد ثواب است



حوالہ جات

۱۔اقبال ایرانیوں کی نظر میں'خواجہ عبدالحمید عرفانی'کراچی'۱۹۵۷ء ص ۱۳۲۴

۲۔ایضا، ص ۱۴۰

۳۔اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ 'رفیق خاور'بزم اقبال لاہور'۱۹۸۸ء'ص ۱۱

۴۔ نگاہی بہ اقبال'ڈاکٹر شھین دخت مقدم صفیاری'اقبال اکادمی پاکستان لاہور'۱۹۸۹ء'ص ۲۰۰

۵۔مقامات اقبال'ڈاکٹر سیّد عبداللہ'ص ۹۲

۶۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'ڈاکٹر رفیع الدین ھاشمی'اقبال اکادمی لاہور'
۱۹۸۲ء'ص ۵۷

۷۔اقبال ایرانیوں کی نظر میں'خواجہ عبدالحمید عرفانی'ص ۴۱، ۴۲

۸۔اقبال نامہ'ج ا'ص ۵۶

۹۔ میزان اقبال'محمد منور مرزا'مکتبۂ کارواں لاہور'۱۹۷۵ء'ص ۶۶

۱۰۔اقبال کے کلاسیکی نقوش'انور سدید'اقبال اکادمی پاکستان لاہور'۱۹۸۸'ص ۱۴۸

۱۱۔اقبال کا فلسفۂ خودی'محمد عثمان'مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۷۱'ص ۱۱۳'۱۱۴

۱۲۔مقامات اقبال'ڈاکٹر سیّد عبداللہ'ص ۹۵

۱۳۔اقبال ۸۶ء'مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت'ص ۲۳۹

۱۴۔اقبال نئی تشکیل'عزیز احمد'اُردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور ۱۹۶۸ء'ص ۲۶۰

۱۵۔اقبال نامہ، حصہ اول، ص ۲۰۴، ۲۰۵

۱۶۔مسائل اقبال'ڈاکٹر سیّد عبداللہ'ص ۳۱۵

۱۷۔ایضاً،ص ۳۱۲
۱۸۔اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،ڈاکٹر عبدالشکور احسن،ص ہ
۱۹۔اقبال کی شخصیت اور شاعری،پروفیسر حمید احمد خان،ص ۱۳۹
۲۰۔مقاماتِ اقبال،ڈاکٹر سیّد عبداللہ،ص ۹۵،۹۶
۲۱۔اقبال فکر و فن،ترتیب وانتخاب،رشید امجد،فاروق علی،ندیم پبلیکیشنز،راولپنڈی،
۱۹۸۱ء،ص ۱۶۰
۲۲۔اقبال نامہ،ج ۲،شیخ عطاء اللہ،ص ۳۶۷
۲۳۔اقبال نامہ،ج ۱،شیخ عطاء اللہ،ص ۱۰۸
۲۴۔ایضاً،ص ۲۳۵
۲۵۔ایضاً،ص ۱۹۵،۱۹۶
۲۶۔اقبال ایرانیوں کی نظر میں،ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی،ص ۱۸۰
۲۷۔اقبال کی شخصیت اور شاعری،پروفیسر حمید احمد خان،ص ۱۳۰،۱۳۱
۲۸۔اقبال کا نظام فن،ڈاکٹر عبدالمغنی،اقبال اکادمی پاکستان لاہور،۱۹۹۰،ص ۵۷،۵۸
۲۹۔مقاماتِ اقبال،ڈاکٹر سیّد عبداللہ،ص ۳۰۲
۳۰۔تنویر اقبال،ڈاکٹر عبدالمغنی،ص ۲۱۲
۳۱۔ایضاً،ص ۲۱۱،۲۱۲
۳۲۔اقبال ایرانیوں کی نظر میں،ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی،ص ۱۵۰،۱۵۱
۳۳۔اقبالیات کی مختلف جہتیں،یونس جاوید،ص ۲۴۱
۳۴۔اقبال کی شخصیت اور شاعری،پروفیسر حمید احمد خان،ص ۱۲۸
۳۵۔اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ،رفیق خاور،ص ۳۰۵

۳۶۔اقبالیات کی مختلف جہتیں، یونس جاوید، ص ۲۴۱
۳۷۔شہپر جبریل، پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل، مترجم ڈاکٹر محمد ریاض، گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۹۴
۳۸۔اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ص ۴۹۷
۳۹۔اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ، رفیق خاور، ص ۱۵۳



کتابیات

۱۔ابن یمین فریومدی، دیوان اشعار 'انتشارات کتابخانۂ سنائی' س ن
۲۔افتخار حسین شاہ، سیدّ، اقبال اور پیروی شبلی 'سنگ میل پبلیکیشنز لاہور' ۱۹۷۷ء
۳۔امیر خسرو، کلیات غزلیات 'ج ا' پیکجز لمیٹڈ' لاہور' پاکستان' ۱۹۷۲ء
۴۔امیر معزی، دیوان' انتشارات کتاب فروشی اسلامیہ' تہران ۱۳۱۸ش
۵۔انور سدید، اقبال کے کلاسیکی نقوش' اقبال اکادمی پاکستان لاہور' ۱۹۸۸
۶۔انوری ابیوردی، دیوان 'ج ۲' باھتمام محمد تقی مدرس' انتشارات بنگاہ ترجمہ ء نشر کتاب تہران'
۱۳۴۰مطابق ۱۹۶۱ء
۷۔ایرج مرزا' چاپ خانہ ء بازرگانی' اسفند ماہ ۱۳۴۲ تہران
۸۔این میری شمل، ڈاکٹر، پروفیسر، شہپر جبریل' مترجم ڈاکٹر محمد ریاض،
گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۸۵ء
۹۔بہار، محمد تقی، ملک الشعراء، سبک شناسی 'ج ا' چاپخانہ ء خودکار' تہران' س ن
۱۰۔بیدل، میرزا عبدالقادر، کلیات' ج ا' پوھنی' مطبعہ اسد ۱۳۴۱
۱۱۔جامی، مولانا عبدالرحمٰن، دیوان' چاپخانۂ پیروز تہران' ۱۳۴۱
۱۲۔حافظ شیرازی' خواجہ شمس الدین محمد، دیوان، باھتمام محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی'
کتابخانہ ء زوار' چاپ سینا تہران' س ن
۱۳۔حزین لاھیجی' دیوان، بہ تصحیح ذبیح اللہ صاحبکار' ۱۳۷۴
۱۴۔حسن اختر، پروفیسر، اطراف اقبال' مکتبہ میری لائبریری لاہور' ۱۹۷۲ء

۱۵۔ حمید احمد خان، پروفیسر، اقبال کی شخصیت اور شاعری 'بزم اقبال لاہور' ۱۹۷۴ء
۱۶۔ خاقانی' کلیات، ج ا' مطبع رفیع منشی نولکشور' س ن
۱۷۔ خان آرزو، مثمر 'مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی
۱۸۔ دولت شاہ سمرقندی، تذکرۃ الشعراء 'چاپ مطبوع علوی تہران' ایران' ۱۳۰۵ھ ق
۱۹۔ ذبیح اللہ صفا، دکتر، تاریخ ادبیات در ایران' ج ا' انتشارات فردوس' تہران'
چاپ دوازدہم' ۱۳۷۱ء
۲۰۔ رشید امجد، فاروق علی، مرتب، اقبال فکر و فن 'ندیم پبلیکیشنز' راولپنڈی' ۱۹۸۱ء
۲۱۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ 'اقبال اکادمی لاہور' ۱۹۸۲ء
۲۲۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، مرتب، خطوط اقبال' مکتبۂ خیابان ادب لاہور' ۱۹۷۷ء
۲۳۔ رفیق خاور، اقبال کا فارسی کلام ایک مطالعہ 'بزم اقبال کلب روڈ، لاہور ۱۹۸۸ء
۲۴۔ رومی، مولانا جلال الدین ، مثنوی معنوی'، موسسہء انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۱ء
۲۵۔ سام مرزا، تحفہء سامی'' الہ آباد' ہندوستان' ۱۹۳۴ء
۲۶۔ سعدی شیرازی، شیخ' کلیات، بہ اھتمام محمد علی فروغی' موسسہ انتشارات امیر کبیر
تہران' ۱۳۶۵ء
۲۷۔ سلمان ساوجی' دیوان، انتشارات بنگاہ مطبوعاتی صفیعلیشاہ' ۱۳۳۶
۲۸۔ سلیم اختر، مرتب، فکرِ اقبال کی منور گوشے 'سنگ میل پبلیکیشنز لاہور' ۱۹۷۷ء
۲۹۔ سنائی' حکیم، دیوان، بکوشش مظاہر مصفا' انتشارات امیر کبیر' تہران' س ن
۳۰۔ شبلی نعمانی، مولانا، موازنہ انیس و دبیر ،، مرتبہ سید عابد علی عابد، مجلس ترقیء ادب لاہور،

۱۹۶۴ء

۳۱۔ شبلی نعمانی، مولانا، شعر العجم' چاپ خانہء معارف' اعظم گڑھ' ہندوستان' س ن

۳۲۔ شمس تبریز خان، مولوی، نقوش اقبال' ترجمہ روائح اقبال از مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ، مجلس نشریات اسلام' کراچی' ۱۹۸۸ء

۳۳۔ شھین دخت مقدم صفیاری، ڈاکٹر، نگاہی بہ اقبال' اقبال اکادمی پاکستان لاہور' ۱۹۸۹ء

۳۴۔ صائب تبریزی' کلیات، انتشارات کتابفروشی خیام' ۱۳۳۳ شمسی

۳۵۔ طالب آملی، ملک الشعراء، کلیات اشعار' انتشارات کتابخانہ سنائی' س ن

۳۶۔ طاہر نصر آبادی، تذکرہ' چاپخانہ ارمغان' تہران' ایران' ۱۳۱۷ھ ش

۳۷۔ ظفر احمد صدیقی، پروفیسر، فلسفہ' شاعری اور اقبال' دہلی یونیورسٹی' دہلی' ۱۹۷۵ء

۳۸۔ عابد علی عابد، سید، شعر اقبال' بزم اقبال لاہور ۱۹۷۷ء

۳۹۔ عبدالباقی نہاوندی، مآثر رحیمی' کلکتہ' ہندوستان' ۱۹۳۱ء

۴۰۔ عبدالحمید عرفانی، خواجہ، ڈاکٹر، اقبال ایرانیوں کی نظر میں' اقبال اکادمی کراچی' ۱۹۵۷ء

۴۱۔ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال' بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء

۴۲۔ عبدالسلام ندوی، مولانا، اقبال کامل' مطبع معارف' اعظم گڑھ' ۱۹۴۸ء

۴۳۔ عبداللہ سیّد، ڈاکٹر، مقامات اقبال' لاہور اکیڈمی لاہور' ۱۹۶۴ء

۴۴۔ عبداللہ سیّد، ڈاکٹر، مسائل اقبال' اُردو اکیڈمی لاہور' ۱۹۸۷ء

۴۵۔ عبدالمغنی' ڈاکٹر، اقبال کا نظام فن' اقبال اکادمی پاکستان لاہور' ۱۹۹۰ء

۴۶۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، تنویر اقبال' مکتبہء تعمیر انسانیت' لاہور' ۱۹۹۰ء

۴۷۔ عبدالواسع جبلی 'دیوان، ج ا' باھتمام و تصحیح و تعلیق 'ذبیح اللہ صفا' چاپ خانہء دانش تہران ۱۳۳۹'

۴۸۔ عراقی 'فخر الدین، دیوان، موسسہ انتشارات نگاہ' تہران '۱۳۷۴

۴۹۔ عرفی شیرازی 'کلیات، بکوشش غلام حسین 'کتاب فروشی وچاپ خانہء محمد علی علمی 'س ن

۵۰۔ عزیز احمد، اقبال نئی تشکیل ' اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور ۱۹۶۸ء

۵۱۔ عطااللہ شیخ، اقبال نامہ 'ج ا، لاہور '۱۹۴۵ء

۵۲۔ عطااللہ شیخ، اقبال نامہ 'ج ۲ 'لاہور '۱۹۵۱ء

۵۳۔ عطار نیشاپوری، فرید الدین، دیوان 'با تصحیح 'ومقابلہ ومقدمہ سعید نفیسی، انتشارات کتاب خانہ سنائی ۱۳۳۹ء

۵۴۔ علامہ اقبال، بانگِ درا 'شیخ غلام علی اینڈ سنز 'لاہور '۱۹۹۶ء

۵۵۔ علامہ اقبال، کلیات اُردو 'اقبال اکادمی پاکستان' لاہور '۱۹۹۰ء

۵۶۔ عنصری 'دیوان، مطبع منشی نولکشور '۱۹۲۲ء

۵۷۔ غالب دہلوی، مرزا، دیوان اُردو 'دار الشعور 'لاہور '۱۹۹۰ء

۵۸۔ غالب دہلوی، مرزا، کلیات فارسی 'ج ۳ 'مجلس ترقئ ادب لاہور ' ۱۹۶۷ء

۵۹۔ غالب دہلوی، مرزا، عود ہندی 'طبع ترقئ ادب لاہور 'پاکستان 'س ن'

۶۰۔ فرخی سیستانی 'حکیم، دیوان، انتشارات زوار 'تہران 'شاہ آباد '۱۳۴۹ء

۶۱۔ فردوسی طوسی، ابوالقاسم، شاہنامہء فردوسی 'ج ا' بکوشش دکتر محمد دبیر سیاقی 'انتشارات انجمن آثار ملی '۱۳۴۸ء

۶۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اقبال سب کے لیے ٗ اُردو اکیڈمی سندھ ٗ کراچی ٗ ۱۹۷۸ء

۶۳۔ فغانی ٗ دیوان، شیخ مبارک علی تاجر کتب ٗ اندرون دروازہ لوھاری ٗ س ن

۶۴۔ فیضی ٗ کلیات، ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور ٗ ۱۹۶۷ء

۶۵۔ قطران تبریزی ٗ حکیم، دیوان، بسعی واہتمام محمد نخجوانی ٗ چاپخانہء شفق تبریز ٗ ۱۳۳۳ھ ش

۶۶۔ گوھر نوشاہی، مرتب، مطالعۂ اقبال ٗ بزم اقبالؒ لاہور ٗ ۱۹۷۱ء

۶۷۔ محمد ریاض، دکتر، اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی گوئی ٗ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ٗ اسلام آباد ٗ پاکستان ٗ ۱۹۸۶ء

۶۸۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، اقبال اور صوفی شعراء ٗ اقبال اکادمی پاکستان لاہور ٗ ۱۹۷۷ء

۶۹۔ محمد عثمان، اقبال کا فلسفۂ خودی ٗ مکتبۂ جدید لاہور ۱۹۷۱

۷۰۔ محمد منور مرزا، میزان اقبال ٗ مکتبۂ کارواں لاہور ٗ ۱۹۷۵ء

۷۱۔ منوچہری دامغانی ٗ دیوان، بکوشش محمد دبیر سیاقی ٗ چاپخانہء پاکت چی تہران ٗ ۱۳۲۶ خورشیدی

۷۲۔ میر علی شیر نوائی، تذکرہء مجالس النفائس ٗ چاپ گلشن ٗ تہران ٗ ایران ٗ ۱۳۶۳ھ ش

۷۳۔ ناصر خسرو ٗ دیوان، موسسۂ انتشارات نگاہ ٗ تہران ۱۳۷۵ء

۷۴۔ نذیر احمد، اقبال کے صنایع بدایع ٗ آئینۂ ادب لاہور ٗ ۱۹۶۶ء

۷۵۔ نذیر نیازی، سیّد مترجم، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ٗ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۹ء

۷۶۔ نظامی عروضی سمرقندی، چہار مقالہ ٗ باھتمام دکتر محمد معین ٗ انتشارات امیر کبیر تہران ۱۳۶۶ ٗ

۷۷۔ نظامی گنجوی، دیوان، بکوشش استاد سعید نفیسی، انتشارات فروغی، ۱۳۶۲
۷۸۔ نظامی گنجوی، خسرو شیرین، چاپ علی اکبر علمی، س ن
۷۹۔ نظیری، نیشاپوری، دیوان غزلیات، مطبع نامی کریمی لاہور، ۱۹۲۸ء
۸۰۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۷۷ء
۸۱۔ وحشی بافقی، دیوان، انتشارات امیر کبیر، ۱۳۴۲
۸۲۔ وحید عشرت، ڈاکٹر، اقبال ۸۵ء، مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۹ء
۸۳۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، روح اقبال آئینہ ادب، لاہور، س ن
۸۴۔ یونس جاوید، اقبالیات کی مختلف جہتیں، بزم اقبال لاہور، ۱۹۸۸ء

